APRIL 2011

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

سالگرہ نمبر

اپریل 2011
جلد 38 شمارہ 12
قیمت 40 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
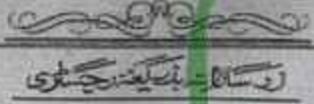
پاکستان (سالانہ)	500 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	5000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

Phone: 32721777, 32726817, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

39 واں سالگرہ نمبر۔ 39 سال۔

سوچنے بیٹھو تو ایک طویل مدت لیکن خوب سے خوب تر اور خوب تر سے خوب ترین بنانے کی کوشش و جستجو میں وقت کا یہ سفر کس آسانی سے طے ہوا۔ اس کے لیے ہم رب کریم کے حضور سربسجود ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور کرم ہے کہ آج ہم کو آپ کی محبتوں کے ساتھ ساتھ آپ کا اعتماد بھی حاصل ہے۔

ہماری اس کامیابی میں بڑا حصہ ہماری مصنفین کا ہے جنہوں نے اپنی بہترین تخلیقات خواتین ڈائجسٹ کی نذر کیں۔ ہم تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ شکریہ کا لفظ ہمارے جذبات کی ترجمانی کے لیے ناکافی ہے۔

محمود ریاض صاحب جنہوں نے خواتین ڈائجسٹ کا اجرا کیا۔ محمود بابر فیصل، محمود خاور اور ہماری بہت سی مصنفین جو آج ہمارے درمیان نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔
اور قارئین آپ کا بھی شکریہ۔ کامیابی کے اس سفر میں آپ کا ساتھ ہمیشہ ہمیں حاصل رہا۔ اور آپ کے اس ساتھ نے ہی ہمیں حوصلہ اور ہمت بخشی اور ہم خواتین ڈائجسٹ کا معیار برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ کامیابی کا یہ سفر اسی طرح جاری رہے۔ آمین۔

سالگرہ نمبر 2۔

سالگرہ نمبر کے لیے ہمیں بہت سی تحریریں موصول ہوئیں جو تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہ ہو سکیں۔ جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔
[illegible] سعدیہ [illegible] جیلانی اور [illegible] کی تحریریں ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں شامل ہوں گی۔
قارئین سے سروے کا بقیہ حصہ بھی آئندہ ماہ شامل ہوگا۔
اس طرح مئی کا شمارہ سالگرہ نمبر 2 ہوگا۔

تصویریں بناتے جائیں

ہماری قارئین کافی عرصے سے فرمائش کر رہی تھیں کہ مصنفین سے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ روایتی انٹرویو کے بجائے ہم مصنفین سے تعارف کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ اس میں مصنفین خود اپنی شخصیت، روزمرہ کے معمولات اور دلچسپیوں کے بارے میں لکھیں گی۔ اس سلسلے کا آغاز ہم [illegible] سے کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ پسند آیا یا نہیں لکھیں کہ آپ کو یہ سلسلہ کیسا لگا اور اس میں کیا کمی محسوس ہوئی۔ اسی سلسلے میں آپ مصنفین سے کوئی سوال پوچھنا چاہیں تو وہ بھی ہمیں لکھیں۔

اس شمارے میں:

- نزہت [illegible] حمید کا مکمل ناول۔ اب عمر کا عنوان کوئی نہیں،
- سدرۃ المنتہیٰ کا مکمل ناول۔ ریشم اور [illegible]،
- بشریٰ سعید، ثمرہ بخاری اور عفیفہ ثمر بیگ کے ناولٹ،
- رفعت ناہید سجاد اور رخسانہ نگار عدنان کے ناول،
- ہمایوں سعید اور ثمینہ سعید سے ملاقات،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔
- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ مصحف،
- [illegible] فائزہ افتخار [illegible] کے افسانے،
- لفظ لفظ روشنی۔ قارئین سے سروے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- خواتین ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر آپ کو کتنا پسند آیا؟ یہ بتانے کے لیے آپ کے خطوط اور ای میلز کا انتظار ہے۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں وہ ہم نے ان ہی مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

شکر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"(دنیا میں) اپنے سے نیچے والے (کمتر) کو دیکھو اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو۔ اس سے یہ ہوگا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔"

فوائد و مسائل

☆ نیچے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے کم ہے اور اوپر والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے بڑھ کر ہے۔

☆ اپنے سے زیادہ نعمت والے کو دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے یہ نعمت کم حاصل ہے۔ اس کمی کو شیطان اس انداز سے پیش کرتا ہے گویا یہ نعمت حاصل ہی نہیں۔ اس طرح محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ بات شکر کے بجائے اللہ سے شکوہ کرنے کی کی جاتی ہے جو ناشکری کی ایک بڑی صورت ہے۔
نیچے اپنے سے کم تر کو نظر میں رکھنے سے حاصل شدہ نعمت کی قدر معلوم ہوتی ہے جس سے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

☆ ہر نعمت کے بارے میں یہ کیفیت ہے کہ اگر ایک فرد کو وہ نعمت کسی سے کم ملی ہے تو وہ نعمت اسے کسی دوسرے سے زیادہ بھی ملی ہے۔ اس معاملے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک فرد کو ایک نعمت کسی سے کم ملی ہے تو کوئی دوسری نعمت اسے زیادہ بھی ملی ہے۔ جس طرح ایک شخص کسی سے کم دولت رکھتا ہے اور کسی سے زیادہ دولت مند بھی ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ اس سے دولت میں کم ہے تو صحت یا قوت میں اس سے بڑھ کر ہے۔ اگر حسن صورت میں کم ہے تو علم و فضل یا حسن سیرت میں اس سے زیادہ بھی ہے۔ لہٰذا احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور اللہ سے شکوہ کرنے کی کوئی

درست نہیں۔

اعمال

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے عملوں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔"

فوائد و مسائل

☆ خوب صورت یا بد صورت ہونا بندے کے ہاتھ میں نہیں بلکہ یہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ عمل اچھے ہوں تاکہ اللہ کو راضی کیا جاسکے۔

☆ اللہ کے ہاں مال دار اور بے زر برابر ہیں۔ مال دار کو محض دولت مند ہونے کی وجہ سے معافی نہیں مل سکتی اور نادار کو محض اس کی مفلسی کی بنا پر مجرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

☆ مال دار ہونا بھی اللہ کی آزمائش ہے اور مفلس ہونا دوسری طرح کی آزمائش۔ اگر مال دار شکر کرے تو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اور ناشکری کرے تو ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح نادار اگر صبر کرے تو اللہ کا پیارا ہے اور بے صبری کرے اور حرام کمائی کی کوشش کرے تو اللہ کے قرب سے محروم ہے۔

☆ انسان اگر نیکی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کی نیت اور خواہش ضرور رکھنی چاہیے۔ ایسی نیت پر بھی ثواب ملتا ہے۔

صبر

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی بار یہ فرماتے سنا ہے۔
"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کے پاس ایک صاع غلہ ہے نہ ایک صاع کھجوریں۔"

ان دنوں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں

فائدہ: "صاع" کا مطلب "ٹوپا" ہے جو غلہ ماپنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اہل مدینہ کا صاع تقریباً ڈھائی کلو گرام ہوتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کے پاس صرف ایک مد خوراک ہے۔"

فوائد و مسائل

☆ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد' استغنا' قناعت اور سادگی کا بیان ہے۔

☆ حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال بھر کے خرچ کے لیے کھجوریں اور جو وغیرہ اکٹھے دینے شروع کر دیے تھے لیکن امہات المومنین سخاوت سے کام لیتے ہوئے جلد ہی خرچ کر دیتی تھیں' اس لیے اکثر روٹی' سالن اور گوشت وغیرہ کے بغیر گزارہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات کھجوریں بھی میسر نہیں ہوتی تھیں۔

آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گزران

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں پر مہینہ بھر اس طرح سے گزر جاتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی گھر میں بھی دھواں نظر نہیں آتا تھا۔"

(حضرت ابو سلمہ رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کیا) "میں نے کہا۔ پھر یہ لوگ کیا کھاتے تھے؟"

ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا۔ "دو سیاہ چیزیں' کھجوریں اور پانی' البتہ ہمارے کچھ انصاری ہمسائے تھے' وہ مخلص ہمسائے تھے' ان کے گھروں میں پلنے والی کچھ بکریاں تھیں (جنہیں چرنے کے لیے چراگاہ میں نہیں لے جایا جاتا تھا گھر لا کر چارہ دیا جاتا تھا۔) وہ ان کا دودھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف (ہمارے ہاں) بھیج دیا کرتے تھے۔"

تین رات

حضرت سلمان بن صرد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے تو (ہماری یہ حالت تھی کہ) ہمیں تین رات تک کھانا میسر نہ ہوسکا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گرم کھانا حاضر کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔
"اللہ کا شکر ہے میرے پیٹ میں اتنے دن سے (تازہ اور) گرم کھانا نہیں گیا۔" (کھجور وغیرہ پر گزارہ رہا۔)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔"

فائدہ

مطلب یہ ہے کہ بستر عمدہ کپڑے کا نہیں تھا جس میں اون یا روئی بھری ہوئی ہو بلکہ چمڑے کا بستر بنا ہوا تھا اس میں کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی جو سخت اور ناہموار ہوتی ہے۔ لیکن چمڑے کی وجہ سے اس کی سختی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ اہل عرب چمڑے کو سادہ انداز سے تیار کرتے تھے جو نہ زیادہ قیمتی ہوتا تھا' نہ خوب صورت۔ اس لحاظ سے چمڑے کا بستر انتہائی سادگی کی مثال ہے۔

آخرت

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر تشریف فرما تھے۔ میں بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تہبند پہن رکھا ہے' دوسرا کوئی کپڑا زیب تن نہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو پر چٹائی سے نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک طرف صرف تھوڑے سے جو تھے۔ غالباً ایک صاع ہوں گے اور کیکر کے پتے تھے (جو چمڑے کی دباغت میں کام آتے ہیں) اور بغیر دباغت کھال لٹکی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ابن خطاب! آپ کیوں روتے ہیں؟"
میں نے کہا۔
"اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! میں کیوں نہ روؤں؟ اس چٹائی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں نشان پڑ گئے ہیں (کوئی نرم بستر بھی نہیں) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان رکھنے کی جگہ میں کچھ نظر نہیں آتا سوائے اس (ایک صاع جو) کے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ادھر کسریٰ اور قیصر باغوں اور میووں میں (عیش کر رہے) ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے برگزیدہ ہیں اور یہ آپ کا گوشہ خانہ ہے۔" (جو خالی پڑا ہے)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "خطاب کے بیٹے! کیا تو اس بات سے خوش نہیں' ہمیں آخرت مل جائے اور ان (قیصر و کسریٰ) کو دنیا؟"
"میں نے کہا کیوں نہیں!" (میں خوش ہوں۔)

فوائد و مسائل

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کا مال جمع نہیں کیا بلکہ زہد اختیار فرمایا۔

☆ گھر میں ایک دو وقت کی خوراک موجود ہونا زہد کے منافی نہیں۔

☆ بے تکلف ساتھیوں میں صرف تہبند پہن کر یعنی قمیص پہنے بغیر بیٹھنا جائز ہے۔

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے شدید محبت رکھتے تھے۔

☆ کافروں کو ان کی نیکیوں کا معاوضہ دنیا میں دنیوی سامان یا عیش و عشرت کی صورت میں مل جاتا ہے۔

☆ مسلمان پر دنیوی تنگ دستی آخرت میں درجات کی بلندی کا باعث ہے۔

والد رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی (حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) رخصت ہو کر میرے گھر آئیں، اس رات ہمارا بستر صرف ایک مینڈھے کی کھال پر مشتمل تھا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گزران

صدقہ

حضرت ابو مسعود (عقبہ بن عمرو انصاری) رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقے کا حکم دیتے تو (ہم) محنت (مزدوری) کرتے، تب ہم میں سے کوئی آدمی جاکر مزدوری کرتا اور ایک مد (کھجوریں یا جو وغیرہ) لے کر آتا (اور اسے صدقے کے طور پر پیش کر دیتا۔) آج تو ایک آدمی کے پاس ایک لاکھ کی رقم بھی موجود ہے۔"

(ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد) حضرت شقیق رحمتہ اللہ علیہ نے کہا۔ غالباً" ان کا اشارہ خود اپنی طرف تھا۔

فوائد و مسائل

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخاوت کے اعلا مقام پر فائز تھے کہ خود امداد کے مستحق ہونے کے باوجود امداد قبول نہیں کرتے تھے بلکہ اس مفلسی میں بھی محنت مزدوری کر کے خیرات کرتے تھے۔

☆ صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو یہ لازمی حکم نہیں دیتے تھے کہ خیرات کرو تب بھی ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہم بھی اس کی تعمیل کرنے والوں میں شامل ہو جائیں۔

☆ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا اچھا بدلہ دنیا میں بھی خوشحالی کی صورت میں مل جاتا ہے۔

☆ حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے حالات بیان فرمائے لیکن یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ یہ میرا اپنا واقعہ ہے تاکہ یہ ریاکاری میں شامل نہ ہو جائے جب کہ ان کا مقصد سامعین کو اس نیکی کی ترغیب دلانا تھا، اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اخلاص واضح ہے۔

استقامت

حضرت خالد بن عمیر رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔ ہمیں عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے منبر پر خطبہ دیا اور (اس میں یہ بھی) فرمایا۔

"میں نے دیکھا ہے کہ ہم سات افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، ہمیں کھانے کے لیے درختوں کے پتوں کے سوا کچھ بھی میسر نہ تھا۔ (ہم وہی کھاتے رہے) حتیٰ کہ ہماری باچھیں زخمی ہو گئیں۔"

فوائد و مسائل

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر آنے والے سخت حالات ہمارے لیے صبر و استقامت کا سبق ہیں۔

☆ منبر پر ایسے حالات بیان کرنے کا مقصد سامعین کو یہ سمجھانا ہے کہ اب جب کہ ہر قسم کی نعمتیں میسر ہیں، ان پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ان میں معمولی سی کمی پر شکوہ شروع نہیں کر دینا چاہیے۔

صبر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہیں بھوک کا سامنا کرنا پڑا جب کہ وہ سات افراد تھے۔ وہ فرماتے ہیں "مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کھجوریں عنایت فرمائیں۔ ہر آدمی کے لیے ایک کھجور۔"

فوائد و مسائل

☆ معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی ان کی ضرورت کی خوراک نہیں تھی، اس کے باوجود جو چند کھجوریں موجود تھیں وہی دے دیں۔

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے تھے۔ قائد کو اپنے ساتھیوں کا اسی طرح خیال رکھنا چاہیے۔

☆ تھوڑی چیز تقسیم کرتے وقت بھی انصاف اسی طرح ضروری ہے، جس طرح زیادہ مال کی تقسیم میں۔

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا صبر و ایثار بے مثال ہے کہ ایک ایک کھجور ہی پر اکتفا کر لیا کسی نے زیادہ حصہ لینے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

نعمتیں

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں، انہوں نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی۔

"پھر اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں ضرور سوال ہوگا۔"

حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ "ہم سے کون سی نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا؟ ہمیں تو صرف پانی اور کھجوریں ہی میسر ہیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "آگاہ رہو! یہ (سوال) ضرور ہوگا۔"

فوائد و مسائل

☆ جو نعمتیں ہماری نظر میں معمولی ہیں، غور کیا جائے تو وہ بھی بڑی نعمتیں ہیں، لہٰذا ان کا شکر کرنا ضروری ہے۔

☆ معمولی سے معمولی غذا بھی بھوکا رہنے کے مقابلے میں بہت بڑی نعمت ہے۔

☆ "آگاہ رہو! یہ ضرور ہوگا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر آج تمہارے پاس نعمتوں کی فراوانی نہیں ہے تو عن قریب یہ ہو جائے گی، یعنی فتوحات ہوں گی اور تمہیں وافر مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوگا۔ لہٰذا تمہیں بہت سی نعمتیں میسر ہوں گی۔ دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ایک انسان کو دنیا میں تھوڑا بہت مال و متاع ملا ہی ہے، یعنی کسی کو کم، کسی کو زیادہ، لہٰذا قیامت کے دن ہر شخص سے اس کو دی جانے والی ہر نعمت کے بارے میں سوال ہوگا، ہماری رائے میں دوسرا مفہوم راجح ہے۔ واللہ اعلم۔

جہاد

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک جہادی مہم پر) روانہ فرمایا۔ ہم تین سو افراد تھے۔ ہم اپنی غذائی اشیا اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ (مہم کے دوران میں) ہماری خوراک ختم ہو گئی حتیٰ کہ ایک ایک آدمی کے حصے میں ایک ایک کھجور آتی تھی۔"

کسی نے کہا۔

"ابو عبداللہ! ایک کھجور سے آدمی کا کیا گزارہ ہوتا ہوگا؟"

انہوں نے فرمایا۔ "اس کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب وہ (ایک ایک کھجور) بھی نہ رہی۔ (آخر) ہم سمندر پر پہنچے تو اچانک ایک بڑی مچھلی نظر آئی جسے سمندر نے (پانی سے باہر) پھینک دیا تھا۔ ہم (سارا لشکر) اس میں سے اٹھارہ دن تک کھاتے رہے۔"

غزل

دل عشق میں بے پایاں، سودا ہو تو ایسا ہو
دریا ہو تو ایسا ہو، صحرا ہو تو ایسا ہو

اے قیس جنوں پیشہ، انشا کو کبھی دیکھا
وحشی ہو تو ایسا ہو، رسوا ہو تو ایسا ہو

دریا بہ حباب اندر، طوفاں بہ سحاب اندر
محشر بہ حجاب اندر، ہونا ہو تو ایسا ہو

ہم سے نہیں رشتہ بھی، ہم سے نہیں ملتا بھی
ہے پاس وہ بیٹھا بھی، دھوکا ہو تو ایسا ہو

وہ بھی رہا بیگانہ، ہم نے بھی نہ پہچانا
ہاں اے دلِ دیوانہ، اپنا ہو تو ایسا ہو

اس درد میں کیا کیا ہے، رسوائی بھی لذت بھی
کانٹا ہو تو ایسا ہو، چبھتا ہو تو ایسا ہو

ہم نے یہی مانگا تھا، اس نے یہی بخشا ہے
بندہ ہو تو ایسا ہو، داتا ہو تو ایسا ہو

ابن انشاء

انسان کی شخصیت بہت سے رنگوں سے مل کر مرتب ہوتی ہے اس کی عادات، مزاج، ارد گرد کے لوگوں کے ساتھ رویہ اور روزمرہ کے معمولات اس کی ظاہری شخصیت سامنے لاتے ہیں لیکن اس کی شخصیت کے حقیقی خدوخال، احساس، فکر اور ذات کے داخلی عکس تک رسائی آسان کام نہیں۔

فرانس کے ممتاز انشائیہ نگار مونتین نے سسلی کے بادشاہ رینے کی ایک تصویر دیکھی جو اس نے چاک سے خود بنائی تھی۔ تصویر دیکھ کر مونتین اتنا متاثر ہوا کہ اس نے کہا۔

"قانونی طور پر ہر شخص کے لیے لازم کیوں نہیں کہ وہ اپنی تصویر خود بنائے۔"

رنگوں اور لکیروں سے تصویر بنانا شاید سب کے لیے ممکن نہ ہو لیکن الفاظ سے تصویر کشی ضرور کی جا سکتی ہے اگرچہ کہ یہ بھی آسان نہیں۔

اس سلسلے کا آغاز ہم آمنہ مفتی سے کر رہے ہیں کہ وہ لفظوں سے اپنی تصویر بنائیں۔ تلخ حقیقتوں کو تیکھے اور کاٹ دار انداز میں پیش کرنے والی آمنہ مفتی اپنی تحریروں میں بہت سنجیدہ، باریک بین نظر آتی ہیں مگر بات چیت اور گفتگو میں یکسر مختلف ہیں۔ حقیقتوں کی آگہی نے قلم میں بے شک تلخی بھر دی ہو لیکن ان کے مزاج پر اثر انداز نہیں ہوئی ہے۔ ان کے مزاج میں جو دل موہ لینے والی اپنائیت، شٹاس اور والہانہ پن ہے وہ برقرار ہے۔

تصویر سی بناتے جائیں

آمنہ مفتی

ادارہ

میری صبح کا آغاز بہت جلدی ہوتا ہے۔ ساڑھے چھ بجے بچوں کو اسکول چھوڑ کے آتے آتے سوا سات ہو جاتے ہیں۔ واپس آ کر اس دن کے لیے الگ کیے گئے کام ان کی فہرست اور کون سا کام کتنا اہم ہے، فوریاً؟ "پندرہ منٹ میں چائے کے ساتھ یہ سب نمٹ جاتا ہے۔ اگر لاہور میں ہوں تو پھر زیادہ تر لکھنے کا کام ہوتا ہے کیونکہ یہاں باہر کے کام کم ہی ہوتے ہیں۔ پھر بھی بلوں کی ادائیگی۔ گھر کی چھوٹی موٹی خریداری تو لگی ہی رہتی ہے۔ گھر میں ہونے کی صورت میں صبح کے پکے دو گھنٹے یعنی نو بجے تک میں اپنے Organic Patch میں کام کرتی ہوں۔ یہاں میں نے مختلف طرح کی سبزیاں، پھل اور جڑی بوٹیاں اگا رکھی ہیں، جن کو بالکل کیمیکلز سے پاک اگایا جاتا ہے۔ گرین ہاؤس بھی ہے۔ یہ کام خاصا مشکل ہے، لیکن مجھے امید ہے آگے چل کے بہت آسان ہو جائے گا۔

نو دس بجے تک کھانا پکانے کا بتا دیتی ہوں، کھانا ہمارے ہاں بہت محنت سے پکتا ہے۔ ذائقے پر کوئی شخص کمپرومائز نہیں کرتا۔ لیکن مریم کھانا بہت اچھا پکاتی ہے۔

دس سے پونے ایک تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتی ہوں۔ ابھی حال ہی میں اپنے نئے ناول کی پروف ریڈنگ ختم کی ہے۔ دیکھیے مہینہ پندرہ دن تک مارکیٹ میں آجائے گا۔ آج کل زیادہ تر پڑھتی ہوں کہ لائبریری پانچ منٹ کی ڈرائیو پہ ہے۔

بچوں کو اسکول سے لے کر گھر پہنچتی ہوں' ڈھائی بجے' تین سوا تین تک کھانا کھایا جاتا ہے۔ باقی کی ساری شام بچوں کے ساتھ گزرتی ہے۔ ان کا ہوم ورک' اسکول کی باتیں' دوستوں کے قصے' خیالی کہانیاں' سوالات اور اسٹیشنری کی خریداری' میرے بچوں کے بستوں میں بقول ان کے borrawer رہتے ہیں جو روزانہ ان سے پنسل' شارپنر اور ربر مانگ کر لے جاتے ہیں۔ کسی کسی دن تو لنچ بکس اور ٹائی' یا سوئٹر بھی لے جاتے ہیں اور ایک دن تو ایسا غضب ہوا کہ شمیر کے جوتوں کے Laces بھی لے گئے' بتائیے۔

میرے بچوں کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ شہوار' سائنس' جغرافیہ اور تاریخ کی کتابیں لائبریری سے لاتا ہے اور ایک گھنٹے میں کتاب ختم۔ اب ساری کتاب مجھے سنائی جاتی ہے اور میرا امتحان شروع۔ شمیر کو خیالی سپر ہیرو بنانے اور ان کی کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔ بے چارے کی وہ کیلیبری ابھی کم ہے۔ جھنجلا جاتا ہے۔ ہمارے گھر میں ساری شام علم' قلم اور کہانیاں چلتی رہتی ہیں۔

میرے مشاغل تو بہت محدود سے ہیں' لکھنا' پڑھنا' بنانا' کھانا پکانا خاصا محدود ہو گیا ہے لیکن پھر بھی چند روز میں دل میں کچھ نہ کچھ پکا لیتی ہوں' کڑھائی سلائی کا سلسلہ عرصے سے موقوف ہے۔ لیکن درزن کو بتا کر' بیڈ شیٹس' دسترخوان' رضائیاں' چادریں' تولیوں پہ کڑھائیاں وغیرہ کرواتی رہتی ہوں۔

باغبانی کا شوق مجھے ورثے میں ملا ہے' ہماری کوئی پردادی سنا ہے' شاہ آصف الدولہ کے زمانے میں کہیں دور بیاہی گئیں تو اپنا لگایا ہوا خوب چھتنار درخت' دیا نکلوا کر تھے پہ رکھ کے ساتھ لے کے گئیں۔

میری مرحومہ پھوپھی قیصر جہاں بیگم کے لگائے ہوئے درخت آج بھی میرے گھر میں ہیں' گولر' بیری اور چنبیلی' گولر پہ دن بھر گلہریاں چہچہاتی ہیں۔ اور پھل کے موسم میں اچانک کسی رات بڑ باگلوں کا جھنڈ آجاتا

ہے۔ بلی کی وضع قطع اور جسامت کی یہ باگلیں جس رات آتی ہیں' میں گولر کے نیچے چپ کھڑی کروا کے سرچ لائٹ سے انہیں دیکھتی ہوں' کم بختیں ذرا جو ڈر جائیں یا شاید وہ بھی میرے پروفائل کو خاطر میں نہیں لاتیں۔

کچھ عرصہ ایک اسکول میں بطور پرنسپل کام کیا' لیکن بوجوہ چھوڑ دیا' گھومنا پھرنا تو یہ ہے کہ ہفتے میں ایک' دو چکر لاہور اور اپنے شہر کے لگ جاتے ہیں' سیاحتی سفر کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ ہاں پاکستان کے بہت سے شہروں کو بہت قریب سے دیکھا ہے' گرمیوں کی چھٹیوں میں مختلف لمبے پروگرام بنتے ہی رہتے ہیں۔

چھٹی کا دن ذرا مختلف ہوتا ہے' واپسی کا سفر اور وہاں جا کے ایک ہفتے کے دوران جو کچھ حل طلب پیش آیا ہو سب کو دیکھنا' اگلے روز واپسی کی تیاری' اگر کوئی چھٹی لاہور میں گزرے تو دوپہر کا کھانا پکا لیتی ہوں' رات کو اگر سینما میں اچھی بچوں کی پسند کی فلم ہو تو فلم دیکھ لی جاتی ہے۔

میرا مزاج شخص آج تک خود نہیں سمجھ سکی' سنے اپنے کا وصف ہے اور شاید انسان کو انسان ہونے کا بہت زیادہ مارجن دیتی ہوں۔ گزرنے والے وقت کو بہت پیچھے سے بھانپ لیتی ہوں اور اس معاملے میں بیر پکا را ہوں۔

یہ ہی چیزیں جو خوبیاں ہیں' یہ ہی خامیاں بن جاتی ہیں' ڈٹ جانے والا شخص ضدی اور اڑیل بھی ہوتا ہے' انسانوں کی غلطیوں کو بہت زیادہ ہنس کر فائن کرنا بھی ایک عیب ہے۔

غصے کا کیا ہے بھئی۔ وہ تو بقول شخصے' تیوری کے تین بل سوتے میں بھی نہیں جاتے' غصہ آنے کے بے شمار اسباب ہیں' میں ہر کام کو ایک نظام اور قاعدے سے چلاتی ہوں۔ جب کوئی اس نظام میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو بہت غصہ آتا ہے۔

خوشی کے اسباب ہزار ہیں۔ اپنے بچوں کو جس وقت بھی دیکھوں' جی خوش ہو جاتا ہے۔ اللہ کا شکر ادا

کرتی ہوں' سامنے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتا دیکھ کر۔ اس بہار میں میرے لگائے ہوئے سیبوں اور آلوچوں پہ پہلی دفعہ پھل آئے ہیں۔ یہ بھی ایک بہت بڑی خوشی ہے۔ خوب صورت نظارے' تصویریں' اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر' کچھ اچھا لکھ کے' کوئی اچھا جملہ بول کے بہت خوشی ہوتی ہے۔

کھانے کے معاملے میں' بہت خوش ذوق ہوں' کم خوراک ہوں' مگر جو کھانا جس ترکیب سے پکتا ہے اس میں ذرا بھی ردو بدل ہو جائے تو کتنی ہی بھوک کیوں نہ ہو نہیں کھا سکتی۔ درست طریقے پہ جو کی روٹی بھی پکی ہوگی تو پسندیدہ ہوگی' لیکن آلو گوشت میں ٹماٹر اور ہر شوربے دار سالن میں لہسن کے ساتھ ادرک ہو' تو

بالکل نہیں کھا سکتی۔ میزبان چاہے ناراض ہو جائے' ایسے موقعوں پر سلاد بہت مدد کرتی ہے' کیونکہ قدرت کبھی کھیرے کو کسی اور ذائقے میں پیدا نہیں کرتی۔

مدھم رنگ' سرمئی' فالسئی' دھانی' گلابی اور شوخ رنگوں میں بسنتی' گیندئی یا گلابی' جدی ہوں' میرے دوستوں میں صبر کا مادہ بہت ہونا چاہیے' سلجھے ہوئے' بہت پڑھے لکھے لوگوں سے دوستی ہوتی ہے' پھر بالکل ہی انگوٹھا چھاپ' فقط فوک وزڈم پہ زندہ رہنے والوں سے' وجوہات بے شمار ہیں۔ بڑی وجہ تو یہ دونوں کے پاس ان دنیاؤں کا علم ہوتا ہے جو میری سے دور ہیں' دوستی جلدی ہو جاتی ہے' کیونکہ بدگمان نہیں' لوگوں پہ بلاوجہ شک نہیں کرتی۔

اور اس سوال کے آدھے حصے سے مجھے اختلاف ہے۔ یہ فقط آپ کی محبت ہے ورنہ من آنم کہ من دانم، کچھ ایسا خاص نہیں لکھتی۔ حالات کا یہ ہے کہ ننھیال ددھیال دونوں طرف زبان بھی تھی، علم بھی، علم دوستی بھی اور لکھنے پڑھنے والوں کو ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

دادی خاص دلی کی تھیں، نانی کرت پور کی، ابو کے ایک چچا کے سالے مرزا اجمل بیگ تھے۔ مغل بچے، زبان نہایت صاف، پطرس بخاری کے دوست تھے۔ بڑا عرصہ بمبئی وغیرہ میں کام کیا۔ زمانے دیکھنے کے بعد اپنی کتابوں کے صندوق، ڈاڑیاں، پاپ، مچھلی پکڑنے کی بنسی وغیرہ لے کے ابو کے اصرار پہ ہمارے ہاں رہنے لگے۔ مجھے دادا اجمل بہت فیسی نیٹ کرتے تھے۔ انہیں فالج تھا اور پاؤں ذرا گھسیٹ کے چلتے تھے۔ اب یہ بیٹھے ہیں۔ تالاب میں کنڈی ڈالے اور "ادھی عورت، آدھا خواب" پڑھی جا رہی ہے، میں پیچھے کھڑی پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں، کچھ دیکھ خاک نہیں آ رہی، لیکن کھڑی ہوں۔

ابن انشاء کی غزل سن رہے ہیں، "میں بھی سر و حسن رہی ہوں" تو جب سات آٹھ سال کی عمر سے بچے کے سامنے اتنا ادب ہو گا، شعری زبان اور چاروں طرف محسوس کرنے کو بہت کچھ۔ صحن میں ایک بڑا سا تھال جس کے چاروں طرف ہلکے کناروں پہ درختوں کا حاشیہ تھا اور اس تھال میں ان گنت چھوٹے چھوٹے کردار جڑے ہوئے تھے۔ اماں ستال جو گھر اپن کے چنچی پہ نمک چیتی تھی اور ماسی زہرہ جو کلے میں پان دبائے اپنی فلطلی کو روتی تھی کہ آٹھ لڑکیوں کو چھوڑ کر کیوں ایک بدذات بدشکل کمٹو کے ساتھ بھاگ گئی اور چاچا جو گرمیوں میں بانٹے جانے والے ستو اور شکر لیے کر کے سر پہ مل لیتا تھا کہ تاثیر تو ٹھنڈی ہے چاہے سر پہ باندھو، چاہے پیو۔

تو یہ ان گنت لوگ قطار باندھے کھڑے ہیں، پہلے مجھے لکھو، نہیں مجھے، نہیں مجھے۔ ابھی تو کسی کی بھی باری نہیں آئی۔

اردو کے بھی مصنفین، انگریزی کے بھی، لیکن زیادہ تر قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین اور الطاف فاطمہ کو پڑھتی ہوں۔ پسندیدہ کتابیں بے شمار ہیں، بلکہ شاید ہر کتاب جتنی محنت سے لکھی جاتی ہے اسے پسند کرنا چاہیے۔ "دستک نہ دو" پہلی بار بارہ سال کی عمر میں پڑھی اور اب تک شاید چالیس مرتبہ پڑھ چکی ہوں۔ "آگ کا دریا"، "اداس نسلیں"، "بستی" ہم دونوں یہ بھی بار بار پڑھیں۔ فسانہ آزاد بھی۔ بہت معذرت کے ساتھ "دروازہ کھلتا ہے" کا ایک باب "تخلیق" میں پڑھ کے بامراد خریدی مگر پانچویں باب سے آگے جانے کی ہمت نہیں ہوئی، کتاب بہت اعلا ہے، شاید میرا دماغ ہی اتنا پوچ اور گھٹیا ہے کہ اسے پڑھ نہیں پایا۔

میرے شوہر مفتی عاصم اسٹیریو ٹائپ لوگوں سے ذرا فرق ہیں، میرا لکھا ہوا کبھی نہیں پڑھتے، انہیں شکار کا شوق ہے، فلمیں دیکھنا اور بڑے زبردست نشانے باز ہیں۔ لکھنے میں تعاون لیجیے تو ضرور کیا کہ مجھے جو معلومات چاہیے [illegible] ملاقات کے لیے [illegible] اپنوں سے [illegible] ہیں۔ جہاں جانا چاہا جانے دیا، میں کیا لکھتی ہوں کیوں لکھتی ہوں اس کی زیادہ کھوج بین نہیں کرتے۔

شادی نہ ہوتی تو شاید میں لکھ نہ سکتی، کیونکہ تب مجھے خود کو معاشی طور پہ سپورٹ کرنے کی ذمہ داری ہوتی۔ اب چونکہ میں معاشی طور پہ بے فکر ہوں۔ اس لیے میں لکھ رہی ہوں، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کام لمبا لٹک جاتا ہے، کیونکہ گھریلو ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ خیال کی رو جہاں سے چلی تھی، دوبارہ اس گلی میں نہیں جاتی۔ بھٹک جاتی ہے، آغاز کچھ ہوتا ہے، انجام کچھ، لیکن بہرطور اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

شادی سے پہلے میں نے زیادہ شاعری کی اور وہ قطعاً "رومانٹک" یا پھر انقلابی قسم کی شاعری تھی جو میں مختلف فرضی ناموں سے چھپواتی تھی۔ کچھ افسانے بھی شائع ہوئے، لیکن اس وقت تک زندگی کے بہت سے پہلو میری نظر میں نہیں تھے۔ بعد کی تحریروں میں ایک ٹھہراؤ ہے۔

سمجھوتا میں نے نہیں کیا، ہم دونوں ایک دوسرے کو اتنی space دیتے ہیں کہ اپنی اپنی ذات کی تکمیل کر سکیں۔ پہلے تو یہ بات بہت سے لوگوں کو سمجھ نہیں آتی۔ لیکن چند سالوں میں لوگ متفق ہو گئے اور اب تو وہ سب لوگ مرحوم ہو گئے، ان بے چاروں نے اپنا وقت اور توانائی ضائع کی۔

"کبھی کبھی"، "سلسلہ"، "تال" وغیرہ کے گانے اچھے لگتے ہیں۔ زیادہ تر غزل پسند ہے، وہ بھی جگجیت کی آواز میں، مہدی حسن، نورجہاں، راحت فتح علی (اگر وہ توت سیاہ کا جنگل نہ گاتے تو) دھرمیندر، کمار کی جوانی "خاموشی" کے زمانے کی سمجھ لیں، پھر امیتابھ اور اب سیف علی اور شاہد کپور، کیونکہ میرے دونوں بیٹوں میں شباہت آتی ہے۔

پاکستان کی فلم انڈسٹری میں کوئی بے چارہ بچا ہی کہاں ہے۔ چلیں وحید مراد مرحوم سمجھ لیں، بس ان کے بعد انڈسٹری کا بھی۔

پسندیدہ ہیروئن ریکھا، ایشوریہ رائے، دونوں بہت باصلاحیت ہیں۔ ہمارے ہاں ریشم میں صلاحیت ہے۔ مگر مواقع نہیں، ریما بھی اچھی تھی، لیکن کامیابی حاصل کرنے کے لیے آپ کو درست وقت پہ درست جگہ ہونا چاہیے۔

اور اپنے بارے میں کیا بتاؤں، کہانیاں چاروں طرف ہیں، ہر شخص ایک پروٹو ٹائپ ہے۔ مگر بہت سی کہانیاں لکھی نہیں جا سکتیں۔ کئی کردار ایسے ہیں جن پہ مجھے پورے بھی نہیں لکھ سکتی۔ [illegible] بے شمار ہیں۔ سماجی تجربات [illegible] وغیرہ [illegible] لکھا ہوا ہر حرف سچ نہیں اور ساری فکشن جھوٹ نہیں۔ جھوٹ اور سچ کس تناسب میں ملانا ہے یہی فکشن نگار کا فن ہے۔ جھوٹ اور سچ کو ملاتے ملاتے کئی کردار ایسی شکل اختیار کر جاتے ہیں جو ایک تیسرا کردار ہوتا ہے، عین حقیقی۔

میرے اگلے ناول "آخری زمانہ میں" میں نے قطعاً "فکشن نگاری" سے کام لیا ہے۔ مگر اس کے کئی ابواب اور "خصوصاً" وہ جن میں مشرق وسطی میں انقلاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعینہ ویسے ہی پیش آ رہا ہے۔ حالانکہ وہ سب کچھ فرضی ہے، نہ کوئی خالد ہے اور نہ کسی خالد نے جہاد کیا ہے اور نہ کوئی راحیلہ ہے اور نہ کوئی لال مسجد، لیکن جب پڑھا جائے تو لگتا ہے حقیقت لکھی ہے، تو ایسی صورت حال اکثر پیش آتی ہے۔

آج کی مادی دنیا میں جب انسان اور انسانی قدریں پیچھے رہ گئی ہیں، ایسے میں تخلیق کار ہی ہے جو معاشرے میں انسانی قدروں، محبت، اخوت اور دوستی کی فضا قائم رکھے ہوئے ہے۔ وہ زندگی سے حاصل کیے تجربوں کو تخلیق کی شکل دیتا ہے لیکن حسن اور توازن کے ساتھ۔ فن اگر سوچ اور فکر سے عاری ہو تو یکسر سطحی ہو جاتا ہے۔ ایک اچھی تحریر کا مقصد انسان اور انسانیت کے بہتر امکانات کی ترغیب ہوتی ہے۔ تخلیق کار خواہ منفی کردار پیش کرے یا مثبت کردار سامنے لائے اس کے پس پشت ایک پیاری اور رہنے کے قابل دنیا کی خواہش ہوتی ہے۔ ایسی دنیا جو نیکی، سچائی اور حسن کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔

لیکن اس فکر اور سوچ کے لیے اظہار میں خوش سلیقگی اور خوب صورت الفاظ بھی ضروری ہیں۔ خیال یا تجربہ کتنا ہی اہمیت کا حامل کیوں نہ ہو اگر خوب صورت الفاظ کا پیراہن نہ ہو تو تاثر اور اہمیت کھو دیتا ہے۔ بیان اور الفاظ کی کشش ہی تحریر کو دلچسپ بناتی ہے ورنہ تحریر خشک اور بے رس ہو جاتی ہے۔

ہماری مصنفین وہ اخلاقی اور تہذیبی روایتوں کی پاس داری کرتے ہوئے تحریر کے حسن کو بھی ملحوظ رکھتی ہیں۔ ان کی فکر، سوچ، احساس اور حسن بیان کا یہ انداز دیکھیے۔

○ ...زمین انسان کا مسکن ہے جو اسے جھک کر نہیں چھوتا وہ ٹوٹ کر زمین بوس ہو جاتا ہے (زہرہ ممتاز)

○ ...جو کسی کا "صرف" ہوتا ہے وہ کسی کا "سب کچھ" ہوتا ہے (رفعت سراج)

○ ...عام لوگ... عام دکھ... عام خوشیاں... عام زندگی... زندگی کا حسن ہی دراصل "عام" ہونے میں ہے۔ (تنزیلہ ریاض)

○ ...کبھی کبھی حالات کی خرابی میں ہی کوئی بھید بھری مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ (عالیہ بخاری)

○ ...محبتیں اور رشتے جہاں سے مل جائیں جتنے بھی مل سکیں جھولی بھر کے سمیٹ لینا چاہیے۔ (فائزہ افتخار)

○ ...دل گنجان کرنے سے مطابق کر دینے ... محبتوں سے دلوں کو تسخیر کر لینے ... سے ویران آسیب زدہ گھر آباد ہو جاتے ہیں (رخسانہ نگار عدنان)

سالگرہ نمبر کے سروے کا پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔

(1) وہ کون سا جملہ یا پیراگراف ہے جس نے آپ کے ذہن میں روشنی پیدا کی۔

(2) کبھی کسی ناول یا کہانی کا انجام بدلنے کو جی چاہا؟

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے دانش کے کتنے قیمتی موتی چنے ہیں۔

لفظ روشنی ہیں

ادارہ

اسماء اقبال عمران۔۔۔ لاہور

۹۵ء کی دہائی سے لے کر اب تک خواتین ڈائجسٹ، شعاع، کرن پڑھتے ہوئے زندگی کے شب و روز گزر رہے ہیں۔

1- ویسے تو بہت سے جملے یا پیراگراف نے زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ہاتھ پکڑ کر رہنمائی کی ہے مگر ایک جملہ جو تنزیلہ ریاض کے ناول سے ہے۔

"جبر کو صبر سے برداشت کرنے والوں کے لیے صرف قبر ہی رہ جاتی ہے۔"

یہ ایسا جملہ ہے جو آج بھی میرے فریج کے نوٹ بک پر لگا ہوا ہے اور میں اس کا پیچھا تبدیل کرتی رہتی ہوں۔

2- بہت دفعہ ناول یا کہانی کا انجام بدلنے کو جی چاہا مگر ہماری رائٹر ہمارے لیے اپنی محنت و لگن سے لکھتی ہیں تو وہ جو لکھتی ہیں سر آنکھوں پر ہے مگر ایک ناول "امر بیل" "اس کا انجام ایسا ہو تا کہ عمر جہانگیر سے علیزے محبت کرتا، شادی کرتا اور اس ملک کے ... کرپٹ ... بیوروکریٹ ... کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ... لیکن ایسا ممکن نہیں ... میرا ایمان ہے کہ "ہر برائی اچھائی سے ختم ہو سکتی ہے۔"

ثمینہ اکرم۔۔۔ بہار کالونی لیاری

دل کی گہرائیوں سے خواتین ڈائجسٹ کو اس کی سالگرہ مبارک ہو۔ اس کا معیار روز اول کی طرح آج بھی بلندی کے مقام پر ہے۔ جس کے لیے تمام ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔

1- یہ حقیقت ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کی ان گنت تحریریں اپنے اندر ایک گہرا مقصد اور اصلاحی پہلو لیے ہوتی ہیں۔ کسی کا لکھا اگر ایک جملہ بھی کسی کی زندگی کا رخ بدل دے تو ... سمجھیں ... بھی ایک جہاد ہے۔ اس مرتبہ سالگرہ کے سروے کے سوالات ... پورے 15 روز سوال نمبر (1) کا جواب تلاش کرتے رہے ... (بھی اس کے لیے پچھلے 13 شمارے جو دوبارہ

سے بڑھتے پڑھے۔

"کائنات کا سب سے انمول خزانہ ہے ماں باپ اور بہن بھائی۔ جو نفرت جیسی برف سے بھی رگوں میں دوڑتے خون کو منجمد نہیں ہونے دیتے۔ اپنی جڑوں اور اپنی شناخت کے ساتھ جینا ہی زندگی ہے۔"
(سعدیہ عزیز سعدی)

"اگر کسی سفر کی صعوبتوں سے پاؤں آبلہ پا اور وجود تھکاوٹ سے چور ہو تو کبھی دوسرے سفر کا ارادہ فوراً نہیں باندھنا چاہیے۔ منزل تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔" (شگفتہ بھٹی)

"انسان شخصی ارتقاء کے ابتدائی ادوار میں گیلی مٹی کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا کمہار تربیت کے چاک پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی مانگ کو مد نظر رکھ کر انہیں ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔"
(بشریٰ سعید)

"جن سے محبت کی جاتی ہے ان کے لیے دل میں ایک قبرستان بھی بنا دیا جاتا ہے۔ جس میں اپنے محبوب کی ساری خامیاں دفن کر دی جاتی ہیں اور ان پر کتبے بھی نہیں لگائے جاتے۔" (مہا احمد)

2۔ [illegible] احمد کا ناول "دل کی راجدھانی کی ملکہ" جس کا اختتام پڑھ کر ایک دم شاک لگا اور ہماری توقع کے برعکس یہ اینڈ ہوا۔
اگر میں اینڈ لکھتی تو کچھ اس طرح ہوتا کہ مایا کو بدر غازان نے سچے دل سے چاہا تھا۔ دونوں کے درمیان مذہب کا فرق بے شک تھا۔ مایا بدر سے شادی بے شک نہ کرتی مگر اچھے دوستوں کی طرح اس سے جدا ہو جاتی تاکہ بدر زہرہ کے ساتھ اپنی نئی زندگی ایک اچھی امید سے شروع کر سکتا نہ کہ وہ تمام عمر یہ سمجھتا رہے گا کہ مایا جان ہار گئی۔ کیونکہ اس کی موتی کی لڑی ٹوٹ گئی تھی۔

سعدیہ ثروت ۔۔۔ فیصل آباد

خواتین ڈائجسٹ اور ہمارا ساتھ بیس سال پرانا ہے اس ڈائجسٹ کا۔ کردار میری زندگی میں بہت نمایاں ہے اور مجھے میرے اللہ سے قریب کرنے میں ہاتھ ہماری رائٹرز کا ہے جو ہمیں کہانی کے ذریعے [illegible] کر اللہ سے قریب کر دیتی ہیں اور ہمارے [illegible] کے کئی در کھل جاتے ہیں اور یہ وہ طریقہ تبلیغ ہے جو بہت پر اثر ہے اور دور رس اثرات کا حامل ہے۔

1۔ آپ کے بے شمار ہدایت و نور کے موتی ہیں جو [illegible] نے خواتین کی تحریروں سے چنے اور اپنی ڈائری کی زینت بنائے۔ ان میں سرفہرست عمیرہ احمد ہیں۔ "شہرذات" سے ایک اقتباس۔

"مرد تو دروازہ ہے 'دروازے' کا کام رستہ دینا ہے رستہ روکنا نہیں اور رستہ اس نے روک دیا ہے۔ تم اگر [illegible] عورت کا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ آگے جانے نہیں دیتا۔ اسی لیے تو عورت نہ پیغمبر ہوتی ہے اور نہ ولی۔ وہ دروازہ کھولنے کی کوشش ہی نہیں کرتی۔ اسی دروازے کی چوکھٹ پر ہی اسے ہی سجدہ کرتی رہتی ہے۔ دروازہ پھر رستہ کیوں نہ روکے حالانکہ یہ نہیں ہے اور نہ ہی کرنا ہی چاہیے محض وجود کی طلب ہے ذات کی چاہ نہیں۔"

2۔ نومبر 2010ء میں نایاب جیلانی کا مکمل ناول "زرد پتوں کا شجر" شائع ہوا تھا۔ روشانے خان [illegible] ہیرو [illegible] تھا [illegible] کے سامنے [illegible] نہیں [illegible] کا [illegible] اگر میں اس کا اینڈ لکھوں تو اس میں روشانے خان جیسے کردار بہت وار ہوئے ہیں۔

صباء شفیق ۔۔۔ جہلم

مصروفیت ہونے کے باوجود میں ٹائم نکال کر لکھ رہی ہوں کیونکہ اتنے اچھے سوالات کا جواب دینے کا موقع دوبارہ تھوڑی ملے گا۔ دوسرے لوگ اگر آج ہمارے کردار کی تعریف کرتے ہیں تو اس میں بہت بڑا خواتین ڈائجسٹ اور اس میں لکھنے والی رائٹرز کا ہاتھ ہے جیسے کہ ایک بار میری سسٹر نادیہ کو اس کی دوست نے کہا کہ

1۔ "تم جیسی کہیں بھی چلی جاؤ اپنی لمس یاد رکھتی ہو۔ تمہیں خود یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا

ہمارے لیے سچ ہے۔
میری ڈائری میں لکھے ہوئے کچھ انمول موتی یہ ہیں۔

"محبتوں کا حصار جدائی تو ڈھا بھی سکتا ہے تو محبت کا خدا ایسا بھی نہیں ہونے دیتا کہ محبت اگر امید اور حیات تو نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔" (سعدیہ عزیز آفریدی)

"ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی جگہ کیوں ہے کہ ہم تمام رشتوں سے ایک جیسی محبت نہیں کرتے۔" (راحت شفیق)

"[illegible] کی چھوٹی سی غلطی معاف نہیں کر سکتے وہ ایسے یقین کر لے کہ خدا اس کے بڑے بڑے گناہ معاف کر دے گا۔" (عمیرہ احمد)

بھی بڑوں کو بھی چھوٹوں کے آگے جھک جانا چاہیے اس سے ان کی عزت میں فرق نہیں آتا بلکہ چھوٹوں کو بھی جھکنا آ جاتا ہے۔ (عمیرہ احمد)

بہت سارے ایسے پیراگراف ہیں جن سے ذہن میں روشنی اور دل کو سکون ملا بہت کچھ سیکھا ایمان امید محبت کا یہ پیراگراف مجھے بہت پسند ہے۔

"ایمان کے شیشے پر کتنی ہی گرد اور مٹی کیوں نہ ہو اسے صاف کیا جا سکتا ہے بس صرف ایک ہاتھ پھیرنا پڑتا ہے اور شیشے میں سے عکس نظر آنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر ہر ہاتھ کے ساتھ عکس پہلے سے زیادہ صاف اور چمکدار ہو جاتا ہے اور وہ ہاتھ اس محبت کا ہوتا ہے جو ایمان سے ہوتی ہے۔"

بقیہ صفحہ 278 پر

میں پہلی جیسا لگا۔ مگر ہوا ایسا نہیں۔ ناول عنوان کے بالکل برعکس تھا۔ ادی اماں کا کردار مجھے بے حد اچھا لگا۔ اختتام اگرچہ خاصا فلمی سا تھا مگر پھر بھی ناول اچھا لگا۔

نایاب جیلانی کا ناول ... کیا کہنے ... کبھی کبھی نایاب بہت اچھا لکھتی ہیں کہ دل کو چھو جاتا ہے اور کبھی ... بالکل متاثر نہیں کر سکیں۔ اس ماہ کہانی خاص نہ لگی۔

اب آتی ہوں اس تحریر کی طرف جس نے پہلی قسط سے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ ایک ایک لفظ ... ایک ایک سطر ... کمال ہے۔ بشریٰ کی طویل غیر حاضری کے بعد "سنگ گر" جیسا شاہکار تخلیق ہوا تھا۔ ایک کہانی کا مرکزی خیال پھر نکالے، حکیم بیگم و عمر کے کردار کہانی کی جان ہیں۔ ماضی و مستقبل کا حسین امتزاج ہے۔ بشریٰ نہایت کامیابی سے تمام کرداروں کو نبھا رہی ہیں۔

نیم آمنہ کا ناول دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ناول انہوں نے بہت اچھا لکھا۔ مگر تحریر کی ای کا ماضی۔ کچھ وضاحت کا متقاضی ضرور تھا۔ ورنہ موضوع اچھا تھا۔

نایاب جیلانی کا مکمل ناول بھی اس بار مجھے بنا کسی تنقید کے مجھے از حد پسند آیا۔ سرجیل اور خالہ کا کردار بہت اچھا لگا۔

نمرہ نے جب جب لکھا، خوب لکھا، ہر بار نیا موضوع۔ جو لکھا نیا لا اور ہر موضوع پر مکمل گرفت۔

افسانے سب ہی خوب رہے۔ عنیقہ نے بہت جلد مقام بنایا۔ راشدہ بھی مکمل ناول بھی لکھیں۔

ج: پیاری عنیقہ! طویل غیر حاضری کے بعد آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کا ذہن منتشر کیوں ہے، سستی اور مایوسی کیوں چھائی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں۔ کم و بیش سب کا یہی حال ہے لیکن مایوسی تو گناہ ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت پہ یقین رکھیں اور دعا کے ساتھ مقدور بھر کوشش بھی کرتی رہیں۔ حالات ضرور بدلیں گے ان شاء اللہ۔

اور یہ تو بتائیں لکھنا کیوں چھوڑ رکھا ہے؟

رقیہ الماس، محوبہ، عشنا ... ای میل (کراچی)

اس بار تو نمرہ احمد بازی لے گئیں۔ بہت عرصے بعد کوئی اچھی تحریر پڑھنے کو ملی۔ رخسانہ نگار بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اب تو بس ناول کی آخری قسط کا انتظار ہے۔ عفت سحر طاہر نے تو بہت ہی ہنسایا۔ ویل ڈن عفت! آپ ایسے ہی خواتین میں ہر ماہ ایک مزاحیہ تحریر ضرور شامل ہونا چاہیے۔ نایاب جیلانی کی کہانی میں مزہ نہیں آیا اور نیم آمنہ کی کہانی بالکل اچھی نہیں لگی۔ ہیروئن کو پہلے برا اور آخر میں عظیم بنا دیا کیونکہ وہ ہیروئین تھی۔ افسانے سارے اچھے لگے۔ انٹرویو، شاعری اور تمام سلسلے ہی اچھے تھے۔

ج: رقیہ، الماس، محوبہ، عشنا! یاد آوری کا شکریہ۔

عفت سحر طاہر اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ مزاح ہمیں بھی بہت پسند ہے لیکن مزاح لکھنا آسان نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ افسانہ نگار، ناول نگار تو بہت ہیں لیکن مزاح نگاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

نیم آمنہ کی ہیروئین بری لڑکی نہیں تھی اس کے باپ پر جو کچھ گزری اس کی وجہ سے اسے اپنے باپ کے رشتے داروں پر بہت غصہ تھا۔ وہ ان سے بدلہ لینا چاہتی تھی لیکن فیضان اس کے دل میں جگہ بنا چکا تھا اس لیے اس کی بربادی وہ برداشت نہ کر سکی اور اس کو اتنی وبال سے نکالنے کی کوشش کی۔

مسز عامر نور ... حیدرآباد

[illegible] بہت [illegible] ستمبر جا رہی ہے۔ زبردست۔ نمرہ احمد کی "مصحف" میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اس کی تعریف کے لیے۔ عفت سحر پاشا کا "دھنک کے رنگ" "بے ساختہ قہقہے" لگانے پر مجبور کر گیا۔ نیم آمنہ کا مکمل ناول "کوچ" میں فیضان شاہ کے زوال والے قصے کو واضح نہیں کیا گیا باقی اچھی تھی۔ مجھے آپ سے ریکویسٹ کرنی ہے کہ "میری خاموشی کو بیاں ملے" اس سلسلے کو بھی مستقل کر دیں۔

ج: مسز عامر! آپ نے اپنا نام کیوں نہیں لکھا، نام تو انسان کی شناخت ہوتی ہے۔ شادی کے بعد آپ کے شوہر کا نام آپ کے نام کے ساتھ جڑ جاتا ہے لیکن آپ کی اپنی شناخت اپنا نام تو باقی رہنا چاہیے۔

میری خاموشی کو بیاں ملے سلسلہ بند نہیں کیا گیا ہے۔ بس صفحات کی کمی کی وجہ سے کبھی کبھی شامل نہیں کر پاتے۔

کرن شاہ ... شجاع آباد

میری آنی 20 سال سے یہ رسالہ پڑھ رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں پہلے کی رائٹرز بہت اچھا لکھتی تھیں۔ اب پہلے جیسا معیار نہیں رہا۔ اس ماہ کا ناول بالکل اچھا لگا۔ راشدہ رفعت کا افسانہ پڑھ کر اچھا لگا۔ بالکل حقیقت کے قریب تر۔ دھنک کے رنگ، عفت نے تو اب روحا کی شادی کروا دی ہیں اور اسے کھانا بنانا بھی سکھا دیں تاکہ جو خواب "حماقت" ہو جائے۔ اس ماہ کی سب سے بہترین اسٹوری "مصحف" نمرہ کی زبردست، مکمل نام پہلی بار سنا ہے مگر ہے اچھا۔

ج: پیاری کرن! گزرا ہوا زمانہ ہمیشہ دلکش نظر آتا ہے کیونکہ وہ لوٹ کر نہیں آسکتا۔ آپ کی آنی اگر اب بیس سال پہلے کی کہانیاں پڑھیں گی تو ان کو یقیناً احساس ہوگا کہ کہانیوں کا معیار آج بھی کم و بیش وہی ہے بلکہ ہماری کچھ نئی رائٹرز تو بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اور انہوں نے بہت سے ایسے موضوعات پر بھی لکھا ہے جن پر پہلے نہیں لکھا گیا۔

مدیحہ بٹ ... ای میل (سیالکوٹ)

مارچ کا پورا شمارہ زبردست تھا۔ فہرست میں عفت سحر کا [illegible] دیکھ کر [illegible]۔ نمرہ احمد کا ناول "مصحف" بہت زبردست ہے۔ نایاب جیلانی کے [illegible] بہت اچھا لگا۔ نیم آمنہ کا ناول "کوچ" بھی اچھا تھا۔ بشریٰ سعید کا ناول "سنگ گر" شروع میں تو بہت اچھا ہو رہا تھا اب اس کی الجھن سلجھ رہی ہے تو اب اس میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ رفعت ناہید کا "چراغ آخر شب" بے شک ایک اچھا ناول ہے۔ اس بار سب سے اچھا افسانہ شبینہ عفت گل کا تھا۔ باقی افسانے بھی پسند آئے۔

ج: پیاری مدیحہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

فرحت منصور ... کراچی

میں آپ کے ڈائجسٹ کی گزشتہ پندرہ سال سے قاری ہوں۔ جب میں مڈل کی طالبہ تھی۔ الحمدللہ آج اپنی ازدواجی زندگی کے بھی سات سال پورے کر چکی ہوں۔

مجھے آپ کے رسالے سے پیار ہی نہیں بلکہ عشق ہے۔ کچھ گھریلو اور کچھ درس و تدریس کی مصروفیات اور شاید کچھ جھجک بھی کہ پتہ نہیں خط شائع بھی ہوگا یا نہیں۔ خط نہ لکھ سکی۔

میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس رسالے کی وجہ سے میری زندگی میں کتنی مثبت تبدیلی آئی ہے۔ وہ رائٹرز جو واقعی اپنی جادوئی تحریروں کے ذریعے پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہیں۔ ان کا کردار بھی بلاشبہ قابل تحسین ہے۔

"محبت خواب سفر" کی آخری قسط کا پڑھ کر خوشی ہوئی مگر اس کے ساتھ ساتھ بچھڑنے کا غم بھی۔ کیونکہ مجھے شمارے کا زیادہ انتظار اس ناول کی وجہ سے ہوتا تھا۔

رفعت ناہید جس طرح [illegible] کرداروں کو [illegible] جذبات اور [illegible] کو بیان کرتی ہیں [illegible] مصنفین ایسا کرتی ہیں وہ تو واقعی لفظوں کی جادوگر ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کا ناول [illegible] نہیں ابھار رہا ہو گا [illegible] عموماً "اس ڈائجسٹ کے دیگر سلسلے وار ناول" [illegible] نمرہ احمد کا مکمل ناول "مصحف" واقعی شاندار تحریر

سانحہ ارتحال

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے انتہائی اہم کارکن شبیر احمد مختصر علالت کے بعد اس دارفانی کو الوداع کہہ گئے

اناللہ وانا الیہ راجعون

شبیر صاحب گزشتہ بیس سال سے ادارہ سے وابستہ تھے نہایت محنتی اور دیانت دار تھے وہ اپنے فرائض بڑی ذمہ داری سے انجام دیتے تھے۔ ان کے خلوص اور محبت کی وجہ سے ادارہ کے سب ہی افراد کے دلوں میں ان کا خاص مقام تھا۔ ان کی وفات ہم سب کے لیے بڑا سانحہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے اہل و عیال کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

ج: پیاری اسماء! آپ نے لکھا ہے کہ تنقید کی ہے اس لیے آپ کا خط شائع نہیں ہوگا۔ اپنا خط اس کالم میں دیکھ کر آپ کی غلط فہمی رفع ہو گئی ہوگی۔ تعریفی اور تنقیدی خطوط ہمارے لیے یکساں اہمیت رکھتے ہیں اور ہم اس کالم میں تعریفی ہی نہیں تنقیدی خطوط بھی شائع کرتے ہیں۔ البتہ اگر کسی رائٹر کے لیے بہت زیادہ سخت الفاظ استعمال کیے جائیں تو وہ بے شک شائع نہیں کرتے تنقید کا مطلب اصلاح ہونا چاہیے نہ کہ دل آزاری۔ رائٹر کو اس کی خامیوں سے آگاہ ضرور کرنا چاہیے لیکن اس کی حوصلہ افزائی بھی ضروری ہے۔

ٹی وی کے معاملات کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارا شعبہ نہیں ہے۔ البتہ آپ کا پیغام مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

حمیرا رضا۔۔۔ لاہور

میں آپ کی توجہ اردو زبان کی دگرگوں حالت کی جانب مبذول کرانا چاہتی ہوں۔ میرے علم میں ہے کہ اس ادارے کو چلانے والے اعلا ذہن اور قابلیت کے مالک ہیں۔ مگر ہائے افسوس الیکٹرانک میڈیا میں استعمال ہونے والی غلط اردو اب اخبارات و رسائل حتیٰ کہ درسی کتب کا حصہ بھی بن رہی ہے۔ میری والدہ چالیس سال سے درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہی ہیں وہ بھی اردو کی اس وقت موت سے خوف زدہ ہیں کیا آپ جانتی ہیں کہ لفظ کے لیے اب ہماری گفتگو سے تقریباً ناپید ہو گیا ہے۔ مثال بیٹا کھانا کھانے کو باہر آجاؤ۔ درست جملہ بیٹا کھانا کھانے کے لیے باہر آجاؤ۔"

کیا یہ شدید قسم کا احساس کمتری نہیں جو ہم جانتے بوجھتے کسی اور کی زبان کو اپنانے کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں۔ کئی مذکر جملے بلاوجہ مونث بنا دیے گئے اور مونث جملوں کو مذکر میں بدل دیا گیا۔

ساتھ ہی نایاب جیلانی کی تحریر "کچھ دن لگیں گے" پر بھی بات کرلوں آپ کا انداز تحریر بے حد اچھا ہے گرفت میں لینے کی صلاحیت رکھتا ہے پر اس بار آپ یقیناً "کچھ کنفیوز تھیں۔ کہانی کی ابتدا میں ہمیں لگا کہ ہم پشتو بیک گراؤنڈ کی کہانی پڑھ رہے ہیں تو آگے چل کر احساس ہوا کہ یہ پنجابی بیک گراؤنڈ ہے۔ کہیں لفظ پتر تو کہیں [illegible] تھے اگر کسی ایک بیک گراؤنڈ پر کہانی جمی رہتی تو کیا بات تھی۔ یہاں مسئلہ یہ ہے کہ خلیل خان کے والد محترم نے خلیل خان کو نگین سے منسوب کیا۔ خود ہی خیبر خان کے ساتھ بیاہ دیا تو خلیل خان خاموش کیوں رہا اور خیبر خان نے بھائی کی منگیتر کو ہی کیوں پسند کیا جبکہ وہ جانتا تھا کہ بچپن ہی سے وہ ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ امید ہے کہ نایاب بخش جواب دیں گی اور آخر میں ایک بار پھر التجا ہے کہ وہ الفاظ جو کہ ہماری زبان کے نہیں ہیں انہیں رسالے میں شامل نہ کیا جائے جبکہ ان کا نعم البدل بھی ہمارے پاس ہو۔ ایسی صورت میں ہرگز ہرگز نہیں مثال رسوئی درست لفظ "باورچی خانہ" "آتما" درست لفظ "بے صبرا" میں نے اردو کے بہت سے اساتذہ سے اس کی بدلتی حالت پر بات کی اور ساتھ ہی بہت سے الفاظ اور جملے بھی دکھائے جنہیں نہ جانے کس نے تبدیل کروایا اور کیوں؟ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک لفظ "ناراضگی" اور "ادائیگی" "موجودگی" ہوا کرتے تھے اب یہ ناراضی، ادائی اور موجودی سے بدل گئی ہیں آخر ان کا ذمہ دار کون ہے ہمیں درست راہ کون دکھائے گا۔

ج: پیاری حمیرا! اردو زبان کے بارے میں آپ کا اعتراض بجا ہے۔ اس سلسلے میں ہم خود بے حد محتاط رہتے ہیں ناراضی، ادائی جیسے لفظوں میں جو تبدیلی آئی ہے۔ وہ ماہرین اردو زبان کی تحقیق کا نتیجہ ہے انہوں نے سالوں کی محنت سے فرہنگ آصفیہ ترتیب دی ہے اور ان تمام لفظوں کی اصلاح کی ہے جنہیں غلط العام کہا جاتا ہے۔

نایاب جیلانی کے بارے میں آپ کے اعتراض کے جواب میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ۔

دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔

یہ تو پھر افسانہ تھا۔ اگر غور کریں تو اپنے ارد گرد ایسی بہت سی حقیقتیں دیکھیں گی جن کا کوئی جواز نہیں دیا جاسکتا۔

اداکار، پروڈیوسر

ہمایوں سعید اور ثمینہ سعید سے ملاقات

شاہین رشید

یہ حقیقت ہے کہ شوہر اور بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ گاڑی تب ہی صحیح چلتی ہے جب دونوں پہیے متوازن ہوں۔

لڑکے جب تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں تو پھر ان کی جدوجہد کا دور شروع ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ان کو اسٹیبلش ہونے میں وقت لگتا ہے۔ ایسے میں شادی ہو جائے تو اور بھی مشکلات جنم لیتی ہیں۔ لیکن اگر بیوی سمجھ دار ہو اور پڑھی لکھی بھی تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر گھر کے حالات کو بدل دیتی ہے۔ ہمایوں سعید اور ثمینہ سعید ایک کامیاب جوڑا ہے۔ شادی کے بعد ہمایوں سعید نے نہ صرف اداکاری میں نام کمایا بلکہ پروڈکشن میں بھی اور ثمینہ ہمایوں سعید نے بھی پروڈکشن میں اپنی پہچان کروائی۔

ثمینہ ہمایوں سعید پروڈکشن کے سلسلے میں بہت مصروف رہتی ہیں اور ہمایوں سعید صاحب بھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

ثمینہ ہمایوں سعید

"کیسی ہیں؟ بہت شکریہ کہ آپ نے ٹائم دیا اور یہ بتائیں کہ آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اور مصروفیات پروڈکشن کی ہی ہیں۔ اپنے پروڈکشن ہاؤس Sixsigma کے تحت ہم پانچ ڈرامے بنا چکے ہیں۔ ماشاء اللہ سے۔"

"آپ کو اس فیلڈ میں کتنے سال ہو گئے اور اداکاری کی طرف رجحان نہیں ہوا؟"

"ماشاء اللہ پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ شادی کو سولہ سال اور پروڈکشن میں آئے ہوئے 15 سال ہو جائیں گے اور جہاں تک اداکاری کی بات ہے تو مجھے شوق

کھانا بنے ملے تو؟"
"میں ماشاءاللہ گھر یلو امور میں ماہر ہوں۔ ہر کام کر لیتی ہوں۔ کھانا پکانا مجھے آتا ہے لیکن میں خود نہیں پکاتی ہم نے کک رکھا ہوا ہے اور میں تو صبح سو کر ہی بارہ ساڑھے بارہ بجے اٹھتی ہوں۔ اور ہمایوں کھانے کے معاملے میں چوزی نہیں ہے جو سامنے رکھ دو کھا لیتا ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ جو میرا دل کرتا ہے میں کھا لیتی ہوں۔"
"ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں اور کیا ہنی مون منانا بہت ضروری ہوتا ہے؟"
"ہنی مون کے لیے ہم ماریشس گئے تھے۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ یہ ضروری ہے۔ لوگوں نے بس خوامخواہ یہ روایت بنا لی ہے کہ ہنی مون ہونا چاہیے۔"
"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور رومانٹک کون ہے آپ یا ہمایوں؟"
"منہ دکھائی میں ہمایوں نے مجھے ہیرے کی انگوٹھی دی تھی اور میں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے کیونکہ یہ میرے لیے بہت اہم ہے اور ہمایوں بہت رومینٹک ہیں۔"
"ڈرامے دیکھ کر بھی لگتا ہے کہ ہمایوں بہت رومینٹک ہیں۔ ڈراموں میں جب یہ لو سین کرتے ہیں تو آپ کو برا لگتا ہے؟"
"پہلے بہت برا لگتا تھا مگر اب نہیں کیونکہ اب تو ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ اب ماشاءاللہ کافی عرصہ ہو گیا ہے اس فیلڈ میں اور پتہ ہے کہ یہ ڈراما ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں شروع کے ایک سال بہت محسوس ہوتا تھا۔"
"ہمایوں سعید صاحب کی کوئی اچھی اور بری عادت بتایئے؟"
"ہمایوں کی بری عادت یہ ہے کہ وہ جھگڑالو بہت ہے اور اچھی عادت یہ ہے کہ کسی بات کی روک ٹوک نہیں کرتے۔"
"ایک سوال شوبز کے لوگوں سے میں ضرور پوچھتی ہوں کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے اگر خدانخواستہ ہمایوں سعید نے دوسری شادی کی تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟"
"ہر عورت کا کیا ردعمل ہوتا ہے وہی میرا بھی ہوگا۔ میں چھوڑوں گی ہمایوں کو۔"
"گھر کو چلانے سنوارنے میں کون زیادہ دلچسپی لیتا ہے آپ یا وہ؟"
"میں ہی دلچسپی لیتی ہوں، مجھے شوق ہے۔ ہمایوں کو تو کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ ان چیزوں کی ٹینشن وہ نہیں لیتے۔ نوکر کیا کر رہے ہیں، کیا نہیں کر رہے۔ کس کو میں نے رکھا کس کو نکالا کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ان چیزوں میں پڑتا ہی نہیں ہے۔ یہ سب میری ذمہ داری ہے۔"
"شادی کے فائدے ہیں یا نقصانات؟ اور لڑکی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟"
"شادی کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی لیکن میری نظر میں فائدے زیادہ ہیں اور لڑکی کا خوب صورت ہونا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ اگر شکل اچھی ہے لیکن اس کی نیچر اچھی نہیں ہے، اس کی سوچ اچھی نہیں ہے تو کیا شکل کا "اچار" ڈالنا ہے۔"
"ثمینہ! آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ اب چلتے چلتے کوئی ایسی بات جو آپ ہمایوں صاحب سے کہنا چاہتی ہوں مگر ان کے سامنے نہیں کہہ سکتیں؟"
"لکھ دیں کہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔"
"I Love you"

ہمایوں سعید

ہمایوں سعید 27 جولائی 1971ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے پانچ بھائی ہیں اور ان کا نمبر پہلا ہے۔ 1995ء میں شوبز کی فیلڈ میں قدم رکھا۔ پہلا ڈراما "زہر" تھا۔ اس کے بعد سے یہ مسلسل چھوٹی اسکرین پہ کام کر رہے ہیں۔
"کیسے ہیں ہمایوں سعید صاحب! اس فیلڈ میں کیسے آئے؟"
"اس فیلڈ میں اتنی آسانی سے نہیں آیا۔ ہم لوگ بیلا روڈ سینما کے قریب رہتے تھے۔ وہاں پر جاوید شیخ اور دیگر فنکار بھی رہا کرتے تھے۔ میں خوش شکل تھا تو میرے دوست مجھے "ہیرو" کہہ کر بلایا کرتے تھے اور میرے دوستوں کی ہی خواہش تھی کہ میں ٹی وی ڈراموں میں کام کروں۔ پہلا چانس مجھے تسلیم اسلم نے ڈراما "یہ جہاں" میں بک کر کے دیا۔ پھر "زہر" کیا اور الحمدللہ پھر سلسلہ چل پڑا۔"
"ثمینہ صاحبہ سے آپ کی ملاقات کہاں ہوئی، شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے اور بچے کتنے ہیں؟"
"میری ان سے پہلی ملاقات ان ہی کے گھر میں ہوئی۔ میری امی اور ثمینہ کی امی آپس میں بہت اچھی دوست ہیں اور ملاقات بھی کچھ اس انداز میں ہوئی کہ میں ایک ڈرامے کی شوٹنگ ان کے گھر پر کرنا چاہتا تھا اور بس وہی پہلی ملاقات تھی جو دوستی میں بدلی اور دوستی سے شادی میں۔ میری شادی 1996ء میں ہوئی اور بچے نہیں ہیں ہمارے۔"
"ازدواجی زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"
"الحمدللہ بہت اچھی، بہت خوشگوار گزر رہی ہے۔"
"1996ء میں آپ کی شادی ہوئی۔ 1995ء میں آپ اس فیلڈ میں آ گئے۔ نیا نیا کام تھا، نئی نئی جدوجہد، مشکل تو ہوئی ہوگی؟"
"ایسا نہیں تھا کہ شوبز ہی سے میرا گزارا ہوتا تھا۔ میں نے جاب بھی کی۔ بے شک وہ میری جدوجہد کا زمانہ تھا اور جدوجہد سے ہی انسان آگے بڑھتا ہے۔ جب میری شادی ہوئی تو میں مالی طور پر تھوڑا کمزور تھا اور ثمینہ بزنس فیملی سے تعلق رکھتی تھی یعنی مالی طور پر مستحکم تھیں۔"
"تو ایک خوددار لڑکے کی طرح ثمینہ کی ذمہ داری آپ نے خود اٹھائی کیا؟"
"بالکل جی۔ میں نے خود اٹھائی اور اسے اپنی بیوی بنا کر اس فلیٹ میں لایا جس کا کرایہ صرف پانچ ہزار تھا اور ہم نے پانچ سال اس فلیٹ میں گزارے اور آج اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر نعمت سے نوازا ہوا ہے۔ انسان جب محنت کرتا ہے تو سب کچھ پالیتا ہے۔"
"اب آپ دونوں پروڈکشن میں ہیں، جب صرف آپ اس فیلڈ میں تھے تو گھر میں تنگی ہوتی تھی اس فیلڈ کے حوالے سے؟"
"بالکل تنگی ہوتی تھی اور شاید ہر گھر میں ہوتی ہوگی لیکن جب بیویاں اس فیلڈ کو سمجھ لیتی ہیں تو شک کی دیواریں خود بخود گر جاتی ہیں۔ ثمینہ کی خواہش تھی کہ میں اداکاری کو چھوڑ کر صرف پروڈکشن کروں لیکن اداکاری میرا شوق تھا اور میں نے یہ ثابت کیا کہ مجھے صرف ثمینہ سے پیار ہے۔ ثمینہ بھی اس فیلڈ سے ہے اور اس کو اچھی طرح سمجھ بھی گئی ہے اس لیے ہمارے درمیان اس فیلڈ کے حوالے سے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔"
"ثمینہ بتا رہی تھیں کہ آپ کو غصہ نہیں آتا جبکہ وہ خود غصے کی تیز ہیں؟"
"جی ہاں، مجھے غصہ بہت کم آتا ہے اور ثمینہ تھوڑی تیز ہیں اور تیز ہونا پڑتا ہے تاکہ گھر کا نظام ٹھیک طرح سے چلتا رہے۔ گھر کے نوکر چاکر پہ ثمینہ کا ہی رعب چلتا ہے۔ اس نے سب کو قابو میں رکھا ہوا ہے۔"
"آپ کے گھر والوں میں ثمینہ [illegible] بتاتی ہیں؟ اور کیا وہ سگھڑ خاتون ہیں؟"
"ثمینہ نے نہ صرف اپنی پروڈکشن کو سنبھالا ہوا ہے بلکہ میرا بھی بہت سا کام وہ کرتی ہے۔ اور آپ دیکھ لیں کہ پروڈکشن میں آج وہ مجھ سے زیادہ مقبول ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ثمینہ ایک سگھڑ خاتون ہے اسے سب کچھ مینج کرنا آتا ہے۔"
"کبھی دل میں خیال آتا تھا کہ سسرال سے کچھ ڈیمانڈ کروں، جب آپ جدوجہد کے دور سے گزر رہے تھے؟"
"نہیں مجھے ایسا خیال کبھی نہیں آیا اور نہ ہی میں ایسا کچھ سوچ سکتا تھا۔ میں نے بہت خودداری سے زندگی گزاری اور گزار رہا ہوں۔"
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اجازت چاہی۔

رفعت ناہید سجاد

چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی تجربے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمے ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ بیٹی کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود مستقل نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور باپ کے اعتماد نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی فرمز اور [illegible] کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے۔ وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔
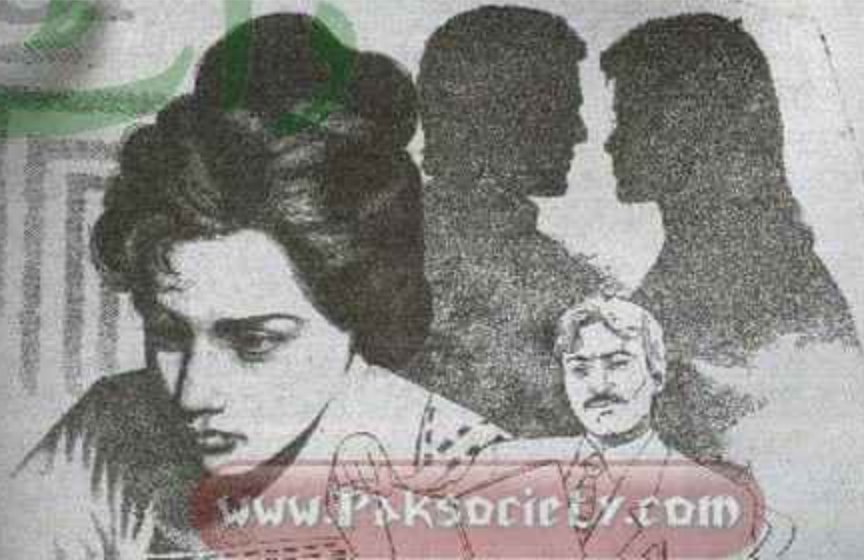
عبیر واپس جوئی۔ سن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے جو صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اصرار کے ساتھ بدستور رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور شوہر کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے میرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے۔ جہاں ان دونوں کی والدہ آپا اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کر دیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف ایسا فیزبل ہو جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کرنل شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ ابھارتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

19

انیسویں قسط

وہ 8 جولائی 2007ء تھا۔

[illegible] کا زمانہ ختم ہوا۔ اب وہ کلائی پر بندھی گھڑی بھی وقت دیکھنے کے کام میں نہیں آتی [illegible] جاتی۔ وقت اور زمانہ محدود ہو کر ہاتھ میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنے موبائل فون پر درج وقت اور تاریخ پر نظر ڈالی۔ گھنٹے منٹ سیکنڈ کر محدود ہو گئے ہیں۔ وقت جلدی گزر جاتا ہے یا ہم جلدی میں ہیں۔ وقت سے آگے [illegible] گزر جاتے ہیں۔ فضا غم کی لپیٹ میں تھی۔ اس قوم پر بار بار ایسے وقت گزرتے ہیں جب قوم اس صدمے سے گزر کر [illegible] اب ہلاک ہو جائے گی لیکن یہ حادثہ سخت تھا اور جان عزیز۔

جمال صبح سے ہاتھ میں وہ لٹو نما کھلونا لیے اس کی پھرکی گھما رہا تھا۔ صبح جب اسٹور کی صفائی کی جا رہی تھی اور کام والی ماسی ایک بوری میں کوڑا سمیٹ کر لیے جا رہی تھی تو نہ جانے کیسے یہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔

جمال کو یاد نہیں یہ کھلونا اس نے کبھی خریدا ہو اور خریدا بھی ہو تو بچپن کو گزرے ہوئے صدیاں بیت گئی تھیں۔ جب بہن گھر آتی تو اس کے ساتھ اس کے سسرالیوں کے درجن بھر بچے بھی ساتھ آتے۔ ہاں کی عید ہوتی لیکن اس کے لیے بڑی آزمائش کا دن ہوتا تھا۔ ان ہی میں سے کوئی اپنا کھلونا پھینک گیا تھا۔ یہ پلاسٹک کی گھوم [illegible] شکل کی ایک لٹو نما چیز تھی۔ جس میں سستے سے پلاسٹک کے چار مختلف رنگ کے گھوڑے بندھے تھے اور ایک پھرکی تھی۔ جس کو گول گھمانے سے وہ گھوڑے اپنے دائرے میں بھاگتے تھے۔

"حد ہو گئی۔ گھوڑے نہ ہوئے کولہو کا بیل ہو گئے۔" اس نے گراری گھما کر بے زاری سے سوچا۔ جو اس کے [illegible] سے منسلک تھی۔ پلاسٹک کی باہری دیوار پر تیر کا ایک لیٹا ہوا نشان تھا۔ یہاں دراصل ریس ختم ہوتی تھی۔ ایک طرح کا گھوڑی اسٹینڈ تھا۔ جب پھرکی گھومنا بند کرتی تو کوئی نہ کوئی گھوڑا اس تیر کے سامنے کھڑا ملتا تھا۔ جس رنگ کا گھوڑا ہوتا وہ رنگ جیت جاتا۔

حالانکہ گھوڑا نہیں جیتتا، جیتتا وہ ہے۔ جس نے گھوڑے پر بولی لگائی تھی۔ پھرکی کے اگلے چکر تک وہی گھوڑا فاتح رہے گا۔ پھر اس کی جگہ کوئی اور گھوڑا لے گا۔ گھوڑے وہی ہیں۔ بس ان کے رنگ بدل جاتے ہیں۔ وہ اپنی باریاں بھگتاتے ہیں۔ عجیب کھیل، عجیب تر کھلاڑی۔

ٹی وی سے غازی رشید کی تقریر نشر ہو رہی تھی۔ وہ اینکر سے کہہ رہے تھے "شاید یہ میری آخری تقریر ہو۔ آپ اپنے روایتی سوالات بند کر دیں اور مجھے اپنا پیغام پہنچانے دیں۔"

اینکر پرسن کے پاس لکھے ہوئے سوالات درج تھے وہ کیا کہہ رہے تھے اس کو خاص دلچسپی نہیں لگتی تھی۔ ہو سکتا ہے اگلے لمحے کوئی گولی ان کا خاتمہ کر دے اور وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ یہ خبر سب سے پہلے ان کے چینل سے نشر ہوئی تھی۔

"غازی صاحب! یہ بتائیے اندر کتنے لوگ ہیں؟"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کتنی اموات ہوئی ہیں؟"

"کیا اندر ابھی خواتین موجود ہیں؟"

وہ پھر سے التجا کر رہے تھے "مجھے اپنی بات کہنے دیں۔" ان کی آواز ہموار لیکن دکھی تھی۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری جب سیاہ برقعوں اور بانس کی شکل میں اٹھائے قلم اور ڈنڈوں نے مسجد حفصہ کی چھتوں کو گھیر رکھا تھا۔ لوگ پریشان تھے سوال کرتے تھے کہ کچھ کرتے کیوں نہیں۔

پھر انہوں نے سنا وہ کہتا تھا۔

"ہماری طاقت سے مت ٹکراؤ ورنہ کچل دیے جاؤ گے۔"

یہ کون گھوڑا ہے جو کسی کا اسٹینڈ [illegible] ہوتا ہے۔

جو لال مسجد میں ہو رہا تھا وہ ٹھیک تھا یا غلط لیکن جو ہو رہا ہے اس نے قوم کو لرزا کے رکھ دیا تھا۔ ہمارے پاس کارخانے تو تھے نہیں کہ ہم اپنا مال باہر کی منڈیوں میں فروخت کرتے۔ ہمارے پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔ [illegible] کرتے۔ اپنا حق مانگتے [illegible] تنگ آئے لوگوں کا ہجوم مگر ایک مجزوہ جامد سناٹا۔

سو ہم نے انسانوں کی منڈی لگادی۔ مصر کا بازار تھا اور یوسف قافلے سے بچھڑا ہوا فروخت تھا۔ انسان بیچ کر پیسہ کمانا عزیزوں کے عہد کے بعد پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

لوگ بکاؤ مال تھے۔ قوم فروخت کر دی گئی اور چہ ارزاں فروختند۔

اتنے بڑے کاروبار کے بعد پارلیمنٹ نے اس کو دوبارہ صدر منتخب کر لیا اور وہ اسی جاہ و جلال اور فرعونیت سے خدائی حکم صادر کرتا رہا۔ قوموں کی تاریخ میں دس بیس سال بس لمحے ہی ہوتے ہیں۔

1999ء کی ایک اجلی شام میں جب راولپنڈی کے تنگ بازاروں میں گھومتے اپنی موٹر سائیکل کے لیے کسی پرزے کی تلاش میں بالو محلے سے ہوتا کسی کے کہنے پر راولپنڈی کے تنگ ترین بازار میں داخل ہوا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس مختصر سے چوک میں ہر طرف کھلنے والی گلیوں میں اپنا موٹر سائیکل لے کر کیسے داخل ہوا اور داخل ہو تو موٹر سائیکل کہاں چھوڑ جائے۔ چوک سے گزرنے والے تنگ راستے زیادہ تر زنانہ بازاروں میں کھلتے تھے۔ وہیں میں ایک وزیر کی اپنے قد سے بلند ایک رہائشی عمارت سی تھی۔ جو اپنے رنگ کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی۔ یہاں سے تین کلومیٹر دور اسی کی ہم نام ایک مسجد جو ابھی تنازع نہیں بنی تھی۔ گو مسجدیں ہمیشہ تنازعوں

کما باعث رہی ہیں۔ مختلف فرقوں کے لوگ کسی دوسرے فرقے کی مسجد کو عبادت گاہ ہی نہیں سمجھتے۔

بندوقیں کندھوں پر تانے وزیر کے گھر کی پہرے داری کرتے پولیس کے عملے کے لوگوں نے اس کی موٹر بائیک پارک کرنے کی نیت بھانپتے اسے ٹوکا تھا۔

"یہاں گاڑی پارک نہیں کرسکتے۔ کہیں اور جائیں۔"

"اتنی گاڑیاں تو کھڑی ہیں گھر کے نیچے۔"

"وہ منسٹر صاحب کے مہمانوں کی گاڑیاں ہیں۔ آپ کی یہاں پارک نہیں ہو سکتی۔"

"اب سڑک پر بھی آپ کا راج ہے۔" اس کے دوست نے جھنجلا کر پوچھا تھا۔

"ہاں سڑک پر بھی ہمارا راج ہے۔" عملے پر مشتمل ساتھیوں کا اطمینان قابل رشک تھا۔

"چلو پھر ٹھیک ہے۔" اس نے موٹر سائیکل نکالتے کہا۔ "آج ہو کل نہیں رہو گے۔"

جب ڈھائی گھنٹہ وہ بازاروں میں خوار ہونے کے بعد باہر نکلے اور موٹر سائیکل پر کک مار کر مری روڈ پر آئے تو شہر کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ یونی فارم میں ملبوس جیپوں پر سوار وردی پوش، بندوقیں لیے سڑکوں پر اس تیزی سے بھاگ رہے تھے جیسے سڑکیں کسی اچانک آپڑنے والی رفتار سے دوچار ہو چکی ہوں۔ چلاتے ہوئے Hooters برق رفتار جیپیں جیسے کسی کو کچل کر نکل جانے کی پروا نہیں کریں گی۔ لوگ دہشت زدہ ہو گئے اور شاید کچھ مقصد بھی تھا۔ وہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتے تھے۔ ہو گیا ہے؟ لیکن کسی کے علم میں نہیں تھا کیا ہوا۔ لوگوں کو آگاہ رکھنا بھی کوئی ضروری عمل نہیں رہا۔

اس نے ٹی وی لگانے کی کوشش کی۔ ڈش بند تھی اور سرکاری ٹی وی صرف شٹ ڈاؤن کر رہا تھا۔ F.M نشریات روک دی گئی تھیں۔ اس نے ریڈیو کی ناب جگہ جگہ گھمائی لیکن ہر طرف ایک جامد چپ تھی۔

اچانک افواہیں اڑنا شروع ہوئیں اور مختلف ملکوں کے ریڈیو بتانے لگے۔ ہمارے ملک میں [illegible] جاپان کے [illegible] ہو گیا ہے۔ [illegible] جشن [illegible] لگے ہیں۔ اور [illegible] پاکستان سے پیغام [illegible] شروع ہو گئے ہیں۔ پی ٹی وی پر فوج کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ایئر پورٹ فوج کے ہاتھ میں ہے۔ اسمبلی توڑ دی گئی۔ حکومتیں ختم ہو گئیں۔ آئین عارضی طور پر معطل ہے۔ ایمرجنسی کا نفاذ ہو گیا ہے۔

وہ انگلیوں پر گننے بیٹھ گیا۔ یہ خبر اس ملک کے ریڈیو سے کتنی مرتبہ نشر ہو چکی ہے۔ اب تو ریڈیو کو بھی زبانی یاد ہو گئی ہوگی' یہ 1958ء ہے۔ اسمبلی ٹوٹ گئی۔ آئین منسوخ ہو گیا۔ ملک میں مارشل لا لگ گیا ہے۔ ایوب خان کے پاس اقتدار از خود آگیا ہے۔

یہ 1968ء ہے۔ اسمبلی ٹوٹ گئی۔ فوج نے ایوان پر قبضہ کرلیا۔ مارشل لا ہے۔ اب یحییٰ خان قابض ہیں۔ ایوب خان کو باہر پھینک دیا گیا ہے۔

اب 1971ء ہے۔ یحییٰ خان کو باہر پھینک دیا گیا۔ اقتدار بھٹو صاحب کے حوالے کیا گیا ہے۔

یہ 1977ء ہے۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہوا۔ بھٹو صاحب گرفتار ہیں۔ اقتدار جنرل ضیاء کے پاس ہے۔

89ء سے 99ء تک لوگوں نے یہ مانوس سی خبر نہیں سنی جس کے کان عادی ہو چلے تھے۔

ہر مارشل لا کی طرح اس کا استقبال بھی شادیانے بجا کر کیا گیا ہے۔ ملک بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ سرکاری ادارے سکوت میں ہیں۔ اونٹ کسی کروٹ بیٹھ جائے اور فیصلہ ہو جائے کہ کل سے انہیں کس کی قصیدہ

لگیں۔ تین دن تک ملک نے بغیر کسی سربراہ کے گزارے۔

خدائی کرتی ہے کہ وہ اپنے بندوں سے
پھر مشرف صاحب بہ نفس نفیس تاج پہن لیتے ہیں اور تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے خدائی احکامات صادر کرتے ہیں۔ لوگ سمجھ نہیں پاتے وہ آئے کیوں تھے۔ اور منتظر ہیں کہ پھانسی کی باری کس کی آتی ہے۔ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے پر غرّاتی رہ گئیں توڑ پھوڑ کر نئی جماعت بنی۔ اب محمل کھینچنے کی باری ان کی تھی۔

اس گھر کا تالا تو رہیں گے۔ وزیر کو جو تیں گے۔

راجہ کا وزیر کون۔ میں جناب!

قاضی کو بلاؤ۔ جی جناب!

ان دونوں میں چور کون؟

ایک حجاز مقدس دوسرے اپنے محلوں کی طرف نکلے۔ قاضی صاحب ان دونوں میں چور کون کے بجائے بادشاہ وقت کے حق میں فیصلے دینے بیٹھ گئے۔

لوکل گورنمنٹ ریفرنڈم' جوڑ توڑ' لوٹے ایسے موقع پر عموماً حکومتیں ایسے ہی سنبھالی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے فیصلوں سے کئی کترائی۔ تقین سے کیے وعدوں کو بے دھیانی سے فراموش کرائی کہ اچانک دو دیو ہیکل عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔

عذاب جہاں سے آیا جس کی انہیں خبر بھی نہ تھی۔

آدھی رات کو آنے والی ایک کال نے مقصد بدل ڈالے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر کو ان کی اپنی بنائی دنیا سے باہر کیا۔ لوگ چپ رہے۔

ڈاکٹر صاحب گرفتار ہوئے' کوئی نہ بولا۔

چیف جسٹس [illegible] ایمرجنسی مارشل لا لگا۔ سب چپ۔

اور ایک جامد چپ۔

ہو رہا ہے وہ جو ملک کے تدبر پر گھوم رہا ہے۔ کرسی اسٹینڈ پر آ کھڑا ہوتا ہے۔

یہ اگست 2008ء ہے۔

حق مجھ کرایتی آرتی اترواتا رہا۔

کبھی خواہش صرف پانے کا نام ہوتا ہے۔ جب پالیا جائے تو خواہش کی موت ہو جاتی ہے۔ سامنے بند گلی ہے آگے جانے کے رستے نہیں اور پلٹ کر جانے کو کچھ بچا نہیں ہے۔

تب میں نے پہلی دفعہ انہیں دیکھا۔ جب سب نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ لوگ ان کو غیر مرئی چیز سمجھتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا نہیں۔ ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب! میں نے خود دیکھے ہیں۔ جب چلتے ہیں ان کے قدموں کی آواز نہیں ہوتی۔ بس صرف کپڑوں کی سرسراہٹ سی سنائی دیتی ہے۔ اور ایک جھپک۔ ابھی کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن شرمیلے ہیں۔ غور سے دیکھو تو چھپ جاتے ہیں۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں نہیں ہوتے۔

ہم عجیب دیوانے لوگ ہیں۔ صرف کل کو دہرا کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اب میرے اس کل کا کیا کریں گے؟ خوشی صرف کل تھی۔ آج کی خوشی پر کس کا حق ہے؟ یا آنے والی کل میں آج گزری کل بن جائے گی تو ہم اس پر خوش ہو لیں گے۔

پر میں یہ کیا کل کل کر رہی ہوں۔ میری باتیں بے سروپا ہیں نا پاگلوں جیسی۔ نعیم میری بیٹی سے کہتا تھا۔ "جاؤ اس پاگل عورت کے پاس سے۔"

وہ خوف زدہ ہو کر مجھ سے چمٹ جاتی۔ کیونکہ اس کو پاگل کا مطلب نہیں آتا تھا۔

ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔

یاد آیا۔ وہ بہت امیر لوگ تھے لیکن غریب لگتے تھے۔ شروع میں میں سمجھی کنجوس ہوں گے۔ ہوتے ہیں نا ایسے بھی لوگ۔

لیکن وہ اس خوف سے چھپا کر رکھتے تھے کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے خود بڑے بد زبان لوگ تھے۔

انہوں نے میری بہن کے کردار پہ کیچڑ اچھالا میں چپ رہی۔

انہوں نے میرے خاندان پہ … کی تہمت لگائی میں کچھ نہیں بولی۔

انہوں نے میرے ماں باپ کو بددعائیں دیں کوسنے دیے۔ میں نے صبر کر لیا۔ لیکن جب اس نے … گالی دی تو میری برداشت جواب دے گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو وہیں کھڑے پایا جہاں سے میں چلی تھی۔ زیرو پوائنٹ۔

ایکشن۔ سین ون۔

لیکن اسی اثنا میں اسکرپٹ تبدیل ہو گیا۔ اب وہ مجھے محبت کے پیغام نہیں بھیجتا تھا۔ وہ کہتا تھا اگر میں زبان کھولی تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ اور یہ کہ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

کسی بھی دن تم گاڑی کے ٹائروں تلے کتے کے حقیر پلے کی طرح کچلی جاؤ گی اور چیاؤں بھی نہیں کر سکو گی۔

کسی بھی دن وہ مجھے اٹھا کر لے جائیں گے اور میرے گھر والوں کو میرے گوشت کے ننھے ننھے ریزے ملیں گے۔ اتنے چھوٹے کہ مجھے دفن کرنے سے پہلے ان کو میری لاش کو رفو کرنا پڑے گا۔

اس نے مجھے بتایا اس نے میرے پیچھے لوگ لگا رکھے ہیں جو میرے پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔

ابھی ابھی میں نے کھڑکی میں سایہ دیکھا۔ میں ذرا دیر کو اپنی جگہ بدل لوں۔

ہاں یہ والی جگہ ٹھیک ہے۔ میں نے سم تبدیل کی۔ موبائل بدلا۔ نمبر بدلے۔ لیکن اس کی رسائی دور دور تک ہے۔ اس تک ہر نمبر پہنچ جاتا ہے اس لیے کہ وہ انسان نہیں ہے۔ بھتنا ہے۔ بھولا ہے "سایا ہے۔"

اسی لیے تو میں آپ سے کہتی ہوں۔ میں نے بھوت دیکھے ہیں۔

میں کمرے سے نکلتی تو میرا تعاقب کیا جاتا تھا۔ میں نے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔

باہر کمرے میں آ کر بیٹھتی ہوں تو وہ سامنے والی دیوار سے ایڑیاں اچک اچک کے مجھے دیکھتا رہتا ہے۔

ہاں مجھے پتا ہے دیوار بہت اونچی ہے۔ کسی انسان کا اس سے جھانکنا آسان نہیں مگر وہ کون سا انسان ہے۔

کل جب جمال بتا رہا تھا کہ اسے قید کر لیا گیا ہے۔ وہ پولیس کی گرفت میں ہے تو وہ شاید نہیں جانتا کہ اس کو دیواریں قید نہیں کر سکتیں۔ وہ وہاں سے بھی نکل آئے گا۔ کیونکہ وہ ہماری آپ کی طرح انسان نہیں۔

وہ جن ہے۔ ظالم ہے۔ خوفناک۔ خون آشام ہے۔

قید وہ نہیں ہوا میں ہوں جس نے مجھے اندر کر کے کنڈی لگا دی ہے۔

مجھے ڈر لگتا ہے ڈاکٹر صاحب! خوف آتا ہے۔

کوئی مجھے بچاؤ۔ میری مدد کو کوئی ہے؟ نہیں ہے!

✡ ✡ ✡

یہ پہلی دوسری دفعہ نہیں تھا کہ پروین دسایا صاحبہ کے احکامات کے موجب فائل اس کے کمرے میں لائی۔ اور فائل تھما کر چلے جانے کے بجائے کھڑی اس کو گھورتی رہی۔ عبیر کو ان آنکھوں سے ڈر آتا تھا۔ پہلے دن سے اس کو یہ آنکھیں خوف زدہ کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ کمرے سے چلے جانے کا ارادہ یکسر منسوخ کر کے سامنے اسٹول پر بیٹھ رہتی۔ ایسے وقت میں اس کے لیے کام میں دھیان لگانا مشکل ہو جاتا۔ وہ چوکیدار نظریں اس کا احاطہ کیے رکھتیں۔ کتنی دفعہ کمپیوٹر سے سر اٹھا کر لمحہ بھر وہ ان بے روح آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتی ایک مدہم دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہ شاید ان آنکھوں کی بے رنگی لمحوں کے لیے سہی پر زائل تو ہو۔ کبھی وہ بے تاثر آنکھیں ویسے ہی بے معنی لفظ لیے یونہی اس کو گھورتی رہتیں۔

آج بھی اس نے … ویسا ہی پایا تھا۔

اب اوروں کی دیکھا دیکھی وہ خود اس کو … لگی تھی۔ حالانکہ پہلے دن اس کا خیال تھا … یہ بات نہایت تضحیک آمیز ہے لیکن شاید وہ اس قدر غریب نہیں تھا جتنا غریب طبیعت تھا۔

اس نے بتایا تھا یہ پروین دسایا ہے۔ اگر کسی نے اس کی دل آزاری کی تو ہم سب کی دل آزاری ہو گی۔ یوں کسی نے آپ کا دل دکھایا تو بس ہم سب کو صدمہ ہو گا۔ لیکن اس بچی کا معاملہ خاص ہے۔

اور اس نے مزید بتایا۔ فائل کو دھیان سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ اہم ہوتا ہے۔ لفظ کی معمولی بے حرمتی اداروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ وہ ہر روز اپنی پٹاری سے ایک نصیحت نکال کر اس کے سامنے لا رکھتی۔

سو اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جو پروین دسایا لائی تھی۔ اور اب سامنے بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔ دونوں میں سے کسی کی دل آزاری کا حق اسے حاصل نہیں تھا۔ لیکن جب تک وہ اسے گھورتی رہے گی۔ فائل میں لکھے لفظوں کی بے حرمتی ہوتی رہے گی اور اگر وہ اس کو وہاں سے چلے جانے کو کہہ دے تو دل آزاری کا نیا باب کھلتا ہے۔

اس نے فائل میں [illegible] لگا کر داخل دفتر کر دی۔

ٹی بریک ہو گئی ہے۔ لیکن کیا مجھے ایک پیالی چائے مل سکتی ہے؟؟

وہ روبوٹ کی طرح اٹھی اور باہر نکل گئی۔ آرڈر کی نفی کرنا اس کی تربیت کا خاصا نہیں تھا۔ ابھی تو اسے یہ بھی

پتہ نہیں چلا سکتی ہے کہ نہیں مل سکتی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ وہ کام پر توجہ مرکوز کر سکتی تھی۔
چائے کی پیالی تھماتے اس نے لمحہ بھر کو اس پر نگاہ اٹھائی۔ یہ ٹی بنائی جائے گی۔ کتنا دودھ۔ کتنی چینی۔ ہر ہر چیز
بالائشہ اس سب کے اختیارات بطور منتظم باورچی خانہ تھی پروین وسایا محفوظ ہے اس نے ایک گھونٹ بھر
غنیمت ہوا اس نے اسے گرتی چائے کے استحقاق سے محروم ہی رکھا تھا۔
وہ سر پر سوار تھی۔ جیسے چائے پیالے کا کام ہے کہ وہ پیالی جھپٹے گی اور پی جائے گی۔
"میٹھو پروین۔" "کبھی وہ بھی کرنا پڑتا ہے ہم جس کے برعکس سوچتے ہیں۔"
وہ واپس اسٹول پر جا بیٹھی تھی۔ ٹھوڑی کو ہاتھ کی مٹھی سے سہارا دیے۔ اب اس کی بے رحم نظروں کا نظارہ کرتا
جگمگاتا ماربل کا فرش تھا۔
"کہاں رہتی ہو پروین؟"
"یہیں۔" اس کے کھولے ہوئے وحتی کے دروازے اس نے دھاب سے بند کر دیے۔
"اور جانے سے پہلے سر کو بتا کر جایا کریں۔ کل آپ بتائے بغیر چلی گئی تھیں۔" اس کا لہجہ اکھڑا ہوا ضرور
لیکن شائستگی سے عاری نہیں تھا۔ لہجے کا یہ اکھڑپن کمپنی کے لاڈ پیار کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے یا زندگی کے ایسے تجربے
جن سے اس کی مکمل آگاہی تھی ہی نہیں۔
"کیا یہ سر کا حکم ہے؟"
"نہیں۔ میں خود کہہ رہی ہوں۔" اب کی دفعہ اس کے لہجے میں ہلکا سا تحکم بھی تھا۔ اپنے اختیارات کی
لکیریں واضح کرتے۔
"اس کا مطلب جو بھی سر کے پیغام تم لاتی ہو۔ وہ تم خود کر رہی ہوتی ہو؟"
"آپ نے چائے ختم کر لی تو پیالی اٹھا لوں؟"
عنیزہ کو افسوس ہوا جو کیا۔ وہ کہیں سے چڑ نہیں رہی تھی۔
"ویسے آفس سیٹ کرتا ہوں۔ آتے جاتے سر کو۔ لیکن ان کی فنسل کا ایک مسئلہ ہے۔" اکبر اعظم
میں سے سانپ نکال کر بکھیر رہا تھا۔
"آفس آرڈر آؤٹ لک سے جاتی ہے۔ بینک کی ساری لین دین آن لائن۔ بھر Flash ہے۔ ملٹی میڈیا
کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا ہے۔ لیکن کاغذوں کی تسلی کی جب تک تسلی نہیں ہوتی جب تک وہ دونوں ہاتھوں میں تمام
نہ دیکھ لیں۔ لہٰذا جس قدر data اس کمپیوٹر کے پیٹ میں ہے اسی قدر ان الماریوں میں ٹھونسا ہوا ہے۔ آپ
اطلاع کے لیے عرض ہے جو کچھ لکھیں اس کا پرنٹ آؤٹ نکلوالیں۔
پتہ نہیں یہ جملے سر کے حضور شکوے تھے یا قصیدے۔
بظاہر تو سر دونوں کو ہی نہیں گرداتے تھے۔
"یہ غنیمت ہوا کہ وضاحت ہو گئی۔ ورنہ فائلیں پڑھتے پڑھتے مجھے لگا میں ضرور پی ایچ ڈی کر گزروں گی۔"
"ہمارے صاحب اپنے بزنس کے علاوہ بھی کئی گورکھ دھندوں میں الجھے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے انہوں نے
ایک پبلشنگ ہاؤس بنایا۔ اپنے ایک ساتھ پر کبیل کو جو ان دنوں بیروزگار تھے گمشدہ تحقیقی کتابوں کے ری پرنٹ پر
لگا دیا۔ تب جیسے آپ گمشدہ لوگوں کا data تیار کرتی ہیں۔"
"کتابیں تو آپ نے بازیاب کر لیں۔ کیا ہم گمشدہ لوگوں کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے؟"
"نا ممکن۔ لیکن دس سال بعد۔ بیس سال بعد۔ یہ فائل قانونی دستاویز ضرور ہو گی۔ ہمارے ہاں تاریخ مسخ
کرنے کا رواج عام ہے۔ کیا پتہ کل جو تاریخ لکھی جائے۔ اس میں سر فہرست درج ہو کہ یہ تمام افراد غدار تھے۔

دکاندار جانفشانی سے اسے ساڑھیاں دکھانے میں مصروف تھا۔

امی کبھی فیروزی ساڑھی اٹھا کر دیکھتی تھیں جس کا کام اور نگینے لاجواب تھے اور اس رنگ پر خوب اٹھ رہے تھے اور کبھی جامنی ساڑھی جس کی چائنا سلک انہیں متاثر کر رہی تھی اور ستاروں کے ساتھ ریشم کا کام بھی خوب تھا۔

"باجی! جب دونوں پسند آ رہی ہیں تو دونوں لے لیں پیسے مناسب کر لوں گا۔" دکان دار بولا۔

"بات پیسے کی نہیں ہے، چار ساڑھیاں [illegible] پہلے ہی لے چکی ہوں، بس میں نے پانچ ساڑھیاں [illegible] دینی ہیں۔" امی نے [illegible] کہا۔

"ارے کیا پانچ کیا اور چھ کیا۔ بچی کو اگر پسند ہے تو دونوں لے لو، بیاہ بار بار تھوڑی آتا۔" دکان دار کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک پٹھان لڑکے نے کہا۔

"جو لو مدیحہ! تمہیں کون سی ساڑھی پسند ہے؟" امی نے مجھ سے پوچھا۔

"امی! ساڑھی واڑھی چھوڑیں مجھے یہ پیلا جوڑا دلا دیں۔" میں نے سامنے ڈمی پر سجے پیلے سوٹ کی جانب اشارہ کیا جس پر سرخ اور سبز کندن کا بہترین کام بنا ہوا تھا۔

"مدیحہ!" امی نے مجھے تنبیہی نگاہوں سے دیکھا۔ "تمہارے جہیز میں دو پیلے سوٹ ہیں اور ایک پیلی ساڑھی۔ کتنے پیلے جوڑے اکٹھے کرو گی؟"

"امی یہ سوٹ میں اپنے مایوں پر پہنوں گی۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"کیا؟" امی کو جیسے کرنٹ لگا۔

اور وہ یہ بھی بھول گئیں کہ کالج مارکیٹ کی [illegible] دکان پر بیٹھی ہیں۔ یا تاکہ اس دکان دار سے ہماری اچھی جان پہچان تھی۔ بڑی پھپھو، چھوٹی پھپھو اور [illegible] کی بچیوں کے شادی کے کپڑے امی نے یہیں سے خریدے تھے لیکن بہرحال وہ دکان ہی تھی۔ لیکن امی کو شاک لگنا بھی بجا تھا۔

"تم مجھے میں پیلا جوڑا پہنو گی؟ کیوں اپنی دادی سے مجھے باتیں سنواؤ گی۔ تمہیں کیا معلوم نہیں تمہارے ددھیال میں مایوں میں پیلا [illegible] نہیں [illegible] میں نے [illegible] سے کہہ کر [illegible] تمہارے لیے [illegible] گلابی جوڑا بنوایا [illegible] بہاولپور میں گوٹے کا کام بہت خوب صورت ہے۔" امی نے مجھے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"پہنتے ہوں گے ہمارے خاندان میں گلابی جوڑا [illegible] میں اپنے مایوں میں صرف پیلا جوڑا [illegible] اور وہ بھی یہ والا۔" میں نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے ضد سے کہا۔

"مدیحہ! کیوں مجھے تنگ کر رہی ہو۔ تمہاری دادی کبھی نہیں مانیں گی اور سختی پڑے گی مجھے اور وہ صاف کہیں گی کہ مدیحہ کو ننھیال والوں نے اکسایا ہے۔" امی زچ ہو کر بولیں۔

"اچھا آپ مجھے یہ سوٹ دلا دیں اگر میں مقدمہ جیت گئی تو یہ پہن لوں گی اور اگر نہیں تو پھپھو والا گلابی جوڑا پہن لوں گی۔" میں نے مصالحتی انداز میں کہا۔

امی نے مجھے [illegible] نظروں سے دیکھا اور اس پیلے جوڑے کے لیے بھاؤ تاؤ کرنے لگیں جو مجھے ایک ہی نظر میں پسند آ گیا تھا۔

اس پیلے جوڑے کے علاوہ امی نے چائنا سلک کی جامنی ساڑھی مجھ سے پوچھے بغیر ہی خرید لی اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ وہ ناراض ناراض سی مارکیٹ سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو مدیحہ! تمہارے جانے میں صرف بیس دن رہ گئے ہیں۔ بیس دن بعد تم اس گھر سے رخصت ہو جاؤ گی۔ جاتے جاتے دادی کو ناراض کر کے جانے کا کیا فائدہ؟ تم یہ پیلا جوڑا جہیز میں رکھ لو اور دادی سے بحث مت کرو۔" میری ہمیشہ کی صلح جو ماں نے مجھے پیار سے سمجھایا۔

امی کی اسی صلح جو طبیعت کا دادی نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا۔ میں نے ہمیشہ اپنی ماں کو دادی کے آگے ہار مانتے ہوئے دیکھا۔

امی تک سک سے میکے کی کسی تقریب میں جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں اور دادی نے ایک دم کہہ دیا۔

"تم لوگ مجھے فرزانہ کے گھر چھوڑتے ہوئے چلے جاؤ واپسی میں لے لینا۔"

فرزانہ پھپھو کے گھر جانے کا مطلب سڑک پر پورے ایک گھنٹے کا زیاں ہے کیونکہ فرزانہ پھپھو اور علی کا گھر دو مختلف سمتوں میں تھا اور دادی کو واپس لینے کا مطلب تھا کہ گیارہ بجے سے پہلے اٹھ کر آ جاؤ کیونکہ

دادی گیارہ بجے سو جاتی تھیں۔

اب اس پورے عالم میں یہ تصور کرنا محال نہیں کہ امی اپنی ماں کے پاس کتنی دیر بیٹھ سکیں گی۔ سارے بہن بھائی امی سے ناراض ہوتے کہ ابھی تو آئی ہو' سب سے پہلے تمہیں جانے کی پڑتی ہے۔ لیکن وہ خوش دلی سے ہنستیں۔

"اماں کو فرزانہ کے گھر سے لینا ہے وہ ذرا جلدی سو جاتی ہیں۔"

امی کی اس صلح جو طبیعت میں تمہارے باپ کی کم گوئی کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ امی سے کہہ دیا۔

"کوشش کرنا اماں ناراض نہ ہوں۔"

اور امی ــــ نے اپنا نصب العین بنا لیا کہ انہوں نے دادی کی کسی بات سے انکار نہیں کرنا۔

اکثر میں نے تنہائی میں ابو کو دیکھا کہ وہ امی کا ہاتھ پکڑ کر کہتے۔

"سوری نبیلہ! اماں تمہارے ساتھ زیادتی کر جاتی ہیں لیکن پلیز میری ماں سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرو۔" اور امی خوش دلی سے مسکرا دی تھیں۔

امی کی [illegible] گھر کو جنت بنایا ہوا تھا۔ ابو نے پوری زندگی میں اگر کسی بات پر اختلاف کیا تو وہ میرا نام تھا۔ امی میرا نام مدیحہ رکھنا چاہتی تھیں اور دادی دردانہ پھپھو اور فرزانہ پھپھو کے ناموں سے ملتا جلتا رخسانہ یا ریحانہ جیسا کوئی نام تجویز کر رہی تھیں اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح امی ان کی بات ٹال نہیں سکیں گی۔

لیکن بھلا ہو ابو کا جنہوں نے اپنی ماں سے دو ٹوک لہجے میں صرف ایک جملہ کہا۔

"امی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے جو ماں بچے کی پیدائش کا دکھ جھیلتی ہے بچے کا نام رکھنے کا پہلا حق اسی کا ہے لہٰذا نبیلہ کو جو نام پسند ہے لے رکھنے دیں۔"

یوں امی بتاتی ہیں کہ میرا نام مدیحہ تجویز ہو گیا اور اس کے بعد دونوں بھائیوں کے نام کمیل اور منال امی نے اپنی پسند سے رکھے اور دادی خاموش رہیں۔

اگر زندگی کے اور معاملات میں ابو اسی طرح امی کا تھوڑا بہت ساتھ دیتے تو شاید دادی کے رویے میں لچک آ جاتی لیکن دادی امی کی کسی بھی خوشی کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔ بس یہی بات بچپن سے جوانی تک مجھے دادی سے متنفر کرتی گئی۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مجھے اپنی دادی سے محبت نہیں۔ لیکن جب ــــ دادی کسی بات پر امی کا دل دکھا کر چڑیلوں کی طرح مسکراتیں تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور آہستہ آہستہ میں نے ہر وہ کام کیا جو دادی کو ناپسند تھا۔

میری دونوں پھپھوں کی انٹر کے فوراً بعد شادی کر دی گئی مگر میں نے انٹر کے آخری پیپر کے بعد ابو سے جا کر کہا۔

"ابو! میں امی کی طرح ایک سمجھدار بیوی اور سمجھدار ماں بننا چاہتی ہوں اس لیے مجھے امی کی طرح کم از کم بی ایس سی کرنے دیں۔"

اور یوں دادی کے واویلا کرنے کے باوجود میرا بی ایس سی میں ایڈمیشن ہو گیا۔ میرے بی ایس سی فائنل کے ایگزام میں کچھ عرصہ باقی تھا جب میرے لیے پڑوسیوں کی وساطت سے نجیب احمد جیسا شان دار رشتہ آیا جس کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

دادی نے شاید سکون کا سانس لیا ہو کہ اب میں رخصت ہو جاؤں گی۔ لیکن میری طرح اللہ کو بھی ان کا سکون پسند نہیں آیا اسی لیے نجیب احمد دو سال کی کسی ٹریننگ کے لیے جاپان جانے لگے تو انہوں نے ابو سے کہا کہ مدیحہ سے کہیے گا گھر بیٹھ کر وقت ضائع نہ کرے۔ دو سال میں ایم ایس سی کر لے۔

دادی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح ابو کو میرا ایڈمیشن یونیورسٹی میں کروانے سے منع کر دیں۔

یونیورسٹی جا کر مجھے بہت حوصلہ ملا۔ یونیورسٹی میں جو میری سب سے اچھی دوست بنی وہ تھی نازک رحمن۔

نازک اپنے نام کی طرح بظاہر تو نازک سی تھی لیکن کام سارے مردوں والے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اندر باہر سارے کام اپنے کرنے کی عادی تھی۔

اپنی چھوٹی سی خیبر کار لے کر یونیورسٹی آتی تھی اور شوق ہی شوق میں میں نے اس سے گاڑی چلانا سیکھی اور اعتماد حاصل کرنے کے لیے اکثر یونیورسٹی سے باہر روڈ پر بھی گاڑی چلائی۔

اور میری یہ خوبی دادی کی نظر میں بہت بڑی خامی تھی۔ ایک روز رات میں ابو کو انجائنا کا ہلکا سا اٹیک ہوا۔

دادی تو سو رہی تھیں امی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ کمیل اور منال بھی اٹھ گئے۔ امی نے منال سے کہا کہ وہ برابر والے کاظم انکل کو بلا لائے۔ کمیل فرسٹ ائیر میں اور منال نویں جماعت میں تھا اور دونوں کو ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔

"امی! کاظم انکل کو بے وقت تنگ کرنے کی ضرورت نہیں کمیل! تم لوگ ابو کو گاڑی میں لٹاؤ میں لے جاؤں گی' مجھے ڈرائیونگ آتی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"مدیحہ؟" امی نے میری جانب حیرانی سے دیکھا اور کچھ پوچھنا چاہا۔

"امی پلیز آپ بعد میں ڈانٹ لیجیے گا ابھی ابو کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔" میں نے لجاجت سے کہا اور یوں ہم منال کو دادی کے پاس چھوڑ کر کارڈیو پہنچے۔

بروقت طبی امداد مل جانے کی وجہ سے ہم کسی بڑے سانحے سے بچ گئے۔ پھر بھی ابو آئی سی یو میں تھے۔

اگلے دن دادی کو پتا چلا تو وہ دل تھام کر رہ گئیں بہرحال وہاں تھیں۔

جتنے دن ابو ہسپتال میں رہے گھر سے مسلسل سب کو لانے لے جانے کے فرائض مجھے انجام دینے پڑے۔

دادی مجھے حیرانی سے دیکھتیں اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ امی کو بہت کچھ کہنا چاہتی ہیں لیکن یہ وقت مناسب نہیں ہے۔

چھ روز بعد ابو کو گھر لایا گیا۔ بہاولپور سے دردانہ پھپھو بھی آ گئیں۔ بہت محبت کرتی تھیں وہ ابو سے' ہر سال ان کے شوہر عیدالفطر کے بعد تین چار دن کے لیے انہیں کراچی بھیج دیتے تھے۔ خاصی سخت زندگی گزار رہی تھیں دردانہ پھپھو۔

اب ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت ان کے کراچی آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب عید پر کراچی نہیں آسکیں گی۔ خیر آئیں تو پورا وقت ابو کے ساتھ لگی رہیں۔

اس روز ابو کی طبیعت خاصی بہتر تھی تو وہ باہر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ پھپھو ان کو سیب کاٹ کر کھلا رہی تھیں۔

"مدیحہ نے تو بڑا بیٹا نہ ہونے کی کمی پوری کر دی' بچی گھر اور ہسپتال کے درمیان گھن چکر بن کر رہ گئی۔" پھپھو میری طرف محبت سے دیکھ کر بولیں۔

"ہاں یونیورسٹی جا کر لڑکوں کے درمیان رہ کر یہی تو سیکھا ہے۔" دادی کو اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا۔

وہ سمجھ رہی تھیں کہ شاید ابو کو یہ بات نہیں معلوم کہ میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی ہے۔

"میں نے ڈرائیونگ کسی لڑکے سے نہیں بلکہ اپنی دوست نازک رحمن سے سیکھی ہے۔" دادی نے میری اس خوبی کو اس طرح غلط انداز میں پیش کیا کہ ایک لمحے کو تو میں بھی گڑبڑا گئی۔

"لڑکے سے سیکھی ہو یا لڑکی سے لیکن آج اگر مدیحہ کو ڈرائیونگ نہیں آتی تو شاید میں آپ کے درمیان نہ بیٹھا ہوتا۔" ابو کم بولتے تھے لیکن جب بات کرتے تو دو ٹوک انداز میں کرتے تھے۔

دادی ابو کے انداز پر چپ ہو گئیں اور پھپھو شکایتی

تمہارا" ایک بار ملکہ شراوت سے مشورہ نہ کرلیا جائے اس سلسلے میں۔"

بادشاہ سلامت نے کسی بے تکلف دوست کی طرح میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رائے لی تھی۔

"مگر آپ شاید ملکۂ عالیہ کہنا چاہتے ہیں۔" اپنے غصے کو قابو کرتے ہوئے میں نے پھر سے اسی نرم لہجے میں بادشاہ سلامت کی تصحیح کی تھی۔ جس کے چہرے پر ذرہ برابر جو شرمندگی آئی ہو۔

"شاید آپ کو یاد نہیں بادشاہ سلامت! یا پھر شہزادہ سلیم کی گستاخی نے آپ جیسے عظیم بادشاہ کے حواس سلب کرلیے ہیں۔ ملکۂ عالیہ کو تو کل سے شدید بخار ہے وہ یہاں نہیں آسکیں گی۔"

"ابھی گھنٹہ بھر پہلے تو اچھی بھلی تھیں نازیہ' میرے پیسے سے پورے تین کپ کھا گئی تھیں آئس کریم کے' اب کیا تکلیف ہو گئی اچانک؟" صائمہ (بادشاہ سلامت) نے اپنا منہ میرے کان میں گھسیڑ کر ملکۂ عالیہ کی شان میں کھلی گستاخی کی تھی۔

"نازیہ نے جو فراک پہننا تھا اس کے ساتھ کا سلور کیپ [illegible] اٹھا کر لے گیا ہے اور وہ پیچھے بیٹھی رو رہی تھی [illegible] اصل میں اپنی بہن ہی سے [illegible] لڑائی تھی۔ اب وہ اسے [illegible] کی نہیں۔"

سامنے ہال میں موجود حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے بھرپور احتیاط سے بادشاہ سلامت تک یہ "روح فرسا" خبر پہنچائی تھی۔ حاضرین بھی شاید "اکبر اعظم" اور ایک معمولی کنیز کے مابین ہونے والی ان سرگوشیوں سے اکتا گئے تھے' جبھی پچھلی قطاروں سے ہوٹنگ شروع ہو گئی تھی۔

"اے عظیم ہندوستان کے وسیع و عریض بادشاہ! میرا خیال ہے اس وقت آپ کو تھوڑی تفریح طبع کی ضرورت ہے۔ میں ابھی کنیزوں کو بھجواتی ہوں۔"

ہوٹنگ سے گھبرا کر میں نے فوری طور پر ارم اور اس کی سہیلیوں کا تیار کردہ قوالی ٹائپ گانا چلوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چلو خیر دس منٹ کی بچت تو ہو جاتی نا!

"جی اب آپ اپنا فیصلہ صادر فرما دیں بادشاہ سلامت؟" آخر سونگ پر حاضرین کی بھرپور تالیوں [illegible] ختم ہوتے ہی ہم لوگ پھر سے اسٹیج پر پہنچ گئے تھے۔ اس بار تو شہزادہ سلیم اور انار کلی بھی موجود تھے۔ انار کلی نے وہی سلور کیپ بڑی تمکنت سے پہن رکھا تھا جس کی مالکن پچھلے آدھے گھنٹے سے رو رہی تھی۔ ہال میں موجود لڑکیوں اور اساتذہ کا خیال نہ ہوتا تو یا [illegible] اسی وقت "اسی لمحے" سیما (انار کلی) کی ٹھکائی شروع کردیتی مگر ضبط لازم تھا کہ۔

"ہاں تم کہو انار کلی! کیا کہتی ہو؟" بادشاہ سلامت نے آخر منہ سے کچھ تو پھوٹنا ہی تھا مجھے تو۔

"بس یہی کہنا ہے جی کہ

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
پیار کیا کوئی چوری نہیں کی۔"

چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا"

سیما کی بچی نے ٹھمک ٹھمک کر مدھوبالا بننے کی بھونڈی سی کوشش کر ہی ڈالی تھی۔

"چپ کر گستاخ کنیز! بادشاہ سلامت کے سامنے اتنی بے خیالی" ان کے غضب سے ڈرو' ایسا نہ ہو کہ تمہیں زندہ دیوار میں چنوا دیں۔"

یہاں بھی آخر مجھے ہی آگے بڑھ کر بادشاہ سلامت کے حصے کا ڈائیلاگ بولنا پڑا تھا۔

"تو بھلا ایسے ہی دیوار میں چنوا دیں گے' تم نے شاید مغل اعظم نہیں دیکھی' اکبر بادشاہ نے خود اسے بہت سارے پیسے دے کر بھگا دیا تھا۔ کیوں شہزادہ سلیم؟"

اپنے برابر کھڑی مصباح (شہزادہ سلیم) کی پسلیوں میں کہنی چبھوتے ہوئے وہ چہک کر بولی تھی۔ ساتھ ہی ہال میں سے لمبی سی سیٹیاں بجنے کی آواز بھی آئی تھی۔ جسے سیما نے اپنی "اعلا اداکاری" کی داد سمجھ کر وصولا تھا۔

"ویسے آپس کی بات ہے یار! اب کرنا کیا ہے؟" بادشاہ سلامت پھر گھگھیائے تھے۔

"کرنا تو یہ ہے کہ میں نے اب یہ سامنے والا گملا اٹھا کر تمہارے سر میں دے مارنا ہے' صائمہ کی بچی! کوئی ایک ڈائیلاگ بھی ڈھنگ سے یاد کیا تم نے؟ اور یہ جو تم داڑھی میں مسلسل انگلیاں پھیر رہی ہو' بڑی مشکل سے اسکاچ ٹیپ سے جوڑی تھی' ابھی نکل گئی تو کتنی بے عزتی ہوگی۔"

میں ایک منٹ میں ہی آرام سے ڈائریکٹر بن گئی تھی اور صائمہ کا منہ بن گیا تھا۔

"کنیز! کیا بات ہے' ٹھیک طرح چپکا جو ہے۔" صائمہ (بادشاہ) نے میری ساری ڈانٹ کا غصہ پیچھے کھڑی حنا پر اتارا تھا۔

"ٹھہر جاؤ تم ذرا یہ ڈراما تو ختم ہونے دو۔ اسی پنکھے کی ڈنڈی سے تمہارا سر نہ پھاڑ دیا تو کہنا۔" (بشریٰ!) کنیز بھی خاصی تنگ ہو چکی تھی۔

"یا اللہ بس آج بچا لے' میری توبہ جو آئندہ بھی ڈراما بنانے کا سوچ بھی لوں۔"

میں نے صبر کا ایک اور گھونٹ بھرا تھا۔

"شہزادہ سلیم چوہا' وہ دیکھیں چوہا۔"

انار کلی کی خوف ناک چیخ نے ہم سب کا دھیان بٹایا تھا اور پھر مشترکہ چیخوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ تھا اور ہم دھڑام سے سر کے بل اسٹیج سے نیچے [illegible] میں تو صوفے سے نیچے گری ہوئی تھی اور سامنے ہی ٹی وی چل رہا تھا۔ روزانہ کی طرح میں اپنا ناشتے اور صفائی کا کام ختم کرکے اپنے فیورٹ سوپ سیریل کا نشر مکرر دیکھنے بیٹھی تھی' پتا ہی نہیں چلا کب میری آنکھ لگ گئی اور یہ سب۔

تو گویا یہ سب جو میں دیکھ رہی تھی' کوئی خواب تھا۔ صوفے سے اٹھ کر ٹی وی بند کرتے ہوئے میں نے اپنے سر پر خود ہی چپت لگائی تھی اور مسکرا دی تھی۔

ہاں کئی سال پہلے کالج میں ایک بار میں نے سیکنڈ ایئر کی پارٹی میں انار کلی کے نام سے ڈراما کیا تھا' کچی عمر' شرارتی ذہن اور ہر دم مسکراتے ہونٹوں والی ہم سب سہیلیاں بہت خوش تھیں اور بیچ بیچ سارے کا سارا ڈراما بالکل ایسے ہی ہوا تھا' حتیٰ کہ چوہے کی انٹری والا آخری منظر بھی۔

کتنی حیرت کی بات تھی' نا! مجھے تو خود بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ تب ہی اندر سے گڑیا کے رونے کی آواز نے مجھے اپنی طرف بلایا تھا اور ساتھ ہی بہت کچھ یاد بھی آنے لگا تھا۔

گڑیا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' سو مجھے ساری رات جاگنا پڑا تھا۔ صبح حماد کا ناشتا صرف پندرہ منٹ لیٹ ہو گیا تھا تو وہ بغیر ناشتہ کیے ہی غصے میں بھناتے ہوئے دونوں بڑے بچوں کو لے کر نکل گئے تھے۔ پتا نہیں ان دونوں نے اسکول میں بھی کچھ لیا ہوگا یا نہیں۔ ہاں معیز کی جیب میں جاتے جاتے پچاس کا نوٹ ڈالا تو تھا میں نے' چلو کھا ہی لیا ہوگا۔

گڑیا بھی اللہ کا شکر ہے اب ٹھیک ہے' جب ہی تو آرام سے سو رہی ہے۔ اسے دودھ پلاتے ہوئے میں نے اس کے بال بگاڑے تھے اور وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔

رہ گئے حماد تو ان کے آنے میں ابھی پورا ایک گھنٹہ رہتا ہے۔ کباب اور مٹر قیمہ تو فریز کیے رکھے ہیں' ساتھ میں چاول اور روٹی اور دہی کا رائتہ بنالوں گی تو ان کا سارا غصہ غائب۔

ہاں پھر میں گڑیا کو کپڑے اتار کر آرام میں بٹھاتے ہوئے میں بہت سکون سے یہاں بیٹھی تھی۔ [illegible] جھنجلاہٹ' غصے اور بے سکونی کا تو کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

اور اس سب کی وجہ تھی' جی ہاں وہی نشر مکرر' وہ خواب جو تھوڑی سی دیر کو میرے ماضی کی ایک خوش گوار یاد کو دہرا گیا تھا۔ پرانی ڈائری کے بوسیدہ ہوتے اوراق میں' یا پھر پھٹی ہوئی جلد والے فوٹو البم کی کسی تصویر میں بالکل تازہ پڑی ہمیں یاد آکر جاوداں سا کرتی ہے۔

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

بے حد خوش گوار موڈ میں گنگناتے ہوئے میں چاول بھگونے میں لگی تھی' تھینک یو سوچ' نشر مکرر۔

☼

ناولٹ

ثمرہ بخاری

پچھلے برس کے سرما کی اندوہناک یادیں شبلی کے ساتھ ساتھ تھیں۔ آج بھی وہ منظر یاد آتا تو جھرجھری سی آجاتی تھی۔ سرما کی شامیں ٹھٹھری ہوئی ہوتی تھیں، کمروں میں نرم گرم دھوپ آنگن میں اتر آتی تھی اور اس اترتی دھوپ میں امی، تائی جان اور محترمہ دادی حضور سرسوں کا ساگ تقریباً "ہر ہفتے" بڑی دل جمعی سے پہلے صاف کرتیں کاٹتیں، پھر چولہے پر چڑھا دیتیں۔ ساگ ساری رات ہلکی آنچ پر پکتا رہتا اور پھر اگلے دو روز تک یہ ہی نوش کیا جاتا۔ شبلی اور جوادی کا بس نہیں چلتا تھا، تو ساگ کو غائب کردیں یا خود غائب ہو کر اسے تناول کرنے سے بچ جائیں۔

پورا سرما اس ساگ نے آٹھ آٹھ آنسو رلائے تھے اور دونوں گھرانوں کے باقی افراد نے اس سوغات کو مزے لے لے کر کھایا تھا، بلکہ گرمیوں میں بھی دادی سرما کا انتظار اسی لیے کرتی تھیں کہ سردیوں کے ساگ سے جدائی ان کے دل پر قیامت ڈھاتی تھی۔ یہ ساگ قریبی دیہات کی ایک خاتون مسز اللہ رکھا ایک بڑے گٹھڑ کی صورت میں سر پر رکھ کر لاتی تھیں اور آواز لگاتیں۔

"ساگ لے لو، ساگ خالص گندلاں دا ساگ۔"

اور دادی اپنی دونوں بہوؤں کے ساتھ جھوم اٹھتیں، حالانکہ جانتی تھیں۔ یہ ہی آواز معصوم پوتوں پر قیامت ڈھا گئی ہے۔ خیر اس سال تو شبلی نے پکا انتظام کرلیا تھا۔

مسز اللہ رکھا صاحبہ دن کے ایک سے ڈیڑھ کے درمیان نزول فرماتی تھیں۔ شبلی اس ٹائم کے دوران گلی کے نکڑ پر جا کر بیٹھ جاتا اور ادھر مسز اللہ رکھا کا جامنی کلر کا مکھڑا نمودار ہوتا، ادھر آپ دوڑ کر جاتے۔

"چلو چلو" ادھر سے چلو ادھر کسی کو ساگ نہیں لینا میری دادی کو ساگ سے الرجی ہے، اس کی خوشبو بھی ان تک پہنچ گئی تو قیامت آجائے گی۔"

"ہائے اللہ! کیسی بے ذوق عورت ہے وے تیری دادی بھلا کسی کو ساگ جیسی سوغات سے بھی الرجی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں ہے ہیں وہ بے ذوق، چلو پھوٹو اب یہاں سے۔"

شبلی اس سرما میں اپنی اس ترکیب کی وجہ سے جوادی کے ساتھ مل کر چین کی بنسی بجا رہا تھا اور ادھر گھر والے مسز اللہ رکھا کی راہ اب آہیں بھر بھر کے دیکھنے لگے تھے۔

"تایا جان! کیا پتا اس سرما میں مسز اللہ رکھا کا انتقال ہو گیا ہو، آپ ایسا کریں بازار سے ساگ منگوالیں۔"

یہ مخلصانہ مشورہ نانا ماموں کا تھا۔
"بازار میں تو سرسوں کے نام پر مولیوں کے پتے بیچتے ہیں۔" جوادی نے جھٹ سے بیان دیا تھا۔
"کیسی خوشنما گندلیں ہوتی تھیں اس ساگ کی' آج بھی یاد آتا ہے تو منہ میں پانی آجاتا ہے۔" دادی جان نے آہ بھری تھی۔
"اور میری آنکھوں میں۔" جوادی نے دکھڑا رویا۔
"اماں! مولیوں والے پراٹھے بنائے بھی بڑے دن ہوگئے ہیں۔" جوادی کی والدہ کو مولیوں کی یاد نے تڑپایا۔
"تو اور کیا اور اس مرتبہ تو ابھی تک آلو کے پراٹھے بھی نہیں بنے۔" یہ شبلی کی امی جان تھیں۔
"پراٹھے قیمے والے بھی بنائے جاتے ہیں' چکن کا ہلکا ہلکا شوربہ بھی کافی ذائقہ دار اور صحت بخش ہوا کرتا ہے۔"
شبلی نے یاد دلانے کی کوشش کی۔ لیکن کسی نے دھیان نہیں دیا۔ فیصلہ ہوا آج آلو مولی کے پراٹھے شبلی کی امی بنائیں گی سب مل کر ان کا لطف لیں گے جبکہ کل کھانا جوادی کے ہاں تناول کیا جائے گا اور بنایا جائے گا شلجم گوشت اور ساگ۔
"یار! جوادی میں سوچ رہا ہوں۔ ہر سال میں خانہ بدوشوں کی طرح ہجرت کر لیا کروں۔"
"آہو یار! سوچ تو اچھی ہے' سبزیاں کھا کھا کے اب تو جہاں محلے میں کوئی مرغی چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے' میری نیت میں فتور آنے لگتا ہے۔"
"او بے ہدایتو! کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو' کب سے دروازے پر بیل ہو رہی ہے۔"
"اب بیل کھڑکی یا روشن دان پر تو ہونے سے رہی' کمال کرتی ہیں دادی بھی۔" جوادی بڑبڑا کر اٹھا تھا۔
دروازے پر رانا محلے دار سناروں کے خاندان کا چشم و چراغ دادا سیٹھ کا پوتا صغیر اور برابر میں ٹھیکے دار چچا کا آفتاب کھڑا تھا۔
"کیا ہے تم لوگ کیسے آگئے بے وقت؟"
"بے وقت کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"بے وقت کا مطلب ہے جب وقت نہ ہو۔"
"او ہو' ہم کہہ رہے ہیں بھلا بے وقت کیسے کہہ رہے ہو۔ یہ کوئی رات کے بارہ بجے کا ٹائم تو ہے نہیں۔"
"اچھا آئے کیوں ہو؟" جوادی کی بے زاری عروج پر تھی۔
"امی نے بلایا ہے تم دونوں کو۔" آفتاب نے اطلاع دی۔
"نہیں ابھی کہہ دو ان سے' وہ پیر صاحب جو شوہر کی حیات کو قابو میں رکھنے کے تعویذ دیتے تھے' جن کا دعویٰ تھا ان کے دیے تعویذ کتے کی دم کو سیدھا کرنے میں اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں' بیگم کے ہتھے چڑھنے کے بعد اس کام سے توبہ کر کے ٹیکسی ڈرائیور بن چکے ہیں اور کوئی دوسرا باکمال پیر ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا۔"
"ہیں تو وہ تعویذ تم لوگ اماں کو لا کر دیتے تھے؟"
[illegible]
"اچھا اچھا فضول گو اس وقت معاملہ دوسرا ہے' اصل میں آفتاب کو دیکھنے کچھ لوگ آنا چاہ رہے ہیں۔"
"کیا خالہ نے گھر کو چڑیا گھر بنا دیا ہے' اچھا منافع بخش کاروبار ہے یہ بھی۔"
"او ہو جوادی! قسم سے کبھی کبھی تم بڑا بور کرتے ہو' بھئی بر دکھاوے کے لیے آرہے ہیں۔ خالہ نے بلوایا ہے تم لوگوں کو کسی ضروری مشورے کے لیے۔"
"اچھا تو یوں کہو نا!"
جوادی نے بیٹھک سے کھڑے کھڑے شبلی کو آواز دی اور جس وقت دونوں آفتاب کے گھر پہنچے' خالہ ٹھیکے دارنی خاصی پرجوش دکھائی دے رہی تھیں۔
"بہرا گھرانہ ہے' کھاتے پیتے لوگ ہیں' اکلوتی لڑکی بیٹی ہے' نانا نہیں میرا آفتاب کیسے بھا گیا انہیں۔ اب اللہ کرے گھربار پسند آجائے' ویسے ابھی تک آفتاب کو صرف لڑکی کے بھائی نے دیکھا ہے' والدین تو اب دیکھنے آرہے ہیں' تم کوئی مشورہ دو۔"
"کس سلسلے میں؟"
"ہا' وے کس سلسلے میں کیا بھی ابھی سلسلے میں' کچھ ایسا کرو کہ وہ انکار نہ کریں۔ ہمارا گھربار پسند آجائے ان کو۔"
"ویسے اس سلسلے میں پہلی احتیاط تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ اس دوران آپ ہر خوب صورت لڑکے کا داخلہ گھر میں بلکہ گلی میں بھی بند کروا دیتیں' ہمیں بلا کر تو آپ نے آفتاب کی بدقسمتی کو آواز دے دی ہے۔"
"ہاں وے یہ تو ہے' چلو میں کہہ دوں گی دونوں شادی شدہ ہیں' بلکہ بال بچے دار بھی ہیں۔"
"نانا اتنا آگے تک جانے کی ضرورت نہیں' یہ جو عمر رسیدہ شادی شدہ خواتین ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ شرم و حیا کا گھونٹ لگا کر پی چکی ہوتی ہیں۔ مردوں تک سے مفید مشورہ ڈسکس کرتے نہیں شرماتیں۔ بچوں والی بات تو رہنے دیں۔ ہمیں آنکھوں دیکھا تجربہ ہے' کانوں سنا یا الگ ہی تجربہ کر رہی ہیں۔"
"چلو وے بے شرموں کیسی باتیں کرتے ہو' اچھا شادی شدہ کہہ سکتی ہوں نا؟"
"اب آپ اصرار کر رہی ہیں تو ٹھیک ہے۔"
"اچھا تو یہ بتاؤ' اپنے خاندان میں سے کس کس کو بلاؤں' دیکھو نا لمبا چوڑا خاندان ہے جسے نہ بلایا وہی منہ بنا کر بیٹھ جائے گا۔"
"واقعی معاملہ گمبھیر ہے' لیکن گھبرائیے نہیں' ایسا کریں' بڑی نند' بڑی جٹھانی' بڑی بھاوج اور بڑی آپا کو بلوائیں لکھ اللہ اللہ خیر صلا۔"
جوادی کے مشورے کو خالہ ٹھیکے دارنی کے ساتھ ساتھ سب ہی نے سراہا مگر پھر خالہ بولیں۔
"یہ میری بڑی نند تو بڑی خرانٹ عورت ہے' زندگی بھر میرا سکھ اس سے کبھی برداشت نہیں ہوا' رنگ میں بھنگ ڈال دے گی اور وہ میری بڑی جٹھانی اسے تو بات کرنے کی تمیز نہیں' آرام سے بھی بات کرے تو لگتا ہے کوسنے دے رہی ہے۔ بنی بنائی بات بگڑ جائے گی اور میری بڑی بھاوج توبہ اللہ بچائے ایسی فسادن ہے کہ مثال نہیں ملتی' رشتہ ہونے سے پہلے ہی ختم کرا دے گی۔"
"خالہ! کیوں گھبراتی ہیں' ہم کس مرض کی دوا ہیں' کریں گے انہیں قابو' آپ دیکھیں نا' آپ کو اکیلے دیکھ کے بغیر برادری کے دیکھ کے لڑکی والے تو یہ ہی سمجھیں گے آگے پیچھے کوئی نہیں' رشتوں کے معاملے میں کنگلے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات ہوگی بھلا۔"
"ہاں بھئی! کہتا تو ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے بلانا ہی پڑے گا ان سیاپوں کو' چل وے آفتاب! کر دے فون' آجائیں تیار شیار ہو کے۔"
"تو اماں! میں خود سے فون کرتا کیا اچھا لگوں گا۔ کتنے ہی فسانے تو بیٹھے بٹھائے بن جائیں گے۔"
"ہاں بھئی۔ مجھے خیال نہیں رہا' کرتی ہوں میں خود ہی فون۔"
"اچھا جوادی' شبلی' یہ بتاؤ کھانے میں کیا رکھوں؟"
"خالہ! آپ لڑکے والی ہیں' مانا کہ لڑکی جائیداد والی ہے' مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ خودی کو کھو دیں' سر اٹھا کر جئیں' ورنہ پھر موت ہی اچھی ہے۔" جوادی نے سنجیدگی سے سمجھایا۔
"شبلی نے بات بڑھائی۔ موت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ پنکھے سے لٹک کر اس کے پر ٹیڑھے کر دیں۔ یا ڈی ڈی ٹی کھا کر چوہوں' کاکروچوں کی زندگی بڑھا دیں' مطلب ہے۔"
"وے دفع کرو خوشی کے موقع پر یہ کیا بکواس کرنے بیٹھ گئے ہو۔"
"یہ بتاؤ' میں کیا پہنوں' وشنیل کا ایک جوڑا پڑا ہوا

ساری خوشیوں پر پانی پھر گیا ہوگا۔" خاتون تصور کر کر کے جھوم رہی تھیں۔

"یہ ٹھیکے والی ہے بڑی تیز' دیکھو تو پاگل سے لڑکے کے لیے ایسا اچھا رشتہ دیکھ لیا۔ بھلا میرے لڑکوں میں کون سی عیب ہیں' ایک بھولی اُلٹے توے جیسی کالی اور کنگلوں کی بیٹی نو میرے کو یہ بھی نصیب نہیں ہو رہی۔" یہ ایک محلے والی کے دل کی فریاد تھی۔

"وے جوادی! تو پلیٹ میں کیا لے کر جا رہا ہے؟" بات کرتے کرتے جو قورمے سے بوٹیاں نکال کر چھپ چھپا کر کھاتے جوادی پر نظر پڑی تو دکھ کی جگہ تجسس نے لے لی۔

"کچھ نہیں چاچی! خالی پلیٹ ہے۔" بس رکھنے ہی جا رہا تھا۔"

"وے پتر اللہ تیرا بھلا کرے' ایک ایسی ہی خالی پلیٹ مجھے بھی لا دے۔" وہ بھی اسی کی محلے دارنی تھیں۔

☆ ☆ ☆

مہمانوں کی آمد کا شور اٹھا' خواتین میں ہلچل مچ گئی۔ [illegible] جنہوں نے اس فضول خاندان میں بیٹی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ [illegible] دیکھ کر کچھ مایوسی ہی ہوئی۔ لگتا تو ان ہی جیسی عام سی خواتین تھیں۔ کپڑے اچھے قیمتی پہن رکھے تھے۔ ایک صحت مند بوڑھی خاتون جنہیں سہارا دے کر لایا جا رہا تھا' خاصا سونا لادے ہوئے تھیں۔

"لگتا ہے گھر میں کسی پر اعتبار نہیں' سب پہن کر آگئی ہیں۔" شبلی نے جوادی سے کہا تھا۔

"مجھے تو ترس ان سہارا دے کر لانے والیوں پر آرہا ہے' ایک تو بزرگ نانی کا اپنا ویٹ اس پر جیولری کا وزن توبہ میرے اللہ۔"

"یہ ہماری بچی کی نانی ہے۔" اعلان کے انداز میں مہمان خواتین نے ان بزرگ خاتون کا تعارف کرایا تھا۔

"اچھا یہ نانی ہیں؟" جوادی نے بڑی ہی دلچسپی سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں میں ہی نانی ہوں۔ تم کیا سمجھے تھے؟ اور تم ہو کون؟ اے بتول! انہیں یہ لڑکا تو نہیں دیکھ لیا ننھی کے لیے' یہ تو بڑا چلتا پرزہ ہے' اگر یہ ہے تو ہماری طرف سے انکار ہے۔"

"نانی! آپ کے لیے خوش خبری ہے کہ وہ بدقسمت میں نہیں ہوں' آپ کی فیملی کا حصہ بننے وہ مظلوم جا رہا ہے۔"

نانی نے گھور کر آفتاب کو دیکھا تھا۔ آفتاب نے گھبرا کر سلام جھاڑ دیا۔

"وعلیکم! اچھا تو یہ لڑکا ہے' ہوں ٹھیک ہے' شکل اچھی نہیں ہے' یہ ہی بات مجھے سب سے زیادہ پسند آئی ہے۔" نانی کی مدبرانہ گفتگو نے دونوں کو کچھ حیران تو کیا مگر وضاحت نہیں مانگی گئی۔

"یہ تو میری بھابھی کے میکے سے نہیں ہیں۔ لو میں نے ایسے ہی بھابھی کی شکایت لگائی۔ ہائے میں ابھی بھائی سے بات کرتی ہوں۔"

فوراً نمبر ملایا گیا۔

"ہاں بھائی جی! وہ مجھے غلط فہمی ہوگئی تھی' نہیں یہ بھابھی کے میکے سے نہیں ہے۔ ہائے بھتیجے کا بھی ... آپ نے کیا ضرورت تھی بات کو اتنا بڑھانے کی' اب آپ کو نہیں منانے ان کے میکے بھی جانا پڑے گا' توبہ بندہ پہلے ہی اتنی جلد بازی نہ کرے۔" سیل آف کیا۔

"موجی تو ال سیاپا کر گئی ہے' بھابھی کی بھائی سے لڑائی ہوئی ہے اور وہ میکے چلی گئی ہے۔ اب میری اماں کو سارے کام خود دیکھنے پڑیں گے' کل میرا کھانا تھا پیکے میں' اب کون سب دیکھے گا ستیاناسی۔"

خاتون کا موڈ خراب ہوا تھا اور وہ ایک کونے میں جا بیٹھی تھیں۔

ادھر مہمانوں کو چائے پیش کی جا رہی تھی۔

"نانی! یہ گاجر کا حلوہ تو لو نا!" خاتون کو گھر میں یقیناً ملکہ عالیہ کی حیثیت حاصل تھی۔ خواتین بڑھ چڑھ کر ان کی خدمت میں حصہ لے رہی تھیں۔

"اچھا گاجر کا حلوہ بھی ہے' لاؤ تو ذرا چکھوں۔"

"ہاں جی' یہ آفتاب نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔" شبلی کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔

"اچھا لڑکا امور خانہ داری میں بھی ماہر' یہ بڑی اچھی بات ہے۔"

ابھی تو آفتاب شبلی کی بات پر پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اب نانی کے ریمارکس کے بعد پھولے نہیں سما رہا تھا۔

"ادھر آنا میرے پاس آکے بیٹھ' دور کھڑا بندروں کی طرح دندیاں نکال رہا ہے۔"

مخاطب آفتاب تھا اس تبصرے پر دندیاں یوں غائب ہوئیں جیسے اب کبھی نکلیں گی ہی نہیں اور جا کر نانی کے قریب ڈرتے ڈرتے بیٹھ گیا۔

"غصے کے تیز تو نہیں ہو؟" اگلا سوال ہوا۔

"اسے تو پتا ہی نہیں غصہ کہتے کسے ہیں۔" شبلی نے معلومات مہیا کیں۔

"زیادہ بڑبولے تو نہیں ہو' مجھے بڑبولوں سے سخت نفرت ہے۔"

"نانی کو کوئی یہ بتائے' لڑکا ان کے لیے نہیں ان کی نواسی کے لیے دیکھا جا رہا ہے۔" جوادی کو پریشانی لاحق ہوگئی۔

دونوں نے کچھ فاصلے پر بیٹھی آفتاب کی والدہ محترمہ کی جانب دیکھا۔ وہ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے لڑکی والوں کی طرف سے آنے والی خواتین کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔

اور جب نانی نے انہیں گولڈ کا سیٹ پیش کیا تو بس نہیں چلتا تھا' آفتاب کو ابھی ان کے ساتھ رخصت کر دیں۔

"یہ گاڑی کی چابی ہے' ویسے تمہیں گاڑی چلانا تو آتی ہے نا لڑکے!" نانی نے آفتاب کو ایک اور خوش خبری سنائی تھی اور پورے شریکے کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

"ہائے نی کہاں سے مل گئے ایسے مال دار لوگ' فہمو' میں تمہیں بتاتی ہوں' لڑکا کچھ ٹھیک نہیں ہے' اس کے بجائے میرے لڑکے سے کر دیں۔"

ایک خاتون جوش کے عالم میں اٹھی تھیں۔

"بیٹھی رہیں' آپ کے بارے میں تو ان کی رائے ویسے بھی ٹھیک نہیں ہے' ابھی آپ کی طرف اشارے کر کے منہ بنا بنا کر بول رہی تھیں۔" جوادی نے جوش ٹھنڈا کر دیا۔

"یہ بڈھی نانی ہے ہی فسادن۔" دل کی بھڑاس نکال کر وہ جل کے کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"خالہ جی! ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ نام ہے آفتاب کو برباد ہونے سے بچالیں۔" دونوں نے خالہ ٹھیکے والی کو سمجھانا چاہا تھا۔

"ہا ہا غ تو ٹھیک ہے تمہارا۔ اتنے اچھے رشتے بھلا کہاں ملتے ہیں' تم تو جانتے ہو' آفتاب نہ تو زیادہ پڑھا لکھا ہے نہ ہی آج کل کے لڑکوں والی ہوشیاری ہے اس میں' میں تو شکر کر رہی ہوں' اتنے امیر گھرانے سے رشتہ آیا ہے میرے بچے کا' اب تم مجھے پٹی مت نہ دو۔"

"دیکھ رہی ہیں کتنی تیز خاتون ہیں۔"

"کون نانی؟ ارے اس کی فکر نہ کرو' زیادہ سے زیادہ بھی جیے گی چار' پانچ سال' اس کے بعد چین ہی چین۔"

"لڑکے کی ماں کو ادھر بھیجیں۔" نانی کی کڑک دار آواز سارے پنڈال میں چکرا رہی تھی۔

"جی خالہ جی! میں ادھر ہی ہوں' حکم کریں۔"

"بات یہ ہے کہ تمہارا لڑکا ہمیں پسند آیا ہے' ہم چاہتے ہیں آج ہی منگنی کی انگوٹھی بھی پہنا کر یہ کھڑاگ بھی ختم کیا جائے۔"

"لیکن ابھی ہم نے لڑکی کہاں دیکھی ہے؟" شبلی نے اس فرمائش سے گھبرا کر کہا تھا۔

"وے شبلی' جوادی! چپ کرو۔" خالہ نے گھرکا' پھر نانی کو مخاطب کر کے بولیں۔

"ہمیں منظور ہے پھوپھی جی! آفتاب اب آپ کا ہے جو جی چاہے سلوک کریں۔"

ان کی فدویانہ مسکراہٹ کو کسی نے نہیں دیکھا۔ سب دم کی حسین گھڑی میں گم تھے۔

کسی منچلے نے ڈیک پر شیلا کی جوانی لگایا اور سماں بندھ گیا۔

رات گئے نانی نے واپسی کا اعلان کیا اور جل کڑھ کے کباب ہونے والے رشتہ داروں نے بھی شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے گھر کی راہ لی۔

☼ ☼ ☼

"جوادی' شبلی! تمہارے گھر سے کوئی عورت نہیں آئی' اپنی دادی سے کہہ دینا میں صبح آؤں گی مجھ کرنے۔"

"اور یہ جو آپ کی برادری کی آئی تھیں مجھے تو ان سے کیا بتانا ہے' کیسے منہ پھلا کر سڑی بجی بیٹھی تھیں۔"

"دفع کرو۔ یہ تو یہیں ہی جل گڑیاں۔ دیکھ لینا حسد کی آگ میں ایک ایک کر کے سب جل مریں گی۔"

"ویسے آپ نے آفتاب کے ساتھ اچھا نہیں کیا' چلو نانی کی تو خیر ہے ایک آدھ سال میں ملک عدم چلی جائیں گی' ہو گئیں تو بھی دماغی طور پر تو ریٹائر ہو جائیں گی لیکن اگر لڑکی بھی مزاجاً "نانی پر ہوئی تو پھر آفتاب کا کیا ہو گا؟"

"وے جل جل۔ مجھے ویسے اگر لڑکی دماغی طور پر کسادی نانی جیسی ہوئی تو بھی کل ختم' آفتاب کچھ جائیداد اپنے نام کرا کے چھٹی کروا دے گا اس کی۔"

"او تو یہ منصوبہ ہے۔" جوادی کا انداز تعریفی تھا۔

"تے ہور' مجھے کیا بدمزاجوں سے رشتے جوڑنے کا شوق ہے۔"

☼ ☼ ☼

آنے والے دنوں میں پورے محلے میں اگر کوئی خبر تھی تو وہ ٹھیکے دارنی کے گھر کی ہی تھی۔

"آج گاڑی آفتاب کو لینے آئی ہے۔"

"واپسی پر لدا پھندا آیا ہے اور پھولے نہیں سما رہا تھا۔"

"آج نانی خود بھی گاڑی میں آئی ہیں اور آفتاب کو ساتھ لے کر گئی ہیں۔"

ویسے تو محلے والے خود ہر خبر پر نظر رکھتے تھے' لیکن اگر بھول چوک ہو جاتی تھی تو خالہ ٹھیکے دارنی خود اطلاع کر دیتی تھیں۔

"نیا گھر بنوا رہے ہیں آفتاب کے لیے۔" اترا کر اطلاع دی گئی تھی۔

"مبارک ہو خالہ!" شبلی کی صبح ابھی ابھی طلوع ہوئی تھی۔ مندی آنکھوں سے خالہ کے چمک دار چہرے کو دیکھا تھا۔

"وہ جوادی کدھر ہے؟ میں نے اسے بھی تو خوش خبری سنانی ہے۔"

"آہو! جوادی تو آفتاب کی آیا الٹی رہی ہے تا کہ اسے خوشی نہیں ہوگی تو پھر کسے ہوگی' جائیں جا کر اطلاع دیں۔" شبلی نے کروٹ بدل لی تھی۔

"لوگوں کے بچے کیسی ترقیاں کرتے ہیں' کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں' تنگ گلی محلوں سے کشادہ سڑکوں والی کھلی کھلی خوب صورت آبادیوں میں بس جاتے ہیں' ایک ہمارے لڑکے ہیں' زبان چلانے کے علاوہ کچھ آتا ہی نہیں ہے۔" جب سے خالہ ٹھیکے دارنی ہو کر گئی تھیں' دادی وقفے وقفے سے آہیں بھر رہی تھیں۔

"دادی! ایسے رشتے ملنے کوئی مشکل تھوڑا ہی ہیں۔ ایک چھوڑ ہزار ملتے ہیں۔" شبلی نے تسلی دی تھی۔

"قسمت والوں کو ملتے ہیں۔" انہوں نے ٹھنڈے موسم کو ٹھنڈی آہ سے مزید برفیلا کیا تھا۔

"آپ کہیں تو میں نانا ماموں کے لیے کوشش کروں' بلکہ آفتاب کی نانی' ساس کو ہی رام کیا جا سکتا ہے' عمر بھی مناسب ہے' دولت بھی بے شمار ہے۔"

دادی سوچ میں پڑ گئی تھیں مگر نانا ماموں کہیں آس پاس ہی تھے' اچھی خاصی کلاس لے ڈالی تھی۔

"اس گھر کے سارے مرد بے وقوف ہیں۔" یہ دادی کی رائے تھی۔

اگلے روز خالہ ٹھیکے دارنی ستاروں کے کام والی گلابی ساڑھی پہنے بالوں میں پھول سجائے چھمک چھلو بنی آئی تھیں۔

"گھر کا سارا سامان بیچ رہی ہوں' ہم تو نئے بنگلے میں

چلے جائیں گے نا! دلہن جہیز میں اتنا سارا اور ایسا قیمتی فرنیچر لا رہی ہے کہ بچی میں تو اس پر بیٹھتے گھبرا رہی ہوں۔ آفتاب کہتا ہے عادت ڈالو اماں! اب تو باقی کی زندگی ایسے ہی فرنیچر کو استعمال کرتے گزرے گی۔"

"خالہ! اتنی جلدی نہ کرو۔ آفتاب کی شادی کے بعد بھی تو فرنیچر بیچا جا سکتا ہے۔"

"رہن دے جوادی! ابھی تو عقل کی بات کر لیا کر۔ (خیالات بدل چکے تھے) شادی کے بعد میں پرانا فرنیچر بیچوں گی؟ بہو کیا پرانے خاندان ہونے کا طعنہ نہیں دے گی؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے خالی ہاتھ لٹکاتی وہاں جائیں تو وہ بھکارن کے لقب سے نواز دے۔"

"وے نہیں وے بڑی ہی اچھی بچی ہے، بڑی فرماں دار، رکھ رکھاؤ والی، باادب، باتمیز۔"

"پھر ایسے لوگوں کے ساتھ رہتے تو آپ کو کافی مشکل پیش آئے گی۔"

"نہیں نہیں، میں نے اب کافی بدل لیا ہے خود کو، انگریزی بھی بولنے لگی ہوں اللہ کے فضل سے۔ وے جوادی! سن میری بات۔ وہ آفتاب کے تایا کی کپڑے پڑے ہوئے ہیں، تم تینوں کا ناپ بھی تھوڑا ایک ہے، تھوڑا فرق ہے۔ خیر شلوار میں نیچے والی لینا۔ بس کسی روز آکے تا اس کے پرانے کپڑے لے جاؤ، بڑا گند پڑا ہوا ہے گھر میں۔"

"نی مطلب کیا ہے تیرا؟ کا میرا بیٹا تیرے اس آدھے پاگل لڑکے کے کپڑے پہنے گا؟ تو شاید بھول گئی ہے میں کون ہوں۔" جوادی کی اماں کا خون کھولا تھا اور خوب کھولا تھا۔

"آہو! جانتی ہوں، ترس ترس کے زندگی گزارنے والی بدنصیب عورت ہے۔"

جوادی کی اماں سے آج تک کہاں کسی نے منہ در منہ ایسی دلیرانہ گفتگو کی کوشش کی تھی۔ کچھ دیر کے لیے تو سکتے میں چلی گئیں۔ جب تک سکتہ ٹوٹا تو تب تک خالہ ٹھیکے والی اگلی پڑوسن کا دل جلانے تشریف لے جا چکی تھیں۔

"تو وے دیکھ وے جوادی! یہ وہ ہی عورت ہے نا جسے نہ کھانے کی تمیز تھی، نا پہننے کا سلیقہ، پر اتنا تو اخلاقی حالت بہتر تھی۔ دولت نے تو اسے دیوانی بنا دیا ہے۔"

جوادی نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔

"صرف دولت ملنے کی امید نے والدہ محترمہ! آنے والا وقت اپنے دامن میں پتھر لے کر آتا ہے یا پھول، ابھی سے کیا معلوم۔"

"آہو! تو بس بیٹھا فلسفے بولتا رہا کر۔ تو نے وے اپنے ابا جی کو کرتی ہوں بات، کریں کسی امیر گھر میں تیرے لیے بھی بات۔"

"والدہ! رحم خدا کے لیے رحم۔ آفتاب کا رشتہ کرانے میں میرا کوئی کردار نہیں ہے، مجھے ایسی بھیانک سزا نہ دیں۔"

"اس گلی کے ایک گھر میں لڑکی دو من سونا پہن کر اترے اور میں کھڑی دیکھتی رہوں، یہ میری برداشت سے باہر ہے۔"

"اچھا تو پھر جب تک وہ لڑکی ادھر گلی میں اتر نہیں جاتی تب تک آپ کسی بھی شر انگیز کارروائی سے باز رہیں گی، وعدہ کریں والدہ!" جوادی وعدہ لے رہا تھا۔ "چل کرتی ہوں وعدہ، پر اس کے بعد مجھ سے کوئی توقع نہیں رکھنا۔"

کچھ ایسی ہی شامت شبلی کی بھی آنے والی تھی۔ دادی کے دانت میں صبح سے جو درد اٹھا تھا تو افاقہ ہونے کے آثار شام تک دکھائی نہیں دے رہے تھے، یوں شبلی چھٹی کی بنسی بجا رہا تھا۔

"یار شبلی! اب تو سوچ رہا ہوں، کیلے کھانا شروع کروں۔"

"سوچنے کی کیا بات ہے، کردو شروع۔"

"پوچھے گا نہیں کہ کیوں؟"

"نہیں۔ کیونکہ مجھے پتا ہے تم نے پوچھے بغیر بھی بتانا ہے۔"

"ہاں ہمیشہ کی طرح تم ایسا سمجھتے ہو میرے ہمزاد! اصل میں میں چاہتا ہوں گلی کو کیلے کے چھلکوں سے

سجاؤں، جب بھی خالہ ٹھیکے والی شوار نے میرے گھر آئیں، راستے میں ہی سلپ ہو کر میرے گھر کے بجائے ستاروں کے گھر پہنچ جائیں یا ہڈی پسلی تڑوا کے اسپتال میں رونق افروز ہو جائیں۔"

"آئیڈیے دونوں لاجواب ہیں۔ بس تم آج سب کیلے کی فصل اجاڑنا شروع کردو۔" شبلی مسکرایا تھا۔

☼ ☼ ☼

مگر کیلوں کی فصل اجاڑنے کی نوبت نہیں آئی، لڑکی کی نانی کو ہیضہ ہوا تو انہوں نے اسے مرض الموت خیال کرتے ہوئے جلد شادی پر زور ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ ادھر نانی ساس کی بیماری کی خوش خبری سن کر خالہ ٹھیکے والی اور آفتاب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ ان کے خیال میں بھی اب نانی کا بچنا محال تھا۔ خالہ نے تو کالے رنگ کا سوٹ سلوا کر اس پر کالے موتیوں کا کام بھی کروا لیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ زور و شور سے بری کی تیاری بھی ہونے لگی تھی، صبح کا ناشتا کر کے ماں، بیٹا بازار کو نکلتے تو شام ڈھلے لدے پھندے تھکے ہارے ہی گھر کو لوٹتے تھے۔

"وے جوادی! اسلم، آفتاب نے تو میرے گھر آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔" "قسم سے ایسے ایسے جوڑے بنائے ہیں بری کے، محلے والیاں دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی، جل جل کر مر جائیں گی۔"

آج کل انہیں جلانے اور مر جانے کے تصور سے ہی بڑی مسرت حاصل ہونے لگی تھی۔

"آفتاب کی دلہن کو بھی ساتھ لے لیا کریں، میرا مطلب ہے وہ اپنی پسند سے خرید لے تو زیادہ بہتر ہے، آخر استعمال تو اسی کو کرنا ہے۔"

"تو بھلا اسے کیا لے کے جانا ہے، تو کپڑوں میں زیادہ دلچسپی نہیں۔ زیور البتہ بہت پسند ہے، سنا ہے مجھے بھی تالی، ساس شادی والے دن پورا سیٹ سونے کا چڑھا رہی ہے۔ میں نے سوچا میں پیچھے کیوں رہوں۔ میں نے بھی وہ گاؤں والی زمین کا ٹوٹا بیچ دیا ہے، دو سیٹ بھاری والے، گجرے، چوڑیاں سب بنوا لیے ہیں، بہو

کے لیے، بیٹا! بھی وے دوں، آنا تو واپس میرے ہی پاس ہے نا! ویسے بھی وہ تو پورا امکان آفتاب کے نام لگا رہی ہیں۔"

"آپ لوگ کم ہی گئے ہیں ان کے گھر، وہ ہی چکر لگاتے رہتے ہیں۔" شبلی کے کہنے کی دیر تھی خالہ برا مان گئیں۔

"تا! اب وچارے ایسے بھی کون سے چکر لگاتے رہتے ہیں، کبھی کبھار آفتاب کو ملنے آجاتی ہے، لڑکی کی ماں تو کبھی نانی۔ اور میں جاؤں بھی کیسے، وہ گھر میں تھوڑا ہی رہتی ہیں۔"

"تو کیا کلب میں بنگ ہوتی ہے ان کی؟" جوادی نے کہہ کر زبان دانتوں تلے دبالی کہ خالہ اڈ عدد براماں گئی تھیں۔

"تم سب محلے والے ایک جیسے ہو، کسی کی خوشی میں خوش ہو ہی نہیں سکتے، وہ عورتیں بھی بزنس کرتی ہیں، مصروف رہتی ہیں۔" ساتھ ہی وضاحت بھی کر دی۔

"پھر تو آپ آفتاب کو امور خانہ داری میں طاق کرنے کی سوچتی ہیں۔"

"آفتاب ... میں خود ... ہو ... لیے کھانے بنایا کروں گی، سب پکانا آتا ہے مجھے۔" انہوں نے فخریہ بتایا۔

☼ ☼ ☼

"وہ جی آفتاب کی اماں کا بس نہیں چلتا گھر کے برتن بھانڈے سب بیچ کے دلہن کے لیے زیور بنوا دے، بہو تو ہو، میری تنخواہ بھی مار لی ہے۔"

اس وقت خالہ کی چھمک چھلو ملازمہ دادی کے پاس بیٹھی خبریں سنا رہی تھی اور گھڑا بھی رو رہی تھی۔

"تیری تنخواہ بھی دبالی۔ دیکھ لینا خدا کا قہر نازل ہوگا۔"

"آہو! یہ تو بڑی اللہ والی ہے نا جو اس کی تنخواہ دبانے سے قہر خداوندی نازل ہوگا۔" جوادی مسکرایا تھا۔

"تو اور کیا! ایک ہی بات ہے انہوں نے دبالی یا تو نے

سلمان خان پر لٹا دی۔" شبلی کو جوادی سے اتفاق تھا۔
"یہ سلمان خان کون ہے؟" دادی کو معلومات میں اضافے کا شوق چڑھا تھا۔
"ہندین فلم ایکٹر ہے۔" جوادی نے بتایا۔
چھمک چھلو اس عرصے میں داغتوں کی نمائش کے دوران شرمانے کا شان دار مظاہرہ بھی برابر کرتی رہی تھی۔
"ہندین فلم ایکٹر تنخواہ لیتاتی ہے پر کیسے؟"
"کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں سو طریقے ہیں رقم برباد کرکے مہینہ قرض پر گزارنے کے۔"
"پھٹے منہ تیرا۔ تو دشمن ملک کے باکڑ بلے پہ فدا ہے۔" دادی ناراض ہوئی تھیں۔
"مخول کر رہے ہیں جی۔ یہ جی میرے ان کو سلمان خان بولتے ہیں' یہ نام بھی ان دونوں نے ہی اس کا رکھا ہے' ورنہ ماں پیو نے تو فیقا رکھا ہے جی اس کا۔"
"بات ہو رہی تھی آفتاب کے امیر و کبیر سسرال کی۔" جوادی نے جان بچانے کو یاد دلایا۔
"بھلی اور آفتاب کی سسرال کو۔ یہ بتاؤ اتنے دنوں سے وہ ساگ والی میں نظر آئی کہ نہیں؟"
"وہی ساگ والی' وہ جو چند سے ساگ لے کے آتی ہے وہ تو گئی۔"
"چلو اٹھو' چل کے برتن دھوؤ اگر یہ پسند نہیں تو میرے کپڑے استری کرو۔ اور خبردار جو دوبارہ سے کچھ بولنے کی کوشش کی۔"
"شبلی صاحب! آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ میں تو یہ بتانے لگی تھی کہ وہ ساگ والی..."
"وہ دیکھو جا کے پانی والی موٹر جل جل کے اب تو کوئلہ ہونے لگی ہے اور میرا خیال ہے تو استری کا پلگ لگا کے ادھر آ بیٹھی ہے۔"
"اچھا جی۔ پتا نہیں مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں ہے خیر دیکھ لیتی ہوں۔"
"ہاں دیکھو جا کے اور اب دوبارہ سے ادھر آنے کی لوڑ نہیں ہے۔ ہم سکوتے گھر نوں جاؤ۔"
"ہاں تو دادی! وہ بات یہ ہے کہ آخری خبریں آنے تک وہ ساگ والی جس کھیت سے ساگ چرا کر لاتی تھی اس کھیت کو آگ لگ گئی تھی گھر کے چ... سے سنا ہے ایسی آگ لگی کہ سرسوں کے ساگ سے سرسوں کا تیل نکل آیا تھا۔ آج کل وہ یہی تیل بیچ رہی ہے۔"
دادی نے سنجیدگی سے شبلی کی بات سنی' پھر فرمایا۔
"مگر سرسوں کو آگ لگنے سے تیل کس طرح نکل آیا ہے؟ تیل سرسوں کو آگ لگا کے تھوڑی نکالتے ہیں۔"
"یہ جدید طریقہ ہے دادی اماں! اس سے تیل کی دگنی مقدار حاصل کی جا رہی ہے۔" جوادی نے تسلی کرائی۔
"ہائے ہائے کیسا ذائقہ دار ساگ ہوتا تھا۔" دادی کو دیر تک قلق رہا۔

☼ ☼ ☼

آفتاب کی شادی کے کارڈ خالہ جھلکے دارنی نے مارے خوشی کے پھولی سانسوں کے درمیان بانٹے تھے۔
"ارے اتنے بڑے لوگ۔ ہمارا تو خیال تھا شادی کا فنکشن کسی بڑے ہوٹل میں ہوگا۔"
اکثریت نے کارڈ لے کر یہی کہا تھا۔ اس بات کا جواب خالہ جھلکے دارنی کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے صرف برا ماننے پر اکتفا کیا' ویسے یہ سب کو بتایا تھا ان لوگوں کو شور شرابا پسند نہیں' اس لیے بارات میں صرف دولہا' دولہے کی والدہ ہی تشریف لے جائیں گے۔
"ہاں جب میں دلہن کو اپنے گھر لے آؤں گی پھر سب آ جانا دیکھنے۔"
"تو یہ کیا بات ہوئی خالہ! برات تو لڑکے والوں کی طاقت ہوتی ہے' ان کی مضبوطی کا اظہار ہوتا ہے۔"
"تا وہاں کیا ریسلنگ ہونی ہے جو طاقت اور مضبوطی کا اظہار ضروری ہے۔ عجیب محلے والے ہیں' کسی کی خوشی میں خوش ہی نہیں ہوتے۔"

مہندی کے روز سارا محلہ مدعو تھا۔ جھلکے دارنی نے ڈھولکی بجانے کو کہا تھا۔ مگر دادی کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ڈھول وغیرہ تو میراثی بجاتے ہیں' تم ڈھول بجاتی ہو' کہیں تم ... میراثی ہو' ابھی خبردار جو ڈھولک کے قریب بھی گئے' یہ جو پھو باندری اترائی اترائی پھر رہی ہے' آپ ہی بجائے ڈھول۔"
خیر محلے کی لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال لی تھی۔ رات گئے تک رونق لگی تھی۔
"خالہ! دلہن کا سامان کب آئے گا؟" کسی نے پوچھا تھا۔
"سامان اس چھوٹے دان میں کیوں آنے لگا۔ اتنی بڑی کوٹھی ہے لڑکی کی' وہ ہری سجا یا ہے سب۔"
"تو ہم کیسے دیکھیں گے خالہ؟" عورتوں کو صدمہ ہوا تھا۔
"میں بھی تو ادھر جا رہی ہوں' پھر بلواؤں گی تم سب کو۔" تسلی دی تھی۔
آفتاب میں اب کافی اعتماد دیکھا جا سکتا تھا اور غرور کی جھلک بھی اس کے ہر ہر انداز میں تھی۔
مہندی کا فنکشن رات گئے اختتام کو پہنچا' صبح ... سارا محلہ سوتا رہا تھا نہیں ... آفتاب ... کے ساتھ مختصر ترین بارات لے کر روانہ ہو گئیں۔ شام کو اکیلی گھر آئی تھیں کہ آج آفتاب کی سہاگ رات بھی وہ ادھر دلہن کے گھر میں ہی رک گیا تھا۔
سب دستور محلے والیوں نے اس بات کو سراسر غلط قرار دیا تھا۔ اور خالہ نے سخت برا ماننے کے ساتھ ساتھ انہیں غریب گنوار عورتوں کے لقب سے نوازا تھا۔
"تم چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہنے والیاں' تمہیں کیا پتا زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔"
"چلو آفتاب تو دلہن کے بنگلے میں پہنچ گیا ہے نا!"
جوادی نے جیسے اس بات پر سکھ کا سانس لیا تھا۔
"ویسے اس لڑکی کی نانی بڑی خرانٹ ہی ہے۔"
ایک عورت نے تبصرہ کیا اور خالہ چراغ پا ہو گئیں۔
"نی بس کرنی' ایسے ہی وچاری کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ کچھ لوگ اوپر سے اخروٹ کی طرح سخت' اندر سے نرم ہوتے ہیں' یہ وہ نانی بھی ایسی ہیں' شادی کے روز بچہ بچہ جا رہی تھیں' بتا رہی تھیں' میرے لیے پورے چھ تولے کا سیٹ بنوایا ہے۔ جلدی میں اس روز لانا بھول گئے تھے' اب کہہ رہی تھیں جلدی مل جائے گا' مجھے' اچھا تم لوگ اب چلو' صبح ولیمہ ہے' تیاریاں کرو جا کے' سنو' اچھے اچھے کپڑے پہن کر آنا' دلہن والوں کے سامنے بے عزتی نہ کرانا میری۔"
مگر ولیمہ کے فنکشن کی نوبت نہیں آئی۔ آفتاب صاحب آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات لیے اکیلے ہی صبح سویرے منہ اندھیرے لوٹے تھے کہ لڑکی اور اس کی نانی مع سب لوٹ لاٹ پتا نہیں رات کے کس پہر فرار ہو گئی تھیں۔
"ہائے میرا لاکھوں کا زیور' میں نے تو بنگلے کے لالچ میں پرکھوں کی زمین بیچ دی تھی۔"
"گھبراؤ نہیں خالہ! یہ بھی شاید نئے زمانے کا انداز ہے۔" تسلی کی بات پر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھیں۔
"ہائے کیسے پتھر پڑ گئے تھے آنکھوں پر' ان کی جھوٹی باتوں پہ اعتبار کیا میں نے۔"
"چوتھے دن ابھی وہ حالت سوگ میں تھیں کہ پتا چلا بنگلے کا مالک ... کرایہ وصول کرنے ان کے دروازے پر آیا ہے۔"
"ہوئے جوادی! اوئے شبلی! بیچ کر ... لگا دان دونوں کا میرا لاکھوں کا زیور لے اڑی ہیں۔ نکاح نامہ بھی ان کے پاس ہے' کسی وقت بھی کچھ کر سکتی ہیں۔"
آفتاب صاحب بھی اب کانپ رہے تھے۔
"یہ سب تمہارے لالچ کا نتیجہ ہے' تم ماں بیٹے لالچ میں اندھے ہو رہے تھے' یہ میرے بچے دیکھو کیسے صابر و شاکر ہیں' بالکل مجھ پر گئے ہیں۔"
دادی کی بات پر جو مسکراہٹ اڈی وہ دونوں اسے روک نہیں سکے' ایک ہی طریقہ تھا یہاں سے شکل گم کر لی جائے اور گھر کے باہر کی راہ لی جائے' ویسے بھی مسز اللہ رکھا کی آمد کا ٹائم ہونے کو تھا۔

☼

لبنیٰ شہزادی

پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ گہری سوچوں میں گم تھے۔ ان کی نظریں ——— سامنے رکھی میز پر پڑی فائل پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ کے کئی افسر اوپر کی کمائی سے نہ جانے کہاں سے کہاں تک جا پہنچے تھے۔ اور وہ اپنی نیکی، شرافت اور اصولوں کی پاس داری کرتے ہوئے آج تک اسی سیٹ پر تھے۔ لیکن اب وہ تھک چکے تھے، وہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے بچے اعلا تعلیمی اداروں میں پڑھیں۔ جب امیر گھرانوں کے لڑکے لڑکیوں کو بے فکری سے پیسہ اڑاتے دیکھتے تو ان کے دل میں بھی حسرت جاگتی ہم کاش! وہ بھی اپنے بچوں کو وہ آسائش زندگی ——— سکتے۔ اسی طرح کی کئی فائلیں ان کے پاس پڑی ہوئی تھیں۔ جو انہیں کہاں سے کہاں پہنچا سکتی تھیں۔ بس ایک ہلکی سی جنبش کی ضرورت تھی۔ ایک سائن کی اور وہ منٹوں میں فرش سے عرش تک پہنچ جاتے۔ لیکن ان تمام فائلوں سے زیادہ آج کی فائل پرکشش تھی۔ کہ معاملہ ان پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ جتنے چاہیں مانگ لیں۔ انہوں نے کئی بار کی پڑھی فائل دوبارہ کھولی۔

نام! "حسام"

عمر! "بچیس سال"

ولدیت! "محمد رمضان"

پیشہ! "ایک معمولی کلرک۔"

"ایک بیٹا جو حال ہی میں جرنلزم کے شعبے میں گیا ہے۔"

"جرم؟ بڑے چوہدری کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اس کا کیا کرنا ہے؟"

"ہمیں پولیس مقابلے میں ختم ہوئی آواز کو دبا دیں تاکہ کوئی دوسرا یہ جرأت نہ کر سکے۔" "اور کیا کرنا ہے" فائل لانے والا خباثت سے مسکرایا تھا۔

انہوں نے ایک گہرا سانس بھرا۔ فائل بند کر کے پرے کھسکا دی، اردلی کو آواز دینے لگے۔

"جی سر!" ایک بانس کی طرح لمبا شخص اندر داخل ہوا اور سلیوٹ مار کر پوچھنے لگا۔

"ایک حسام نامی لڑکا ہے علاقے کی چھوٹی جیل میں "اسے یہاں لے کر آؤ۔"

"یس سر!" وہ ایک بار پھر سلیوٹ مار کر باہر چلا گیا۔

اور پھر جب حسام نامی لڑکے کو ان کے سامنے لایا گیا تو وہ حیران رہ گئے۔ بالکل ان کے بیٹے کی شباہت ہے اونچا لمبا گورا سا حسام جسے "مار مار کر" شکل سے بد شکل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ نجانے کیوں اسے دیکھتے ہی انہیں اپنا بیٹا یاد آیا، جو کہ آج کل کمپیوٹر سائنس میں اعلا تعلیم حاصل کرنے کی خاطر انٹری ٹیسٹ کلیئر کرنے کے لیے جان توڑ محنت کر رہا تھا۔

"اسے مارا کیوں ہے؟" احسان الحق نے درشتی سے اسے دائیں بائیں سے پکڑے دو اردلیوں سے پوچھا۔

"چوہدری کا حکم ہوگا اس لیے تو انہوں نے مارا ہے۔ بھلا کوئی چوہدری کا حکم ٹال سکتا ہے۔" جواب ان دونوں کے بجائے حسام نے انتہائی تلخ لہجے میں دیا تھا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے اور ایک بار پھر انہیں اپنا بیٹا یاد آگیا۔

"تم دونوں جاؤ۔" انہوں نے سر کو جھٹکتے ہوئے کسی سوچ سے پیچھا چھڑا کر دونوں اردلیوں کو حکم دیا۔ وہ ایڑیاں بجاتے وہاں سے چلے گئے۔

"حسام بیٹا! تم یہاں بیٹھو۔" وہ حسام کو سامنے بٹھا کر اپنی کرسی کو آگے کھینچ کر سرگوشیوں میں اسے نہ جانے کیا سمجھانے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

اسی شام کو جب وہ گھر جا رہے تھے۔ تو وہ حسام اور اس کے گھر والوں کو ایک محفوظ مقام تک پہنچا آئے تھے۔ جہاں چوہدریوں کی رسائی ناممکن تھی۔ انہیں اب پتا چلا تھا کہ حسام کو دیکھتے ہوئے انہیں اپنا بیٹا کیوں یاد آتا تھا۔ کیونکہ ان کا بیٹا بھی حسام کی طرح جوشیلا اور حساس تھا۔ ان کا بیٹا بھی تو اسی طرح بے خوف ہو کر نظام بدلنے کی باتیں کرتا تھا اور اگر اسی طرح کل کلاں کو یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کا خمیازہ انہیں بھگتنا بھی پڑ سکتا ہے۔ لیکن اپنے ضمیر کے اس فیصلے پر وہ بہت مطمئن ہو کر گھر کی طرف رواں دواں تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ ابھی گھر میں داخل ہوتے ہی تھے کہ ان کی چھوٹی بیٹی خوشی سے چہکتا چہرہ لیے ان کی طرف بڑھی۔

"ارے میرا بیٹا اتنا خوش کیوں ہے؟" انہوں نے اپنا بازو پیار سے اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے پوچھا۔

"پاپا! سنیں گے تو آپ بھی خوشی سے جھوم اٹھیں گے۔ سنئے ہماری بھی سن لی۔"

"ارے بیٹا! کچھ بتاؤ گی بھی۔"

"یہ تو ایسے ہی کرتی رہے گی پاپا! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ خوشی کی خبر کیا ہے۔" جنید نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"پاپا! انہوں نے جو انٹری ٹیسٹ دیا تھا" اس میں میرا نام آگیا ہے۔ آپ کے بیٹے نے ٹاپ کیا ہے پاپا!" جنید کا چہرہ خوشی جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

"واقعی!" ایک دم جیسے ان کا دل بے طرح خوشی کے احساس سے بھر گیا۔ انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر جنید کو گلے لگا لیا ——— اور مسکراتے ہوئے اپنی شریک حیات کو دیکھا جس نے قدم قدم پر ان کا ساتھ نبھایا تھا۔ وہ طمانیت بھرے انداز میں مسکرا کر ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنی آنکھوں میں نمی لیے ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور نفل ادا کرنے چل دیے۔ وہ اپنے پاک رب کا شکر ادا کرنا چاہتے تھے اس رب کا جس نے انہیں یقیناً" آزمائش میں ڈالا تھا اور وہ اپنے پاک رب کی آزمائش پر پورا اترے تھے۔

☆

مترجمہ: شبانہ حمید

اک عمر کا عنواں کوئی نہیں

"کہتے ہیں۔ زلزلے میں پاکستان کے لوگوں نے دل کھول کر مدد کی۔ کسی نے کہا کہ کراچی نے بڑے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا۔

یہ جملے کس کے لیے تھے۔ میرے ملک کے لوگوں کے لیے نا؟ میں آج بھی اقبال کا شعر یاد کرتی ہوں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"

وہ آہستہ آہستہ اقبال کے شعر پڑھنے لگیں۔ اور میں صرف آنکھیں کھولے انہیں دیکھتا رہا۔

ہم ساری دنیا کا علم حاصل کر لیتے ہیں اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہماری ماں کتنی قابل ہے۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔

جب سے گیارہ ستمبر کا واقعہ ہوا تھا۔ حالات اتنے عجیب ہو گئے تھے کہ اب ہم لوگ نہ مسلمانوں کی بات کرتے تھے۔ نہ پاکستان کی۔ اور کیا بات کرتے کہ خود اپنے سائے پر بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔

ہمارے ڈپارٹمنٹ ہی میں ایک لڑکی عائشہ کا مقدمہ عدالت تک میں چلا گیا تھا۔ میں اسے اتنے اچھے طریقے سے نہیں جانتا تھا۔ ہاں کبھی کبھار ہیلو ہائے ہو جاتی تھی۔

وہ مسلمان لڑکی تھی۔ شاید اس کا تعلق ترکی سے تھا۔

حجاب لینے کے مسئلہ پر اس کا معاملہ عدالت تک چلا گیا تھا۔ اسے کالج بھی چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹی۔

پریشانی نہیں ہوگی۔"

"بس رہنے دیجیے۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "جس طرح آپ نے میری پرورش کی ہے مجھے یوں بھی یہاں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی۔ وہ جو پھوپھو ہیں نا وہ بالکل آپ کی کاپی ہیں اسی طرح خیال رکھتی ہیں اور اسی طرح ڈانٹتی ہیں۔ جیسے آپ ڈانٹتی ہیں۔"

"اور انکل؟" میں پھوپھا کو انکل ہی کہتا تھا۔ "وہ کیسے ہیں؟" ان کے سوال پر میں چپ ہو گیا۔ ظاہری بات ہے جس بات کے متعلق آپ کو خود کچھ پتا نہ ہو اس کے بارے میں آپ کیا کہہ سکتے ہیں۔

اس ایک ہفتہ میں میری ان سے صرف ایک دفعہ رات کھانے پر ملاقات ہوئی تھی۔ اور اس ایک ملاقات میں بھی میرے ذہن پر ان کا کوئی اچھا تاثر نہیں پڑا تھا۔

وہ جس طرح گھر کی ملازم لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے اسے دیکھ کر ہی مجھے بڑا عجیب سا احساس ہوا حالانکہ میرے دل نے کہا بھی کہ یہ کام تو خضر صاحب آپ بھی کرتے ہیں۔ لیکن میں نے دل کو سمجھایا کہ میں خوب صورت چہروں کو دیکھ کر صرف سراہتا ہوں انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کھانے کی کوشش نہیں کرتا ہوں۔

اور جس وقت ڈائننگ ٹیبل پر یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں نے نور العین کے چہرے پر کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کیونکہ پھپھو معذوری کی وجہ سے بستر پر تھیں۔ نیلی تو اپنے نام اور شکل کی طرح الہڑ اور معصوم تھی۔ پھر صرف نور العین ہی بچ جاتی تھی۔ اور جانے کیوں مجھے اس کی شکل دیکھ کر ہی لگا تھا کہ وہ اپنے باپ کی عادات و اطوار سے آگاہ ضرور ہے۔ مگر لب کشائی کی جرأت نہیں ہے۔ اور بعد میں میرے سارے اندازے صحیح ثابت ہوئے۔ سوائے اس ایک اندازے کہ نور العین میں جرأت اور حوصلے کی کمی ہے۔

اس میں جرأت بھی تھی اور حوصلہ بھی۔ لیکن یہ اور بات کہ انکل کے سامنے بھی بولتی نہیں تھی۔

بولتی تو خیر وہ میرے سامنے بھی نہیں تھی۔ لیکن کبھی میں خود ہی اسے اتنا پریشان کر دیتا کہ پھر وہ بول کر لڑائی تو ہو ہی جاتی تھی۔ نیلی کہتی تھی۔

"خضر بھائی! سچ بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ کے پاکستان آنے کی جتنی خوشی مجھے ہے۔ اتنی تو کسی کو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ سچ میں یوں سارا دن چپ رہ رہ کر بور ہو جاتی تھی۔ نور بھی اتنا کم بولتی ہے۔ لوگ اتنا کم کیسے بول لیتے ہیں۔ چپ رہنے سے کتنی بوریت ہو جاتی ہے۔ آپ بتائیے میں صحیح کہہ رہی ہوں یا نہیں؟"

"تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو بابا!" میں اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیتا۔

"بولنے کے علاوہ بھی دنیا میں دوسرے بہت سارے کام ہیں۔ بہتر ہے کہ کبھی ان کو بھی کر لیا جائے۔"

☆ ☆ ☆

محبت اوس کی صورت
محبت کے دنوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے
کسی فردوس کی صورت
محبت درد کی صورت
گزشتہ موسموں کا استعارہ بن کر رہتی ہے
شبانِ ہجر میں کوئی ستارہ بن کر رہتی ہے
محبت ان کو بھی آباد اور شاد کرتی ہے
جو دل ہیں قبر کی صورت

یہاں تک پہنچ کر میں رک گیا۔ میں نور العین کے کمرے میں کسی کام سے آیا تھا۔ ایک دم یونہی نظر ڈریسنگ ٹیبل پر چلی گئی۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اسے میں نے زیادہ تر انگریزی کی چیزیں پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر ایسی شاعری لکھنا اور پسند کرنا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم نیلی نے جھپٹ کر ڈائری بند کر دی۔

"آپ کو کوئی کام تھا خضر بھائی؟"

"مجھے نور العین سے کام تھا۔ یونہی نظر پڑ گئی تھی لیکن تم تو بہت خوش رہنے والی لڑکی ہو۔ ایسی شاعری

کیسے پسند کرتی؟"

محبت ان کو بھی آباد اور شاد رکھتی ہے
جو دل ہیں قبر کی صورت

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے خضر بھائی! جو لوگ خوش نظر آتے ہیں کیا واقعی دل کی خوشی ان کے چہرے پر بھی نظر آتی ہے۔ کبھی غور سے دیکھیے گا۔"

"یہ پاکستان ہے۔ غور سے دیکھنے پر جوتے بھی پڑ سکتے ہیں۔"

"بس بس رہنے دیں۔ جوتے کھانے والی شکلیں اور ہوتی ہیں۔" نیلی نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی وقت نور العین بھی آ گئی۔

اس نے ہنستی ہوئی نیلی پر ناگوار نظر ڈالی۔ نیلی ایک دم چپ ہو گئی۔

"پڑھنے میں تمہارا دل نہیں لگتا جب دیکھو کسی نہ کسی بات پر قہقہے لگ رہے ہیں۔"

"تو بھی اب۔ پہلے تو اس حویلی میں صرف آتو ہی بولتے تھے۔" نیلی نے بالوں کو پیچھے کی طرف کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"نیلی بے چاری پر غصہ ہو رہی ہو۔"

"آپ نہیں سمجھتے خضر صاحب!" اس نے تیکھی نظریں میرے اوپر ڈالیں۔ "میں اسے بچانا چاہتی ہوں۔"

"کس سے؟" میں نے کمرے میں حیرت سے نظر ڈالی۔ "یہاں تو کوئی بھی خطرناک چیز نہیں۔ کیوں نیلی کیا تمہیں تمہارے کمرے سے سانپ نکلتے ہیں؟"

میں نے اس کی بات مذاق میں ختم کرنا چاہی۔ مگر وہ ایک دم سے پھٹ گئی۔

"سانپ ہمارے آس پاس ہی رہتے ہیں۔ تم بھی محسوس کرنا خضر! ان کی سرخ سرخ آنکھیں اور ان کے بدصورت دھبے ہوتے ہیں۔"

اس کے چہرے کا جیسے سارا تاثر ہی بدل گیا تھا۔ نیلی نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈالا اور اس کے منہ سے لگایا۔

میں خود اس سچویشن کے لیے تیار نہیں تھا اور نہ

مجھے یہ ساری بے ربط گفتگو سمجھ میں آئی تھی۔ لیکن کمرہ ایک دم چھوڑ کر جانا بھی بد اخلاقی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نارمل ہوئی تو میں باہر نکل آیا۔ لیکن باہر آ کر بھی میرا ذہن بوجھل رہا۔

اس حویلی میں دو عورتیں رہتی تھیں۔ اور دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر تھیں۔ یہاں کچھ عجیب ہی تھا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ پھر کسی کا فون آ گیا۔ تو ذہن کچھ فریش ہوا۔

دوسرے دن شام کو میری ملاقات نور العین سے ہوئی تو وہ وہی نور العین تھی جسے میں جانتا تھا۔ اس نے کم از کم ایک گھنٹہ تک بحث کی۔

اس کی معلومات قابلِ رشک حد تک اچھی تھیں۔ یا پھر لڑکیوں کا ذہن ہوتا ہی اچھا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات نیلی بھی ایسی باتیں کر جاتی تھی پھر وہاں لندن میں عائشہ بھی۔ بڑی ذہین و فطین تھی۔ ہمیں لڑکیوں پر حیرت ہوتی تھی کہ ان کے پاس اتنا وقت کہاں سے آ جاتا ہے کہ نصاب کے علاوہ بھی دوسری کتابیں چاٹ جاتی ہیں۔

اور عائشہ چہکتی ہنس کر کہتی کہ "تم نہیں جانتے خضر! لڑکیوں کے پاس جادو ہوتا ہے جادو۔" میں تو ہنس کر ٹال دیتا۔ لیکن آج اگر عائشہ مجھے مل جاتی تو میں اسے ضرور بتاتا کہ واقعی لڑکیوں کے پاس جادو ہوتا ہے۔

میرے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی جس کے خوب صورت سنہری بال۔ اس شام کی دھندلی روشنی میں بھی چمک رہے تھے۔ اس کے گالوں میں پڑنے والا ڈمپل۔۔ وہ بالکل پھپھو کی کاپی تھی۔

"تم اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں۔ کچھ نہیں۔" میں ایکدم شرمندہ ہو گیا۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ ہنس پڑی۔

"سچ بتاؤ خضر! تم لندن ہی سے آئے ہو نا؟"

"کیوں بھئی؟"

"کوئی چیز ہے جو مجھے پریشان کرتی ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح بتاؤں۔"

"کیا میرے بارے میں؟" مجھے حیرت ہوئی۔

"ہمم۔" اس نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔ حالانکہ شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ انسان کسی کے متعلق بھی اپنی رائے کا آزادی سے اظہار کر سکتا ہے۔ جس معاشرے سے میں آیا تھا' وہاں یہ بات بالکل بھی معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن ممی صحیح کہتی تھیں کہ پاکستان تو پھر پاکستان ہے۔ یہاں لوگ اپنے جذبوں میں بڑے شرمیلے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی شرمندگی دیکھ کر میں نے بات بدل دی۔

"چھوڑو کوئی دوسری بات کرتے ہیں۔"

"کیا بات کریں؟" اس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں جیسے ساری رات اتر آئی۔

"خضر! میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ میں ساری دنیا کے کام آؤں۔ یا کچھ ایسا کروں کہ لوگ مجھے ہمیشہ یاد رکھیں۔"

"تمہیں کیا پتہ لوگ ابھی بھی تمہیں کتنا یاد رکھتے ہیں۔" میں نے شرارت سے کہا تو اس نے اپنی خوب صورت ناک سکوڑی۔

"تم کبھی سیریس نہیں ہوتے؟"

"آج کل تو بہت رہنے لگا ہوں۔" میں اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگا۔ اس کا من اور اپنا دل بہلانے کو۔

اسی وقت حشمت انکل بھی وہیں آکر بیٹھ گئے۔ میں ایک دم سے خاموش ہو گیا اور خود نورالعین کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔ اس کی پیشانی پر واضح طور پر ناگواری کی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ انہوں نے کچھ دیر تک احوال پوچھا پھر اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ وہ پہلے بھی صحیح آدمی نہیں لگے تھے۔ اور ان سے باتیں کر کے پتہ چلتا تھا کہ وہ واقعی صحیح آدمی نہیں ہیں۔ وہ بہت فضول قسم کی باتیں کرتے تھے۔ اور مجھ سے یوں مخاطب ہوتے جیسے میں ان کی عمر کا ہوں۔ حالانکہ لندن میں پاپا بھی دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ بہت سارے لوگ ہم لوگوں کو باپ بیٹا کے بجائے دوست ہی سمجھا کرتے تھے۔

لیکن یہ حضرت۔ یہ تو کسی خانے میں بھی فٹ نہیں بیٹھتے تھے۔ حتیٰ کہ میرا دل تو انہیں انکل [illegible] بھی نہیں چاہتا تھا۔

اسی وقت نیلی بھی اندر سے نکل آئی۔

"میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں خضر بھائی؟" اس نے آہستہ سے کہا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" میں نے جلدی سے کرسی آگے کی۔

پھر میں نے نورالعین کی پیشانی چیک کی۔ وہاں اب دو کے بجائے تین لکیریں تھیں ناگواری کی۔ گویا میرا اندیشہ صحیح تھا۔ وہ نیلی کو پسند نہیں کرتی تھی مگر کیوں؟ مجھے حیرت ہونے لگی۔ جہاں تک میرا خیال تھا۔ وہ نرم و نازک جذبوں والی لڑکی تھی۔ جس میں ایک شاہانہ تمکنت تو بہرحال موجود تھی۔ مگر اسے غرور نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اور نیلی۔ تو وہ پھر خود اتنی اچھی تھی کہ اس سے کوئی چاہ کر بھی نفرت نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن یہ ساری کہانیاں مجھے کون سناتا کہ اس حویلی میں کون سے آسیب ہیں۔

لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا تھا کہ نورالعین مجھے [illegible] اداس نظر نہ آئے۔ اور یہ صرف دل کی خواہش [illegible] ظاہر ہے مجھے ایسا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

کہ میں ان اداس آنکھوں کی جوت کو خوشیوں میں بدل دوں یا کہیں سے کوئی خوشی ڈھونڈ لا کر اس کی ہتھیلیوں پر دھر دوں۔

رات ہی کو ممی سے بات ہوئی تھی۔ ابھی بھی ان کے آنے میں پانچ چھ مہینے باقی تھے۔ باقی یہ کہ میں یہاں اور کسی کو نہیں جانتا تھا۔ حالانکہ انہوں نے ایک دو اور رشتہ داروں کے بارے میں بھی کہا تھا کہ موقع ملے تو چلے جانا لیکن خود مجھے ہی بڑا عجیب سا لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے نیند آرہی ہے۔ آج آفس میں کام بھی بہت تھا۔"

اس کی خوب صورت سنہری آنکھوں میں اب جھنجھلاہٹ تھی۔

"جناب تمہاری مجبوری نہیں ہے۔ پھر اسے اتنی باقاعدگی سے کیوں نبھا رہی ہو۔"

"اس حویلی سے فرار کے لیے۔" اس کا لہجہ صاف اور سادہ تھا۔ "ورنہ اپنی ماں کی طرح میں بھی یہیں گھٹ کر مر جاؤں گی۔"

"لیکن وہ زندہ ہیں۔"

"آپ نے شاید زندہ لوگ دیکھے نہیں ہیں۔" اس کے لہجے میں دوبارہ تلخی سی آگئی۔ حالانکہ اس تلخی میں کہیں بھی قصور وار میں نہیں تھا۔ لیکن وہ ایک دم سے اس طرح بھڑک اٹھتی تھی کہ میں کچھ کہتے کہتے بھی چپ ہو جاتا تھا۔

"بہرکیف پھپھو تمہاری وجہ سے پریشان رہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گھر سے باہر کی دنیا بہت خراب ہے۔ اور تم میں شاید بہت زیادہ عقل نہیں۔"

"بہت خوب۔" وہ ایک دم ہنسنے لگی۔ اور ہنستے ہوئے جیسے اس کے چہرے کا سارا تاثر بدل گیا۔ شاید اسے یہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ ہوا تھا اور اس ایک گھنٹے میں میں نے اس کا تیسرا روپ دیکھا تھا۔

"ایک بات کہوں؟ آپ برا تو نہیں منائیں گے۔ آج بہت عرصے کے بعد کسی نے کہا ہے ورنہ آپ نے میرے بیٹھنے کی اور باقی باتوں کی کیسی کیسی [illegible]"

"مطلب؟" میں کچھ نہیں سمجھ پایا۔

"مطلب؟" وہ ایک دم پھر کرسی میں پیچھے چلی گئی۔ "میرا مطلب ہے کہ ایسے ہی ہنسا جاتا ہے۔ لوگ اسی طرح ہنستے ہیں۔" اب میں اس کا جو تھا روپ دیکھ رہا تھا۔ جس میں دیوانگی کی جھلک بھی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں ممی ہوتیں تو ان کا کیا ری ایکشن ہوتا۔

"وہ کیسے پاگل سمجھتیں؟ مجھے۔ مجھے دنیا میں اور کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ یا پھر نورالعین کو۔"

لیکن خیر۔ ابھی میرے پاس چار مہینے باقی تھے۔

☼ ☼ ☼

میں نیلی سے باتیں کر رہا تھا بلکہ باتیں کیا کر رہا تھا۔ موسم کی خوب صورتی ہی میں کھویا ہوا تھا۔ یہ بارشوں والا موسم تھا۔ رات ہلکی پھلکی بارش ہو چکی تھی۔

"یہ موسم آپ کے لیے تو کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہو گا خضر بھائی!" نیلی نے معصومیت سے پوچھا۔

اس کی بہت ساری باتوں میں معصومیت ہوتی تھی۔ ایک عجیب سے سادگی۔

"تمہیں ایسا خیال کیوں آیا؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اس لیے کہ جہاں سے آپ آئے ہیں۔ وہاں تو ہر وقت ہی ایسا موسم رہتا ہے۔"

"لیکن نیلی! وہاں کبھی ایسا فیل نہیں ہوا۔ لوگ پریکٹیکل ہوتے ہیں۔ موسم کی خوب صورتی کی طرف ان کا دھیان کم ہی جاتا ہے اور ویسے بھی خوب صورتی کا احساس مجھے پاکستان ہی میں ہوا ہے۔" میری نظریں نورالعین کے کمرے کی جانب اٹھیں اور پھر پلٹ آئیں۔

وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "مجھے سب خبر ہے۔"

"کس بات کی لڑکی؟" میں نے اس کے سر پر چپت ماری۔

"اس بات کی خبر کہ زندگی کچھ لوگوں پر بڑی مہربان ہے۔"

"اور میرا خیال ہے کہ زندگی تو مہربان ہی ہوتی ہے۔ یہ ہم لوگ ہوتے ہیں۔ جو اسے تلخ بناتے ہیں۔ کبھی اپنی نفرتوں سے اور کبھی اپنی عداوت سے۔"

"ایسا نہیں ہے۔ آپ نے مجھے دیکھا ہے۔ میں کسی سے نفرت نہیں کرتی۔ مجھے زندگی سے زندگی کی سب چیزوں سے بڑا پیار ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تب ایک دفعہ..." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"آپ کے پاس ٹائم ہے۔ ایسا نہ ہو آپ کہیں کہ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہوں؟"

"نہیں تم کہو مجھے اچھا لگتا ہے۔"

میرے سارے دوستوں نے جلوس نکالا۔ احتجاج کیا' ہائیڈ پارک جاکر تقریریں کیں۔ سب ہی کچھ کرلیا۔ صالح تو زخمی بھی ہوگیا۔ عبداللہ کو بھی ٹارچر کیا گیا۔ حالانکہ صرف ایک سال پہلے تک ان سب باتوں کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ مسلمان اتنے عرصہ سے یہاں رہتے چلے آرہے تھے۔

عدالت نے فیصلہ عائشہ کے خلاف دیا۔ ظاہری بات ہے ان کا ملک تھا۔ اس دن امی کے ساتھ مجھے بھی پاکستان بہت یاد آیا۔

عائشہ کا جس دن کالج میں لاسٹ ڈے تھا۔ وہ ہم لوگوں سے ملنے آئی۔ اس نے عبداللہ' صالح سب ہی کا شکریہ بھی ادا کیا۔ پھر وہ چلی گئی۔

اس کا تعلیمی سال ضائع ہوا یا پوری پڑھائی ہی ختم ہوئی۔ ہمیں اس کے بارے میں پھر کوئی اطلاع نہیں ملی۔

بس مجھے اس کی آنکھیں یاد رہ گئیں۔ جو اس دن بھی مسکرا رہی تھیں۔ باوجود اس کہ ہم سب اداس تھے۔

اور پھر وہ آنکھیں مجھے اکثر ہی بے موقع یاد آجاتیں۔ کبھی یونہی پڑھتے ہوئے' کمپیوٹر پہ کوئی کام کرتے ہوئے یا کچھ نہیں تو کوئی گیم کھیلتے ہوئے ایسا کیوں تھا؟

میں خود نہیں جانتا تھا۔ شاید اچھے لوگ ہمیشہ ہی یاد رہ جاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اس کے بعد یہ خلیج بڑھتی گئی۔ اور جس دن حمزہ سعید کو گرفتار کیا گیا اس دن امی نے کہہ دیا کہ بس اب پاکستان جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔

پاپا بھی کاروبار وائنڈ اپ کرکے پاکستان ہی آجاتے۔

لیکن ظاہری بات ہے۔ یہ سارے کام کوئی ایک یا دو دن کے تو نہیں تھے کم از کم پورا سال لگتا۔ پچھلے سارے کنٹریکٹ ختم کرنے میں تو امی نے مجھے فوراً پھپھو کے پاس رہنے کا مژدہ سنادیا۔

"کوئی مسئلے والی بات ہی نہیں۔ اکلوتی پھپھو ہیں وہ تمہاری اور پھر بہت پیار کرتی ہیں۔"

"پیار کرنے کا یہ مطلب کہاں ہے کہ میں ان کے سر پر سوار ہوجاؤں۔ بس میں ہوٹل میں رہ جاؤں گا۔"

"چلو جیسی تمہاری مرضی لیکن تمہاری پھپھو راضی نہیں ہوں گی۔"

"بات صرف پھپھو کی نہیں۔ وہاں انکل بھی تو ہوں گے۔ انہیں آخر اپنی بیگم کے بھتیجے سے کیا دلچسپی ہوگی؟"

"بہت دماغ کھاتے ہو۔" امی جھنجلا گئیں۔

"بس۔ ابھی تو فی الحال جانے کی تیاری کرو۔ پھر یہاں واپس آجانا۔ اگر حالات صحیح ہوئے تو جس کی امید اب کم ہوگئی ہے۔"

یوں میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔

امی نے پھپھو کو میرے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ خود تو نہیں آئی تھیں۔ مگر ایک عدد ڈرائیور ضرور موجود تھا۔ امی اس ناقدری پر تھوڑا سا اپ سیٹ بھی ہوا لیکن مجھ میں برداشت بھی بہت تھی۔

ڈرائیور گاڑی سے یہ اندازہ تو ہوگیا کہ پھپھو کافی امیر خاتون ہیں۔ لیکن مجھے یہ پتہ نہیں تھا۔ کافی امیر ہوں گی۔

اور جس وقت میں نے پھپھو کی حویلی دیکھی۔ میں تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ ہم لندن میں ایک اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ لیکن اس حویلی کو دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا۔ کہ میں نے چھوٹے' بلکہ بہت بہت چھوٹے سے گھر میں اب تک کی زندگی گزاری ہے۔

حویلی باہر سے مکمل طور سے مشرقی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اور اندر اس کا تاثر مغربی انداز لیے ہوئے تھا۔

میں ابھی تک سچ مچ اتنا حیران تھا۔ کہ پھپھو سے بھی اچھے طریقے سے نہیں مل سکا۔ امی صحیح کہتی تھیں کہ پھپھو بہت خوبصورت خاتون تھیں۔ اس کا اندازہ نورالعین کو دیکھ کر بھی ہوجاتا تھا۔ وہ بالکل پھپھو کی طرح تھی اس کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں لگ رہا تھا جیسے وہ جیسے کوئی موم کا مجسمہ کے جیسے ہو۔ ایک غلط نظر بھی جیسے پگھلا دے گی۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی ساری توجہ پھپھو پر ہی رکھی۔ نورالعین کو دوسری نظر دیکھنے کا رسک میں نے نہیں لیا۔

بعض موقعوں پر یہ آنکھیں ایسے کیوں بن جاتی ہیں جیسے انہوں نے کوئی اچھی چیز دیکھی ہی نہ ہو۔ اور غالباً تو خود ہی معلوم نہیں کیوں اتنا حسن پرست تھا۔

مجھے ساری خوب صورت چیزیں اچھی لگتی تھیں۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے میں سو بھی گیا۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں ابھی۔ ہلکی روشنی باقی تھی۔

"اف وہ کتنی دیر سویا رہا۔ امی کو پتہ چل جائے کہ پاکستان جاتے ہی کیسی عیاشی ـــــــ شروع ہوگئی ہے۔ تو ضرور کان کھینچیں گی۔"

انہیں میرا اور پاپا دونوں کا دیر تک سونا ناگوار ہی لگتا تھا۔ اور یہاں آکر تو مجھے لگ رہا تھا کہ وقت رک گیا ہے۔

ہر کوئی بہت سست روی سے کاموں کو نمٹا رہا تھا بہت آہستہ۔ کہیں کوئی دوڑ نہیں لگی ہوئی تھی۔

"پتہ نہیں یہ سب کچھ ایسا ہی ہے یا مجھے غنودگی کی وجہ سے محسوس ہورہا ہے۔" شاور لیتے ہوئے بھی میں سوچتا رہا۔

اور اگلے چند دنوں میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ سب کچھ ایسا ہی تھا۔ جیسا میں نے سوچا تھا۔

اگلی رات ایک اور کردار سے میرا تعارف ہوا۔ یہ نیلم تھی اور اس رات مجھے دوبارہ اپنی آنکھوں کو دھونا پڑا کہ کیا کبھی خوبصورت چہرے دیکھے نہیں ہیں۔

لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ امی کے ملک پاکستان میں اتنا حسن ہے مگر انہوں نے کبھی مجھے بتایا نہیں کہ پاکستان میں اتنی خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں۔

اسی رات میں نے ان کو فون کھڑکا دیا۔ میری بات سن کر وہ خوب ہنسیں۔

"مضغر! تم کبھی بڑے مت ہونا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے سر کھجایا۔ "میرا مطلب ہے کہ میرے پاکستانی دوست تو اس قسم کی باتیں بتاتے تھے کہ پاکستان میں لڑکیاں بہت مغرور ہوتی ہیں۔ ایک تو کالی' پیلی شکل' اوپر سے ان کے نخرے کوئی دیکھ لے تو مرجائے۔"

"مضغر ان کے غرور کے لیے کیا یہ بات کافی نہیں کہ وہ عورت ہیں۔" امی کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ جس کا مطلب تھا انہوں نے میری بات کا برا مانا ہے۔

"اور دوسری بات یہ کہ تم ذرا باہر نکلو گھومو پھرو۔ وہاں کے رسم و رواج سے آشنائی حاصل کرو۔ تمہیں

"آپ بہت اچھے ہیں خضر بھائی! جب میں گاؤں میں تھی۔ کھیلتے ہوئے ایک دن میرا پاؤں پھسل گیا اور میں نہر میں جا گری۔ شاید میں چار منٹ پانی میں رہی ہوں گی لیکن آج بھی ایسا لگتا ہے کہ میں نے وہاں اس اندھیرے میں اور ان خوفناک لمحوں میں چار صدیاں گزار دی ہوں۔ جب تک آپ موت کو محسوس نہیں کرتے۔ اس وقت تک زندگی کی خوب صورتی بھی آپ پر واضح نہیں ہوتی۔ میں نے اس دن سے لے کر آج تک اس زندگی کو لمحہ لمحہ قطرہ قطرہ محسوس کیا ہے۔

یہ واقعہ میری زندگی پر بہت حد تک اثر انداز ہوا۔ میری حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ پھر آپ کی پھپھو مجھے کراچی لے آئیں۔"

"تو تمہارا یا تم لوگوں کا حشمت انکل سے کیا رشتہ ہے؟"

"رشتہ میں کہیں بہت دور سے یہ ہم لوگوں کے ماموں ہوتے ہیں۔" اس نے لب کاٹے۔

"پھر اس گھر میں آکر مجھے پتہ چلا کہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے۔ کوئی برے لوگوں کے ساتھ رشتہ نبھانے پر مجبور ہے اور کسی کو اچھے لوگ نظر نہیں آتے۔ جو آپ کی پھپھو ہیں نا، وہ کوئی عام خاتون نہیں ہیں۔ آپ نے زندگی میں کبھی روشنی دیکھی ہے خضر بھائی؟"

"ہاں اکثر۔ جب دھوپ نکلی ہوتی ہے۔"

وہ ایک دم ہنس پڑی۔ "آپ سمجھ گئے تھے نا میری بات۔ آپ کی پھپھو جیسے لوگ روشنی کی طرح ہوتے ہیں جن سے ہم جیسے دور کے لوگ بھی فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ اور اکثر بہت قریب کے لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے نور العین؟"

"کیا بولوں؟" نیلی نے ہونٹ کاٹے۔ "اسے صرف قسمت کی بدنصیبی ہی کہا جا سکتا ہے۔"

"لیکن وہ تو بہت اچھی ہے۔" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔ اس کا تھوڑی دیر پہلے کا رویہ میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا۔ وہ ایک دم ہنس پڑی۔

"یہاں اس حویلی میں بہت سارے لوگ رہتے ہیں خضر بھائی! لیکن ان میں سے کوئی بھی جیسا نہیں۔"

اب پتہ نہیں یہ تعریف تھی کہ تنقید۔ میں اس پر دماغ نہیں لگا پایا۔

اور اتفاق سے اسی شام میں نے نور العین کے بھائی کو دیکھا۔ مجھے نیلی نے چپکے سے بتایا۔

"ہماری پنجابی فلموں کے ہیرو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ چونکہ آپ نے بھی پنجابی فلم نہیں دیکھی ہوگی لہٰذا بتا رہی ہوں۔" نیلی کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

اس نے نیلی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور مجھ پر بھی۔ اس کے انداز میں ایک نخوت سی تھی۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملائے بغیر اندر چلا گیا۔

"کیا ہوا نیلی! ان کا تعلق انسانوں سے نہیں ہے۔" تھوڑی دیر میں انکل کے کمرے سے اس کے بولنے کی تیز تیز آوازیں آنے لگیں۔ "اس کا کیا مسئلہ ہے؟"

"اس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں۔ جب یہ خود ہی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ جب آتا ہے، ہم سب کو ڈانٹتا ہے یونہی پریشان ہو جاتی ہے۔ یہ چاہتا ہے اس کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلے۔ ہم سب ہی ایک طرح کے غلاموں کے زمرے میں آتے ہیں۔"

"اور نور العین؟" میں ایک دم ہی بے ساختہ بیٹھا۔

"نور العین۔" نیلی نے پلکیں جھپکیں۔ "وہ شہزادی ہے خضر بھائی! اور شہزادیاں کب کسی کے رعب میں آتی ہیں۔ اس کے پاس حسن کی دولت ہے۔ تعلیم ہے۔ پھر یہ ساری جائیداد اسی کی تو ہے۔ شہباز صاحب دنیا میں اگر کسی کی سنتے ہیں تو وہ صرف نور العین ہے۔ ورنہ باقی لوگ ان کے نزدیک کیڑے مکوڑے جتنی اہمیت رکھتے ہیں۔"

اس کا لہجہ اب بھی سادہ تھا۔ مجھے نیلی کی باتیں بڑی زبردست لگتی تھیں۔ چاہے قصہ کوئی بھی ہو۔

کا عکس نہ چہرے پر آتا تھا نہ لہجے میں۔ اور میں بھی یہاں لوٹ کرنے لگا تھا کہ جب سے میں نے نور العین کو بولتے اور ہنستے دیکھا تھا۔ وہ بھی تھوڑی سی دیر میں۔

"بہرحال ہیں دلن تو رہے گا ہی۔ اور آپ یہ نہیں سمجھیے گا کہ یہ کوئی جاہل بندہ ہے۔ آپ ہی کے ملک سے آئے ہیں کوئی ڈگری لے کر۔"

"میرا ملک یہی ہے۔"

"یہ ملک تو اب ان لوگوں کا بھی نہیں رہا خضر بھائی! جو یہاں ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں۔ آپ نے اسے اپنا کہا۔ تو بڑا اچھا لگا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"بس کبھی تجربہ نہ ہو آپ کو کہ یہاں زندگی گزارنی کتنی مشکل ہو گئی ہے۔"

"حالانکہ تم لوگ اتنے عیش و آرام میں رہتے ہو۔ وہاں تو ایسا کوئی تصور ہی نہیں ہے میری امی گھر کا سارا کام خود کرتی ہیں۔ پھر ڈرائیو بھی انہیں خود ہی کرنا پڑتا ہے اور ڈرائیور یہاں کی زندگی کو دیکھو ایک کام کے لیے دو دو نوکر ہیں اور ڈرائیور تو لوگ تو بالکل لارڈز لگتے ہو۔"

"ایک زندگی یہاں سے باہر کی بھی ہے۔ زندگی صرف اس حویلی تک نہیں ہے۔"

"یہ بات تو ہے۔" میں نے سر کھجایا اور اگلے ہی دن مجھے اس کی بات کی تصدیق ہو گئی۔

نور العین نے اپنی گاڑی سے کسی بچے کو زخمی کر دیا تھا۔ میری تو حالت خراب ہو گئی کیونکہ گاڑی میں میں بھی تھا۔ لیکن نور العین کو تو گویا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تھانے بھی گئی اس نے سارے معاملات بھی بڑی آسانی سے نمٹا لیے اور میں بیچ بیچ شاکڈ۔ ہر معاملہ پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ختم ہو رہا تھا۔

"آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" اس نے گاڑی گھر میں ڈالتے ہوئے مڑ کر مجھے دیکھا۔

"نہیں تو... بس یہ واقعہ بہت عجیب تھا۔"

"اتنا عجیب بھی نہیں جتنا آپ حیران ہو رہے ہیں۔ ٹھیک ہے میری غلطی تھی مگر وہ لوگ غریب تھے۔ اب کم از کم انہیں اتنا پیسہ تو مل ہی گیا ہے کہ ایک مہینے تک بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔"

"مجھے تم پر حیرت نہیں ہو رہی ہے نور! مگر میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟" اس نے اپنی تیکھی نظریں مجھ پر ڈالیں۔ میں ایک دم گڑبڑا گیا۔ کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں بڑی خوب صورت ہیں۔ بڑی ساحری۔ جادو کر دینے والی اور کبھی مجھے لگتا کہ وہ اتنی جادو کر دینے والی اس لیے ہیں کیونکہ وہ نور العین کی آنکھیں ہیں۔ ورنہ دنیا میں ایسا تھوڑی ہوتا ہے کہ ایک شخص اچھا لگے اور لگتا ہی رہے۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو پھر ضرور اس شخص میں ہی کوئی خاص بات ہوگی۔

"کیا ہو گیا ہے خضر صاحب؟" اس نے میرے سامنے چٹکی بجائی تو میں ایک دم حقیقت کی دنیا میں واپس آیا۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ مجھے تم پر حیرت نہیں ہے۔ لیکن لوگوں نے اسے جس طرح ایکسیپٹ کیا ہوا ہے۔ وہ بڑا عجیب ہے۔ ان پڑھ لوگوں کی کیا بات کریں۔ لیکن پڑھے لکھے لوگوں نے بھی کچھ نہیں کیا۔"

"میرا خیال ہے۔ پوری دنیا میں ہی یہی اصول ہے کہ پڑھے لکھے لوگ صرف باتیں بنائیں گے اور غریب خون دے گا۔"

"بدقسمتی ہے۔" میں نے اس سے زیادہ بحث نہیں کی کیونکہ اس کی آنکھوں میں تھوڑی تھوڑی سی خفگی نظر آنے لگی تھی۔ حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن شاید اسے لگا ہو کہ امیر اور پڑھے لکھے ہونے کا طعنہ میں نے اسے دیا ہے۔ جبکہ میں تو وہ بات کر رہا تھا جو میں نے یہاں آکر محسوس کیا تھا۔ لیکن سچ بولنے کا دور شاید بالکل ہی ختم ہو گیا ہے۔

جس وقت گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ شہباز سامنے ہی لان میں بیٹھا ہوا نظر آ گیا۔

"کہاں گئی تھیں؟" اس کا لہجہ۔ میں نے چونک کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا

تھا کہ یہ وہی کوئی ہے۔ جس نے کل بہت کھردرے لہجہ میں نیلی سے بات کی۔ جس کا ایک ایک قدم زمین پر یوں پڑ رہا تھا۔ جیسے وہ چل نہیں رہا ہو بلکہ روند رہا ہو۔

"جی ہاں۔" نور نے مختصر جواب دیا۔

"تو مجھے بتا دیا ہوتا میں کر دیتا۔" میں پیچھے کھڑا ان دونوں کے مکالمے سن رہا تھا۔ کل جب وہ شخص اپنے کھردرے لہجے میں بول رہا تھا تب بھی مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اور اب جبکہ اس کے لہجہ میں بڑی ملائمت سی تھی۔ تب بھی برا لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس لہجہ میں احترام نہیں تھا بس چاپلوسی کی ایک ہلکی جھلک تھی۔ یا پھر میرا وہم۔ وہ کوئی گرا پڑا شخص نہیں تھا کہ اسے یوں خوشامد یا چاپلوسی کی ضرورت پڑتی۔ میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا اندر چلا آیا۔

شہباز اسی وقت شکار کر کے لوٹا تھا۔ اور جیپ کے پچھلے حصے سے بٹیر وغیرہ نکال رہا تھا۔

"اے لڑکی!" اس نے چٹکی بجا کر نیلی کو بلانا چاہا تو میں نے روک دیا۔

"نیلی! تم نے کبھی کہا نہیں کہ یہ بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟"

"وہ دنیا میں صرف نور العین کی بات سمجھتا ہے سنتا ہے۔ اور نور نے کبھی کہا ہی نہیں۔" اور وہ رو دی۔ "میں تو بھی اتنا حوصلہ نہ کر سکی کہ اس شخص کے منہ لگتی۔"

اتنی دیر میں وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا نیلی کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

"تمہیں آواز نہیں آئی؟"

"نہیں۔ اصل میں۔" وہ ہکلا گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو آگئے تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ میں اس گھر میں مہمان تھا۔ آج نہیں تو کل مجھے چلے ہی جانا تھا اور وہ تو شاید اس گھر کا مکین تھا۔

اور مہمانوں کو مکینوں سے الجھنا نہیں چاہیے۔ اخلاق کا تقاضا بھی یہی تھا مگر اس وقت میں سب کچھ بھول گیا۔

"شہباز صاحب! آپ کچھ اور نہیں کر سکتے مگر کسی سے بات تمیز سے کر لیں۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تم باہر سے آئے ہوئے لوگ کیا جانو گھر کی عورت کی تمیز اور عزت۔"

اس کے لہجے میں اتنا تنفر تھا کہ جیسے میں باہر سے نہیں آیا۔ کسی گٹر سے آیا ہوں۔ جیسے ہی یہ جملہ میں نے سوچا مجھے اپنی اس سوچ پر ہنسی آگئی۔ اور وہ جانے نہیں کیا سمجھا کہ بالکل ہی آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا۔

ایک لمحے کو تو خود ڈر گیا کہ کہیں اسے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ لیکن غنیمت رہا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ایک قہر آلود نظر مجھ پر اور دوسری نیلی پر ڈال کر وہ اندر چلا گیا۔

"کچھ اچھا نہیں ہوا خضر بھائی!"

"اس اچھا نہیں ہونے میں کس کا قصور ہے؟" اُلٹا میں نے اس سے پوچھ لیا۔ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی اور صحیح بات میرا خیال ہے بول دینا چاہیے۔ مگر یہ کوئی انگلینڈ ہے جہاں ہر صحیح بات کو صحیح ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے وہ معنی تلاش نہیں کیے جاتے ہیں۔

"اچھا مسئلہ کیا ہے؟ ان صاحب سے جا کر معافی مانگ لوں۔" میں نے اسے چھیڑنے کو کہا۔

"نہیں بھئی! میں نے کب کہا۔ لیکن میں تو اس لیے بھی کہہ رہی تھی کہ ایسے لوگ خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ آپ تو نہیں جانتے خضر بھائی! اگر چہ" وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں! مغرب کے وقت یوں بھی منہ سے فضول باتیں نہیں نکالنی چاہئیں۔"

"کیوں؟ کیا وہ پوری ہو جاتی ہیں؟"

"بہت حد تک۔"

"پھر تو انسان کو ساری دعائیں اسی وقت کرنی چاہئیں، کیا خیال ہے؟" میں صرف اسے ریلیکس کرنے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر اسی قصے پر آ گئی۔

"ایک بات آپ کو بتاؤں، آج تک کسی نے شہباز کو یہ جواب نہیں دیا ہو گا۔ اول تو اس کے آگے کوئی بولتا نہیں ہے۔ اور جو کچھ بولا جاتا ہے تو وہ صرف اس کی بات کی تائید ہوتی ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"جاگیردار، وڈیرے ایسی ہی ٹائپ کے ہوتے ہیں۔"

"لیکن تعلیم تو انسان کو بہت بدل دیتی ہے۔"

"تعلیم؟" اس نے اپنی آنکھیں مجھ پر مرکوز کیں تو میں خود گڑبڑا گیا۔

"یہ تو بڑا عجیب سوال ہے۔"

"جس سے تم ہو اتنی دیر سے آپ کیے جا رہے ہیں۔"

"تم بہت تیز ہو گئی ہو۔" میں ہنس پڑا اور ہنستے ہنستے ایک دم چپ بھی ہو گیا۔ سامنے نور العین غصے سے کھڑی یک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔

"آج خیر نہیں ہے جس کو دیکھو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس کا مزاج برہم ہے۔"

"خضر! تم نے شہباز سے بدتمیزی کیوں کی ہے؟"

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔" میرا لہجہ احتجاجی تھا۔

"نہیں۔ تم نے بدتمیزی کی ہے۔" اس کا لہجہ ترش تھا "اور وہ بھی اسی کی وجہ سے۔" اس نے نیلی کی طرف اشارہ کیا۔

"نیلی کو بیچ میں نہیں لاؤ۔"

"کیوں نہیں لے کر آؤں؟ آج تم نے بھی وہی کام کیا جو سارے اور کرتے ہیں۔"

"مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں سارے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ دھوکہ دینے والے، جھوٹ بولنے والے۔" اس کی آنکھوں میں پھر وحشت بھری تھی۔ یہ کیفیت میں نے پہلے بھی کئی بار نوٹ کی تھی۔

"نور! اندر چلو، اندر چل کر بات کرتے ہیں، سردی بڑھ رہی ہے۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔"

"تمہارا کوئی سوال ہی نہیں ہے، صرف ایک فضول بات ہے۔ اس کا میں کیا جواب دوں۔" میں نے بڑی مشکل سے اپنے لہجے کو ہموار رکھا تھا۔

"مجھے اچھی لگتی تھی اور جو اچھے لگتے ہیں، جن سے محبت کی جاتی ہے پھر ان کا دل نہیں توڑا جاتا۔ اپنے سخت رویے سے یا فضول باتوں سے اور جتنا غصہ مجھے آ رہا تھا میرے منہ سے صرف فضول بات ہی نکلتی۔"

مجھے نیلی کا بھی خیال آ رہا تھا۔ اس کے حق میں تو میں نے کچھ نادان دوست جیسا کردار ادا کیا تھا۔

"یہ سب نیلی کی وجہ سے ہوا ہے نا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نیلی نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ یہ سب میرے اپنے ہی دماغ کی خرابی ہے۔"

"مردوں کا دماغ یوں ہی نہیں خراب ہوتا ان کا دماغ خراب کیا جاتا ہے۔"

اس کا لہجہ اب بھی کاٹ دار تھا۔ مجھے بھی گمان نہیں گزرا تھا کہ وہ جو اتنی خوب صورت لگا کرتی ہے اتنی پیاری اور معصوم۔ اس کے منہ سے بھی اس قسم کے جملے میں سنوں گا۔ اب میرے پاس کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے اس قدر خاموش دیکھ کر اسے شاید خود ہی احساس ہو گیا کہ اس نے کیا کہا ہے۔

"سوری خضر!" اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میری رائے کسی کے بارے میں اچھی نہیں ہوتی ہے۔ چاہے اس کا تعلق کسی بھی صنف سے ہو۔ سب لوگ خود غرض ہوتے ہیں۔ مطلب پر بک جانے والے، فروخت ہو جانے والے۔"

"دنیا میں ہر چیز قابل فروخت کیوں ہوتی ہے؟"

"ہر چیز نہیں ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہے خضر! میری اب تک کی زندگی میں میں نے جو کچھ دیکھا ہے۔ میں نے ہر چیز کا سودا ہوتے دیکھا ہے۔ ہر دفعہ، ہر دفعہ میں نے اس دل کو خون ہوتے دیکھا ہے۔ یہ اتنی بڑی حویلی، جائیداد بہت سارا روپیہ یہ آپ کو کچھ بھی نہیں دیتا ان سے خوشیاں نہیں خریدی جا سکتیں۔"

"لیکن جن سے خریدی جاتی ہیں، ان کے لیے تو

پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے بیا...." میں اسے اس عالم وحشت سے نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ میری کوئی بات سننے کے لیے ہی راضی نہیں تھی۔

آنسو اب اس کے رخساروں پر تھے۔

"تم پھوپھو کے پاس جا کر بیٹھو ان سے باتیں کیا کرو۔ وہ بہت اکیلی ہیں نورا!"

"اس حویلی میں ہم سب ہی بہت اکیلے ہیں' اپنی اپنی جگہ پر۔"

اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا۔ وہ مغرور اور وحشت زدہ شہزادی' ایک دم ہی بہت تھکی تھکی سی لگنے لگی۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے جس کی بات سن کر میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔ اس غصے کا اب کہیں نام نہیں تھا۔ لیکن سوئی اس کی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"خضر! تم معافی مانگ لینا۔"

"نورا!"

"میں صحیح کہہ رہی ہوں۔ وہ مہمان ہے' چلا جائے گا۔"

"اور میں' میں کون ہوں؟ میں مہمان نہیں ہوں؟"

"مگر اس نے تمہارے ساتھ بدتمیزی نہیں کی ہے۔ بات تم نے شروع کی تھی۔"

"جو لوگ خود سراپا بدتمیز ہوں انہیں ضرورت بھی نہیں ہے کسی سے بدتمیزی کرنے کی۔ تم یہ غلط فہمی دل سے نکال دو' میں بات کرنا پسند نہیں کرتا اس قسم کے لوگوں سے' اور تم سوری کی بات۔ جاؤ جا کر سو جاؤ' رات بہت ہو گئی ہے۔"

حالانکہ اس وقت صرف ساڑھے نو بجے تھے۔ مگر میں اتنا تھک گیا تھا کہ جی چاہ رہا تھا فوراً" جا کر بستر سنبھال لوں۔

لاؤنج میں نیلی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کو میں نے ہمیشہ ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ آج وہی آنکھیں سرخ تھیں۔

"سوری نیلی!" میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "تمہیں خوامخواہ اتنی سننا پڑیں۔"

"اور آپ کو؟ آپ کو خضر بھائی؟" اس نے آنسو بھری آنکھیں مجھ پر جمائیں۔

"مجھے کون باتیں سنا سکتا ہے؟" میں نے کاندھے اچکائے۔

"اور وہ جو نورالعین نے کہا؟"

"کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اس طرح کسی کی باتیں سننے والا بندہ نہیں ہوں۔ لیکن بہت سارے لوگ ہوتے ہیں جن کی باتیں نہ صرف یہ کہ آپ کو سننی پڑتی ہیں بلکہ پھر انہیں سمجھانا بھی پڑتا ہے۔ اوکے۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔" میں نرمی سے کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا۔

بہت عجیب سی الجھن تھی' جو میرے دل و دماغ پر دستک دیتی رہی اور میں پوری رات سوتی جاگتی کیفیت میں رہا۔

۞ ۞ ۞

صبح سر بوجھل ہو رہا تھا۔ میں صرف ایک کپ چائے پی کر گھر سے نکل آیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس جا کر گھر کا کام کیا' اس نے کہا' ایک ہفتہ تو لگ ہی جائے گا۔ شاید یہ کام مجھے پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔ [illegible] اب اس شخص کو دیکھنا چاہتا تھا اور نہ ہی نور کو کوئی بات کہہ سکتا جس سے اس کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو آ جائیں۔

میں نے ممی کو بھی فون کر کے بتا دیا تھا۔ انہوں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا۔

نیلی نے سنا تو ایک دم اس کے چہرے پر اداسی سی آگئی۔

"آپ واقعی چلے جائیں گے خضر بھائی؟"

"ابھی نہیں' تو ایک مہینے کے بعد تو جانا ہی تھا' لوگ پریشان نہ ہوں۔"

میں نے لوگ کا لفظ اپنے دل کی خوشی کے لیے لگایا تھا۔ ورنہ مجھے پتا نہیں تھا کہ نور اس خبر کو کس انداز سے لے گی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ وہ ایک

لمبے سکون کا سانس ہی لے گی۔ بعض لوگ جیسے کسی کو [illegible] کرتے ہیں اور وہ خود اپنی عقل سے کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہتے' بالکل یہی حال مجھے نور کا لگا تھا۔

جیسے مجھے لگتا تھا کہ میں اس کے اندر کہیں ہوں' لیکن باہر صرف شہباز تھا۔ شاید اس لیے کہ میں تو بالکل ابھی آیا تھا۔ وہ مجھے کتنا جان سکتی تھی۔ لیکن وہ شخص اس کے یہاں بچپن سے آ رہا تھا۔ پھر اس کے ہر مشکل وقت میں کام آنے والا۔ کوئی بھی مسئلہ ہو وہ شہباز سے ضرور شیئر کرتی تھی' یہ ساری باتیں خود نور نے مجھے بتائی تھیں۔

نیلی کو نہ اس نے کوئی رشتہ دیا' نہ اسے اس قابل سمجھا' نہ دوست والا' نہ کزن والا' بچپن کیا رہ جاتا ہے ایسا کیوں تھا' بظاہر اس کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی تھی' کیونکہ نیلی بہت اچھی لڑکی تھی۔ اس میں ایک دل موہ لینے والی معصومیت سی تھی اور تھوڑی تھوڑی شرارت۔ دونوں نے مل کر اس کی شخصیت کو بڑا انوکھا ماروپ بخشا تھا' لیکن میرا دل تو نور کی طرف لپکتا تھا' جس کا [illegible] وحشت اور حسن تھا۔

یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہ ہو' محبت میں [illegible] پتا کہاں ہوتا ہے کہ کون سی چیز نے کہاں دل کو جھکنے پر مجبور کیا تھا۔

"اور اگر شہباز صاحب کو ان خیالات کا علم ہو جائے..." میرے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ مجھے اس کا نفرت میں ڈوبا لہجہ یاد آگیا۔

لیکن جتنے بھی دن اب مجھے اس گھر میں رہنا تھا وہ اب چپ کر کے ہی رہنا تھا۔ یہ میں نے سوچ لیا تھا۔ شہباز کے چہرے پر مجھے دیکھتے ہی ایک استہزائیہ آمیز مسکراہٹ سی آجاتی۔ جیسے اسے میرے اندر کا سارا حال معلوم ہو۔

وہ گھر کی ملازم لڑکیوں سے کیسے بات کرتا ہے۔ ان سے ایسا کیا کہتا ہے کہ وہ بے چاری سہمی ہوئی لڑکیاں اس کے سامنے جانے سے بھی کتراتی تھیں۔ ان سب چیزوں سے بے نیاز میں صرف کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

"آپ ناراض ہیں خضر بھائی؟"

میں ای میل چیک کر رہا تھا جب نیلی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں' بھئی میں کیوں ناراض ہوں گا۔ تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"خیال تو لوگوں کو دیکھ کر ہی آتا ہے' اب وہ پہلی والی بات ہی نہیں رہی۔ نہ اب آپ لان میں بیٹھتے ہیں' نہ نور آپی سے گپ شپ کرتے ہیں۔"

"نور بہت مصروف ہو گئی ہیں۔" میں نے سادہ لہجے میں کہا۔

"مصروف تو وہ ہمیشہ سے ہی تھیں۔"

"پھر میں بدل گیا ہوں گا۔" اس کی جرح سے تنگ آکر میں نے کہہ دیا۔

"آپ جیسے لوگ بدلتے بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

"ارے بابا!" میں نے ہاتھ جوڑے۔ "میں محتاط ہو گیا ہوں نیلی بی بی! اب خوش' صحیح بات بتا دی ہے۔"

"ایک بات بتاؤں خضر بھائی! انسان کو کسی بھی وجہ سے اپنی عادتیں نہیں بدلنی چاہئیں۔ لیکن یقین جانیں مجھے اس دن بہت اچھا لگا تھا جس دن آپ نے شہباز صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر آپ نے انہیں ٹوکا تھا۔ میں یہ بات اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ آپ نے میرے لیے کہا تھا۔ مجھے پتا ہے میری جگہ اس حویلی کی کوئی ملازمہ بھی ہوتی تب بھی آپ یہ ہی کرتے۔ گزشتہ پانچ سال سے میں یہاں ہوں۔" اس نے جھک کر گہری سانس لی۔ "اس حویلی کی ہوائیں اور فضائیں ہی کچھ خوش گوار نہیں ہیں اور جب بھی یہ شخص یہاں آتا ہے تو پھر تو سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔"

"تو یہاں اسے کوئی کچھ کہتا کیوں نہیں ہے۔ یہ اس کا گھر تو نہیں کہ جو اس کا دل چاہے وہ کر ڈالے۔"

"یہ اس کے تایا کا گھر ہے اور تایا کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے بہت کچھ ہوتا ہے۔ سارے قصے، مسائل جائیداد کے ہوتے ہیں' یہ ساری جائیداد شہباز کو جائے گی اگر ماموں نے کوئی اسٹیپ نہیں لیا۔"

"اسٹیپ سے کیا مطلب؟" "کیا بیٹے کے لیے ایک اور شادی کرنی پڑے گی؟"

"کیا بدتمیزی ہے۔"

"بدتمیزی کی کیا بات ہے" میں نے سنا ہے پاکستان میں لوگ بیٹوں کے لیے دو' دو' تین' تین شادیاں کرلیتے ہیں۔"

"ایسا کسی زمانے میں ہوتا ہوگا۔" وہ ہنس پڑی۔ "اب ایسا نہیں ہے' بہت کچھ تبدیل ہوگیا ہے۔"

"پتا نہیں۔" میں نے کاندھے اچکائے۔ "ممی آج سے بیس سال پہلے پاکستان سے گئی تھیں اور جتنا کچھ اور جیسا کچھ انہوں نے بتایا تھا۔ مجھے لگتا ہے وقت آج بھی وہیں رکا ہوا ہے۔"

"مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ کوئی پاکستان کو اس طرح کہے۔"

"ارے رے' پاکستان کو تو کسی نے بھی کچھ نہیں کہا' وہ تو یہاں کے رہنے والے اور وہ بھی سارے لوگ نہیں' کچھ لوگ ان کے متعلق بات ہو رہی تھی۔"

"بس رہنے دیں۔" وہ ہنسنے لگی۔ "آپ پر بھی تو یہاں کے لوگوں کا اثر ہوگیا ہے۔" اس کا لہجہ شوخ تھا۔ "دل میں کچھ اور زبان پر کچھ۔"

"بھئی میں ایسا بندہ نہیں ہوں۔" میں نے ہاتھ جھاڑے۔

"پکی بات!" اس نے اپنی سیاہ پلکیں اٹھائیں۔

"بالکل پکی بات۔"

"اف!" اس نے ٹائم دیکھا۔ "آپ کے ساتھ باتوں میں لگ گئی پھوپھو کو اخبار سنانا تھا۔"

"تم انہیں اخبار کیوں سناتی ہو؟"

"اس لیے کہ وہ بیمار ہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "اور دنیا کی کسی نہ کسی چیز میں تو اپنا دل لگانا ہی پڑتا ہے خضر بھائی! ورنہ جینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ شروع میں جب میں انہیں سناتی تھی تو وہ [illegible] تھیں یا سو جایا کرتی تھیں' لیکن اب وہ ساری باتیں' ساری خبریں یا کہانی سب ہی کچھ غور سے سنتی ہیں [illegible] ان پر تبصرے بھی کرتی ہیں۔"

"لیکن میں نے انہیں زیادہ بولتے نہیں سنا۔"

"اصل میں وہ ایک شرمیلی خاتون ہیں۔ آپ تو ان کے بھتیجے لیکن بیچ میں بہت سالوں کا وقفہ ہے جس میں نہ آپ ان سے ملے نہ وہ آپ سے۔ اب جلدی تو وہ اجنبیت ختم ہونے سے رہی اور آپ اسے اجنبیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ بہت کم گو اور شرمیلی ہیں۔"

"کتنا زیادہ فرق ہے پھوپھا میں اور ان میں۔"

"ہاں!" اس نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "ایک زمین ہے تو دوسرا آسمان' ان دونوں کے بیچ نور العین ہوتی ہے۔ وہ نور العین ہے۔" وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

"تم کچھ کہہ رہی تھیں' کیا بول رہی تھیں؟" میں نے بے کلی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس یوں ہی نور العین کی شخصیت بہت سارے حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایسی کہ وہ خود بھی ڈھونڈے تو اسے نہ ملے۔" اس نے [illegible] سے کہا۔

* * *

"خضر بھائی!" نیلی مجھے ڈھونڈتی ہوئی کمرے تک آگئی۔

"بہت سارے مہمان آرہے ہیں' کیا آپ [illegible] ہیں؟" اس کا انداز مزاحیہ تھا۔

"کیا۔ کیا وہ سارے لوگ مجھ سے ملنے آرہے ہیں؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا' لیکن شہباز کے گھر والے آرہے ہیں' عموماً وہ لوگ چھٹیاں یہیں گزارتے ہیں۔"

"اف خدایا!" میں کراہ کر رہ گیا۔ میں نے اپنا [illegible]

شروع کر دیا تھا اور برنس کافی حد تک رنگ میں آگیا تھا۔ اس موقع پر تو میں واپس انگلینڈ بھی نہیں جاسکتا تھا۔

اور مجھے کسی کے آنے سے کوئی تکلیف بھی نہیں تھی' یہ میرا گھر تو نہیں تھا' لیکن میں ایک بات سے پریشان ہوگیا تھا کہ وہ لوگ شہباز کی بہنیں وغیرہ ہیں۔

"خیر مجھے کیا۔" میں نے کاندھے جھٹکے۔

رات کافی ہوگئی تھی۔ کھڑکی کے پردے برابر کرنے اٹھا تو یوں ہی میری نگاہ بھٹک کر لان میں چلی گئی۔

نور العین کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور شہباز اس سے کچھ کہہ رہا تھا اور نور العین کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔

میرا دل چاہا' میں ذرا ان سے جا کر پوچھ لوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے نور کا رویہ یاد آگیا۔ وہ مجھ سے ناراض سی تھی۔ لیکن ایسی ناراضی جس میں کچھ پتا نہیں ہو تاکہ بات کیا ہے' وجہ کیا ہے۔

اور میں اس کا چاہے جتنا خیال کروں اس سے جتنی محبت کروں' لیکن ایک مرد کی انا تو مجھ میں بھی تھی۔ اگر وہ بغیر وجہ کے ناراض ہو سکتی ہے تو میرے پاس تو پھر وجہ تھی۔ یہ ہی سب سوچتے سوچتے میں کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ میری سوچیں عجیب سی ہوگئی تھیں۔

اس گھر میں تو آسیب بسیرا کرتے ہیں۔ عجیب سے پر اسرار سے۔

اور اس آسیب نے مجھ پر بھی کہیں اپنا سایہ کرلیا ہے۔ اور یہ سوچ کر مجھے ہنسی آگئی۔

سایہ کسے کہتے ہیں' یہ مجھے تین دن بعد پتا چلا' شہباز کی دونوں بہنیں رہنے کے لیے آگئی تھیں اور ایک بہن عائلہ نے میرا پیچھا سائے کی طرح سے کیا تھا۔

عجیب مصیبت میں جان آگئی تھی۔ میں ان لوگوں کا موازنہ نیلی سے کرتا تو حیران رہ جاتا۔ نور العین تو رہتی ہی شہر میں تھی۔ لیکن نیلی۔ اس کو کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ اس کا تعلق بھی گاؤں سے رہا ہوگا۔ وہ بہت سادہ اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ آنکھ کے اشارے سے بات سمجھنے والی۔

میں نے ایک دفعہ اس کی اس خوبی کا ذکر کیا تو ہنس کر کہنے لگی۔

"خضر بھائی! اس میں میرا کوئی کمال نہیں' آپ کی پھوپھو کے دیے ہوئے بہت سارے سبق ہیں۔"

پھوپھو کا نام لیتے ہوئے اس کے انداز میں خود بخود ایک احترام سا آجاتا۔

"ایک بات بتاؤں خضر بھائی! میں پہلے روزہ نہیں رکھتی تھی' رکھا ہی نہیں جاتا تھا۔ صبح اٹھتے کے ساتھ ہی بھوک' پیاس سب لگنی شروع ہو جاتی۔ پھوپھو نے سمجھایا۔ کسی بھی چیز کو عشق بنالو' جنون بنالو۔ تو وہ چیز تمہارے لیے بہت آسان ہو جائے گی۔ مجھے تین سال لگے۔ اور آج روزہ رکھنا میرے لیے دنیا کا آسان ترین کام ہے' کوئی فرض روزہ بغیر سحری کے بھی رکھ لوں' تب بھی پتا نہیں چلتا۔" وہ سر پر دوپٹہ جمائے دھیرے دھیرے بتا رہی تھی۔

"تم نے جنون بنایا تھا یا عشق؟"

"پتا نہیں۔" وہ مسکرائی۔ "لیکن ایک بات مجھے پتا چل گئی ہے کہ عشق زندگی آسان کرتا ہے۔"

"ارے' اتنی بڑی بڑی باتیں کس طرح کرلیتی ہو؟"

"آپ کو نہیں پتا چلا؟"

"مجھے کیسے پتا چل سکتا ہے؟"

"اچھا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ آپ کو ہر بات پتا چل جاتی ہے۔"

"اچھا!" میں ہنس پڑا۔ "بھئی میں سیدھا سا انسان ہوں۔ کوئی ولی اللہ نہیں ہوں۔"

"اس کا تو مجھے نہیں پتا' لیکن آپ ایک اچھے انسان ضرور ہیں' اپنی پھوپھو کی طرح۔"

"تم نے ایک دفعہ یہ بات پہلے بھی کہی تھی نیلی! شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ہر ایک کو اچھائی کی نظر سے دیکھتی ہو' کون کتنا اچھا ہے کتنا برا یہ تو وقت ہی بتاتا ہے' پہلے سے انسان کیا دعوے کرے۔" میرا لہجہ تھکا تھکا تھا۔

"آپ تھک گئے ہیں خضر بھائی؟"

"شاید۔" میں نے نورالعین کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں اندھیرا تھا اور سکوت۔

"لوگ دوسروں کو بے چین کر کے بھی کتنے سکون سے رو سکتے ہیں۔" میں نے سر جھٹک کر سوچا۔

"تمہاری ان لوگوں سے دوستی نہیں ہے نیلی؟" میں نے شہباز کی بہنوں کے متعلق پوچھا۔

"آپ نے شہباز کو دیکھا ہے نا؟ اس کی بہنیں بھی بالکل ویسی ہی ہیں، اگر ان کی مونچھیں لگا دی جائیں۔" اس نے معصوم سا مذاق کیا۔

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"کیا آپ لوگوں کو نیند نہیں آ رہی؟" نور کی نظریں سرد تھیں اور لہجہ سرد ترین۔

"نہیں نیند تو آ گئی تھی مگر کچھ ڈراؤنے خوابوں کی وجہ سے نیند واپس چلی گئی۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا تو اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا۔

"خضر!" وہ گھوم کر میرے سامنے آ گئی۔ "نیلی تم یہاں سے جاؤ۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا نیلی ایک دم پلٹ کر اندر چلی گئی۔

"کیا مسئلہ ہے نور! ہم باتیں کر رہے تھے نا!"

"نظر آ رہا تھا مجھے میرا خیال ہے خضر صاحب اگر آپ کو ہر لڑکی ہی اچھی لگتی ہے، ہر لڑکی سے ملنا چاہتا ہے کہ گھنٹوں باتیں کریں۔"

"نورالعین! خاموش ہو جاؤ۔"

"کیوں خاموش ہو جاؤں؟ اصل میں تم سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہو خضر!" اس کے چہرے کے خوب صورت نقوش نفرت سے بگڑ رہے تھے۔

"نور! میرا خیال ہے کہ اگر اس وقت تم خاموش ہو جاؤ تو بہتر ہوگا ہم دونوں کے لیے۔"

"صرف تمہارے لیے۔ میرے لیے بھی کچھ بہتر نہیں ہوگا مسٹر خضر! تمہیں چاہیے ایسا لگے کہ میں نیلی کو پسند نہیں کرتی، لیکن مجھے اس کا خیال ہے اور میں اسے تم جیسے مردوں سے بچانا بھی۔۔۔"

اب بس بہت ہو گیا تھا، اگر ایک منٹ بھی میں وہاں کھڑا رہتا تو اس کے منہ پر تھپڑ مار دیتا۔ اور وہ بھی اتنی زور سے کہ زندگی میں آئندہ کوئی فضول بات کرنے سے پہلے وہ سو مرتبہ تو ضرور سوچے۔

"یہاں سے چلی جاؤ۔" میں اٹھ کر دھاڑا۔ اتنی زور سے کہ خود مجھے اپنی آواز اجنبی لگی۔

ایک لمحے کو اس کی خوب صورت سی آنکھوں میں حیرت چمکی، صبیح پیشانی پر دو بل پڑ گئے، دوسرے ہی پل اس نے جیسے اپنے اوپر قابو پا لیا۔

"اس قدر بری لگنے والی بات تو نہیں تھی پھر کیوں اتنی بری لگ گئی؟"

"اس لیے کہ میں انسان ہوں اور تم نے اس قسم کی فضول باتیں شاید پہلے بھی کی تھیں۔ مجھے عادت نہیں ہے کہ میں۔۔۔"

"زندگی جب کوئی موقع دے رہی ہو تو عادت بنتے دیر لگتی ہے؟ اور یہ جو راہ ہے اس کے لیے تو مردوں کو عادتوں کی بھی ضرورت نہیں۔" اس کے لہجے میں بھی زہر تھا، آواز اور آنکھوں میں بھی۔ پتا نہیں زندگی کہاں پہ تھی؟ ان کی زہر آلود راستوں پر یا اس خوب صورت چاند کی روشنی میں جو ڈوب رہا تھا اب ڈوبنے والا تھا۔

اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ چاند ڈوب چکا ہے۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن صبح میں لان میں ٹہل رہا تھا۔ جب عائلہ اندر سے نکل آئی۔

"او آپ!" نہ جانے کیوں اس کا لہجہ مجھے مصنوعی سا لگا۔ میں اس وقت خاموش رہنا چاہتا تھا، بالکل خاموش، لیکن اس لڑکی نے میرا دماغ کھا لیا۔

"آپ پاکستان کیوں آئے؟ پاکستان کیسا لگا؟ لوگ کیسے لگے؟ موسم کیسا ہے؟ اچھا بتایے ہم لوگ کیسے ہیں؟"

آخری سوال ذرا اٹھلا کر آنکھوں کو کچھ پھیلا کر پوچھا گیا۔ اور ان میں سے میں صرف آخری سوال کا ذرا اچھا جواب دے دیتا تو باقی کے سوالوں سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن مروت کا سبق مجھے اس طرح ازبر رہتا تھا کہ۔۔۔ اسی وقت میں نے ایک بات اور بھی سوچی کہ اس وقت اگر نورالعین نے مجھے دیکھ لیا تو جتنی فضول باتیں وہ کر چکی ہے اس میں شاید ایک اور الزام کا بھی اضافہ ہو جائے اور الزام کتنے ہی سادہ کیوں نہ ہوں اپنے اندر بڑی تلخی، بڑی کڑواہٹ رکھتے ہیں۔

اسی وقت اس کا چنچل قلم کا ہیرو جیسا بھائی باہر آ گیا۔

"عائلہ!" اس نے گرج کر کہا۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کو آہستہ آواز میں بھی پکارتا تو جس کا نام عائلہ ہوتا اسی نے سننا تھا۔

"جی بھائی!" مجھ سے فر فر سوال کرنے والی عائلہ ایک دم تابعدار ہو گئی۔

"کیا کر رہی ہو یہاں پر؟"

"کچھ نہیں۔"

"مجھے نہیں تو اندر جاؤ اور آئندہ میں دیکھوں یہ وہ سناٹے نہیں کی کہ لان میں نہیں دیکھوں یا میرے ساتھ نہیں۔ چلو آج ایک تمنا تو پوری ہو گی۔ نور کے ساتھ تو کبھی اس لہجے میں بات نہیں کر سکا۔ حالانکہ تاثرات اس کے چہرے پہ بالکل وہی ہوا کرتے تھے جو اس وقت مجھے۔ آج اس بے چارے کی ایک خواہش تو پوری ہوئی اس وقت مجھے نہیں پتا تھا کہ اس کی ساری ہی خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔

اس دن شام ہی سے کراچی میں سردی شروع ہو گئی تھی۔ یہ اطلاع بھی مجھے نیلی نے ہی دی جب وہ گرم گرم کافی لے کر آئی۔

"سردی میں مزا آ رہا ہے نا؟"

"دن کی سردی؟ موسم قدرے بہتر ہو گیا ہے۔"

"آپ بھی نا بس خضر بھائی! آپ جیسے باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو تو سردی لگنے سے رہی، یہ ہم کراچی والوں سے پوچھیں ہمارے لیے تو یہ بھی مقام شکر ہے۔"

"اس سے تو کچھ ایسا پتا چلتا ہے کہ کراچی والے بڑے صابر و شاکر لوگ ہیں۔" میں نے اسے چھیڑا تو وہ ہنس دی۔

"ویسے اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔"

اسی وقت عائلہ نے آ کر نیلی کو اٹھا دیا۔

"نیلی! اچھا پکوڑے کو دل چاہ رہا ہے اور ساتھ میں کچھ اور بھی ہو تو مزا آ جائے۔"

"جی اچھا!" نیلی تابعداری سے پلٹ گئی۔

"تم کسی اور سے کہہ سکتی تھیں عائلہ! کچن میں کوئی نہ کوئی تو موجود ہوگا۔"

"نیلی چائے اچھی بناتی ہے۔" اس کا جملہ مختصر تھا۔ اتنے مختصر جملے میں کوئی دوسری بات نکل نہیں سکتی تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔

میرا خیال تھا شہباز کے رویے کے باعث وہ نہیں رکے گی لیکن وہ بک شیلف کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"یہ سب کتابیں پڑھ لی ہیں آپ نے؟" اس نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

"کتابیں پڑھنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔" میں نے کچھ حیران ہو کر کہا۔

"لیکن اتنی موٹی موٹی کتابیں، سر میں درد ہو جاتا ہوگا۔" میں ابھی سو کر اٹھا تھا۔ لیکن مجھے جمائیاں آنے لگیں جن کو میں نے بڑی مشکل سے کنٹرول کیا۔

"سر میں درد کا تو پتا نہیں، لیکن ایک بات کا پتا ہے کہ آپ کافی بہادر لڑکی ہیں۔"

"سچ!" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "آپ کو کیسے پتا چلا؟ ابھی تو آئے ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا ہے۔"

"بس میرا اندازہ ہے۔" میں اسے بتا نہیں سکا کہ وہ دن پہلے ہی شہباز نے اسے منع کیا تھا اور اب وہ پھر میرے ساتھ لاؤنج میں موجود تھی تو اس کا یہ ہی مطلب نکلتا تھا۔

"خضر صاحب! آپ بڑے مختلف مرد ہیں ہمارے پاکستان میں ایسے مرد نہیں ہوتے۔"

"اف۔" میں سر پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اس جملے کا کیا مطلب ہے۔ میں بھی پاکستانی ہوں، میں سے گیا

تھا۔

"مگر آپ کے اندر کوئی بات ہے بالکل الگ سی' ورنہ ہمارے گرد رہنے والے لوگ بڑے عجیب ہیں۔ جاہل گندے۔" اس کے چہرے پر شکنوں کا جال سا آگیا۔ "وہ چاہے ہمارا بھائی شہباز ہو یا پھر بڑے چچا...!" اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

میں نے چونک کر اس کو دیکھا۔ نیلی بھی پھوپھا کو پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ میں نے اکثر ہی نوٹ کیا تھا کہ وہ ان کے سامنے بھی آنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں ہو پاتا تھا۔ اور جب بھی ایسا ہوتا وہ نظریں بالکل قالین یا فرش پر جما کر بات کرتی۔

لیکن اس طرح کھل کر اس نے کبھی کچھ نہیں کہا تھا اور وہ کہہ بھی نہیں سکتی تھی' وہ عائلہ کی طرح بااختیار نہیں تھی۔

"آپ کہاں کھو جاتے ہیں؟" عائلہ نے جھک کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں نہیں۔" میں چیزیں سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ جا رہے ہیں' چائے تو پی لیجیے۔ نیلی لے کر آتی ہی ہوگی۔"

"میں کافی پی چکا ہوں' آپ پی لیجیے گا نیلی کے ساتھ۔"

"بیٹھ جائیے۔" اس کا اصرار تھا اور میری نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں جہاں نور العین کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔

اپنی عادت کے برعکس آج اس نے کچھ نہیں کہا' نہ اظہار برہمی نہ الزامات۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے ڈانٹنے کا اثر تھا یا عائلہ اس کی وجہ تھی۔

☼ ☼ ☼

تعلق چیز ہی ایسی ہے۔ دل تعلق سے خالی کیوں نہیں ہو پاتا۔ یہ اسے نہیں پتہ تھا۔ زندگی کی بہت ساری دوسری چیزوں کی طرح اس نے اپنے گرد بہت مضبوط حصار بنایا تھا۔ جو ٹوٹ رہا تھا یا ٹوٹنے والا تھا۔

اس شخص کی خاطر جس کے متعلق اس نے سوچا تھا کہ وہ بہت مختلف ہے۔ ان تمام مردوں سے جنہیں اس نے دیکھا تھا یا جنہیں وہ جانتی تھی۔

لیکن اب اسے پتا چل گیا تھا کہ ایسی ساری چیزیں صرف آنکھوں کا دھوکا ہوتی ہیں۔ دل کا بہلاوا ہوتی ہیں۔

اس دنیا میں کچھ اچھا نہیں ہے۔ اور اگر کہیں کچھ اچھا ہوتا بھی ہے تو نور العین کے مقدر میں نہیں ہے۔

مقدر کے لکھے کو بھگتنا اور بات ہے۔ اور مقدر پر صبر کرنا دوسری بات۔ اور نور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے لیے کون سی راہ ہے۔

اس کا دل چاہتا تھا۔ کسی سے بھی اب کوئی بات نہ کرے۔ کسی سے کوئی صفائی نہ مانگے۔ اور اس شخص سے تو بالکل نہیں جسے اس کے دل نے کہیں بہت اونچا مقام دے دیا تھا۔

"پتا نہیں مجھ میں اور گاؤں کی ان لڑکیوں میں کیا فرق ہے۔ جنہیں فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ کہ ہیرو کی شکل پر ابھی نظر بھی پوری نہیں پڑی اور میوزک بجنا شروع۔"

اس نے جب چار مہینے پہلے خضر کو دیکھا تھا تو پتا نہیں کیوں اس کے دل نے کہا تھا کہ اس کا ساتھ اگر مل جائے تو شاید زندگی کچھ آسان ہو جائے۔

اور اب نور کو پتہ چل رہا تھا کہ زندگی آسان تو کیا ہونا تھی۔ مشکل سے مشکل ترین کا سفر تھا۔

اس کی شکل بے شک بہت اچھی تھی۔ لیکن اس کی فطرت اچھی نہیں تھی۔ ان بہت سارے مردوں کی طرح جنہیں وہ جانتی تھی۔ جو اس کی زندگی میں تھے اور جن سے وہ نفرت کرتی تھی۔

اور نفرت کرنے پر بھی رشتے نبھانے پر مجبور تھی۔

اور جو لوگ نفرت کرتے ہیں۔ وہ اپنے دامن میں آگ بھرے پھرتے ہیں۔ پھر یہ آگ کبھی کبھی اتنی بھڑک اٹھتی کہ اسے خود اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ دل چاہتا کہ ہر چیز کو برباد کر دے۔ بہت دفعہ

اس نے سوچا کہ کسی سائیکاٹرسٹ سے مشورہ لے مگر پھر رک جاتی۔ اپنے گھر کی باتیں زمانے کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لیے بس خاموش رہو۔

اور خاموشی کو تو زہر بننا ہی ہوتا ہے۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ جب عائلہ نے کمرے میں جھانکا۔

"نور! کیا کر رہی ہو۔"

"کچھ نہیں۔"

"تمہارا انٹرن شپ ہو گیا؟"

"بس چل رہا ہے۔"

"اس دفعہ شہباز بھائی نے بھی سوچ لیا ہے۔ ایم بی اے کرنے کا۔"

"اچھی بات ہے۔ انسان کو تعلیم ضرور حاصل کرنا چاہیے۔" اس نے بے توجہی سے کہا۔ پھر بھی عائلہ کو خوشی ہوئی۔ اس کی بے حد مغرور کزن نے اس کے بھائی کی کسی بات میں تو دلچسپی لی۔

"اب تو شہباز بھائی بہت بدل گئے ہیں۔" عائلہ نے یہ بات اس لیے کی شاید وہ دلچسپی لے۔ کچھ اور پوچھے۔ لیکن وہ اپنے آپ میں مگن نہ جانے کہاں گم تھی۔ اس کی آنکھوں کے جگنو روشن تھے۔ مگر اک اداسی تھی۔ جس نے اس کے پورے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

عائلہ نے گہری سانس لی۔ "بعض لوگ بڑے ہی بدقسمت ہوتے ہیں۔ کیسے لوگ ان کے پیچھے ہوتے ہیں اور انہیں خبر نہیں ہوتی۔"

وہ کھڑکی میں چاند کے رخ پر بیٹھی تھی۔ عائلہ نے ایک نظر چاند کو دیکھا۔ دوسری نظر نور پر ڈالی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ چاند زیادہ روشن ہے یا اس کی مغرور کزن۔

اللہ نے ہر چیز اس کو دے رکھی تھی۔ اور وہ بھی بڑی فرصت سے۔ بظاہر وہ مغرور بھی لگتی تھی۔ لیکن نیلی کا خیال تھا کہ خود کبھی کبھی وہ ایسی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کا دل بہت اچھا ہے۔ اور نیلی کی بات کیا اسے تو نور کی کوئی بات بری لگ ہی نہیں سکتی تھی۔ چاہے نور اس کے ساتھ کچھ بھی کرے۔

حالانکہ عائلہ کو لگتا اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

اس کی خوب صورت آنکھوں میں ہر وقت جیسے کوئی وحشت سی رہتی تھی۔ کوئی کھوج۔ کوئی تلاش اور نیلی کا خیال تھا کہ جس دن کوئی اچھا شخص نور کو مل گیا وہ اس کے اندر موجود ساری نفرت کو ختم کر دے گا۔

وہ نفرت جس نے اس کی اصلی شخصیت کو دبا دیا ہے۔

"وہ اچھا شخص...!" عائلہ نے سوچا۔ ایک دم اس کی نظر گیسٹ روم پر جا ٹھہری۔

"اچھے لوگ اور کیسے ہوتے ہیں؟" عائلہ نے سوچا۔ "کیا ان کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

پتا نہیں کیوں رات کے اس پہر اسے خضر کا خیال آ گیا۔ ایک بج رہا تھا سردی میں یوں بھی رات جلد ہو جاتی ہے۔

"خضر کی باتیں۔" عائلہ نے سوچا۔ "کتنے مزے کی ہوتی ہیں اور ہر چیز کے متعلق معلومات۔" اور ایک لمحہ کو بھی اس کے دھیان میں نہیں آیا۔ کہ اگر اس وقت شہباز نے اسے خضر کے کمرے میں دیکھ لیا تو وہیں قتل کر دے گا۔

میں اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"کیا ہو گیا۔ خیریت؟"

"ہاں ہاں بالکل خیریت ہے۔ ایسے ہی آپ سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔" عائلہ بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اس وقت' بہت رات ہو گئی ہے عائلہ!" میں نے آستین موڑتے ہوئے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "جا کر سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔"

"نہیں ابھی...!"

ابھی بات ابھی عائلہ کے منہ میں ہی تھی۔ کہ ایک

دم سے نیلی کے کمرے سے کسی کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس آواز میں اتنی وحشت تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"عائلہ اٹھو۔" میں ایک دم اٹھ کر بھاگا۔

"کیا ہو گیا؟" عائلہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"باہر آؤ۔"

جس وقت میں نیلی کے پاس پہنچا میں نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ پھر وہ ہیولہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"نیلی!" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ "کیا ہوا ہے؟" حالانکہ مجھے یہ سوال کرنا نہیں چاہیے تھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ جواب دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے پورے جسم کی طرح اس کے ہونٹ بھی کپکپا رہے تھے۔ کچھ کہنے کی کوشش میں یا چپ رہنے کی خواہش میں اس کا فیصلہ مجھ سے نہیں ہو سکا۔

اور تب ہی نور نے آ کر نیلی کو مجھ سے کھینچ کر علیحدہ کر دیا۔

"خبردار! آئندہ اپنی شکل نہیں دکھانا۔" اس کی آنکھوں میں نفرت کی ایسی آگ تھی جو ہر چیز کو جلا سکتی تھی۔

"نور! میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔" لیکن اس نے جیسے میرا جملہ سنا ہی نہیں جیسے وہ جملہ دیواروں کے لیے تھا۔

اس کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک تھی۔ اور وہ لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ اور سارے الفاظ جیسے کہیں کھو گئے تھے۔

بلکہ سب کچھ ہی کھو گیا تھا۔ ختم ہو گیا تھا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ اسے بتا سکوں۔ اس صورت حال کی وضاحت کر سکوں لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔

نیلی پتھر کے بت کی طرح ساکت و جامد کھڑی تھی۔ پتہ نہیں وہ کچھ سن بھی رہی تھی یا نہیں اور اگر سن رہی تھی تو اس نے کچھ لینے کی کوشش کیوں نہیں کی۔

اس تاریکی سے کیوں نہیں نکلا۔ جس میں نور نے مجھے دھکیل دیا تھا۔ نور کی حالت دیکھ کر مجھے لگ رہا تھا کہ میں کچھ بول نہیں سکوں گا۔ اور اگر بولا تو وہ یقین نہیں کرے گی۔

وہاں موجود کمرے میں ہر شخص خاموش تھا۔ ایسی خاموشی جس کی تہہ میں کہیں اداسی ہوتی ہے۔

شہباز آگے بڑھا۔ اور اس نے میرے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ میں اس تھپڑ کے لیے تیار نہیں تھا۔ نہ مجھے پتہ تھا کہ وہ اس طرح مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا۔

میں ایک دم پلٹ کر پیچھے کی طرف گرا۔

"نکل جاؤ ہمارے گھر سے۔" اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہم عزت کی خاطر جان پر کھیل جانے والے لوگ ہیں۔ تو نے کیا سمجھا تھا کہ ہمارے گھروں کی لڑکیاں کیا انگریز لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ بے شرم اور بے حیا۔" میرا سر صوفے کی ہتھی سے ٹکرایا تھا۔ خون بہت تیزی سے بہتے ہوئے میری قمیص کو گیلا کر رہا تھا۔ اور مجھ میں بولنے کی بھی طاقت نہیں تھی ورنہ میں اسے بتاتا کہ جس عزت کے لیے وہ جان پر کھیل جانے کی بات کر رہا ہے۔ وہ عزت اب بے خیال ہے۔

میں نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو کھولا۔ اتنی مشکل سے کہ میرے سر میں ٹیس سی اٹھنے لگی۔

مجھے لگا کہ میں نے اس وقت زبان نہیں کھولی تو عمر بھر پھر کچھ بھی کہہ نہ سکتا ہوں۔ وقت کا یہ بے رحم مشتعل لمحہ ساری عمر اپنی جگہ پر ساکت رہ جائے گا۔ اور جب میں نے ہمت جمع کر کے کچھ کہنا چاہا تو عائلہ کی آنسو بھری آنکھوں نے کچھ کہنے ہی نہیں دیا۔

عائلہ نے بتایا تھا کہ یہاں رسم و رواج کے نام بہت عجیب بلکہ خطرناک رسمیں ہیں۔ وہ ہمت جو میں نے بڑی مشکل سے اکٹھی کی تھی۔ اس کو ایک سیکنڈ لگا ختم ہونے میں۔

میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں تھا۔

شاید ملازم مجھے وہاں پہنچا گئے تھے۔ میں تھی ہی دیر دیکھتے ہوئے سر کے ساتھ وہ سارے حادثے سوچتا رہا جن کو رونما ہونے میں ایک لمحہ لگتا اور سب کچھ جیسے کہیں ختم ہو گیا۔

شدت سے طلب ہو رہی تھی کہ ایک کپ کافی مل جائے تو میں شاید کچھ سوچنے کے قابل ہو سکوں کہ آخر ہوا کیا؟

وقت اتنی جلدی کس طرح بدل سکتا ہے ابھی تو میں نے خواب دیکھنے کیے تھے۔

اپنے گھر کے۔ نور کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب۔

ان لمحوں کی سرشاری کو محسوس کرنے کے خواب جو نور کے ساتھ گزرتے۔

اس محبت سے لطف اٹھانے کے خواب جو مجھے اس سے تھی۔ اس کی ساری عجیب و غریب حرکتوں اور باتوں کے باوجود۔ کبھی ایک لمحے کو بھی میرے میں خیال نہیں آیا۔ کہ میں اس کی محبت سے دستبردار ہو جاؤں' نہ میں نے یہ سوچا کہ اس کی محبت میرے دل سے ختم ہو جائے۔

"اور اب اب..." میں نے کروٹ لینی چاہی تو میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ سر میں جہاں چوٹ لگی تھی۔ شدید درد ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا میں خود سے کروٹ بھی بدل نہیں سکتا۔

اس وقت ممی بہت یاد آئیں۔ میں کبھی ہلکا پھلکا سا بیمار بھی پڑ جاتا۔ تو ممی میرے بستر کے قریب ہی اپنا بستر لگا لیتیں۔

کبھی سوپ، کبھی جوس پھر ہلکے ہلکے سر دباتیں۔

محبت کی جائے۔ ہمیں چاہا جائے۔ یہ آرزو دل کے اندر سے کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟

جا کر بے حس لڑکی کو جھنجھوڑوں۔ ممی کو فون کروں۔ کہ بس میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ ایک دن میں پاکستان آ جائیں۔

"میں سوچتا رہا۔ اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ بس صرف اس ایک لڑکی کا نہیں سوچا۔ جو کل تک سب سے اہم کردار تھی۔

عجیب بات تھی۔ مگر مجھے ایک لمحہ کو بھی خیال نہیں آیا۔

جس وقت ملازم میرے لیے کافی اور دوا لے کر آیا۔ میں اس وقت بھی نیم غنودگی ہی میں تھا مگر پوچھنا نہیں بھولا کہ یہ ساری مہربانیاں کس نے کی ہیں؟ شاید دل کو اب بھی اندر کہیں خوش فہمی تھی کہ نور کو میرا کچھ تو خیال ہو گا۔ مگر ملازم نے بتایا۔

"نیلی بی بی نے بھجوائی ہیں۔"

کافی پینے اور دوائی کھانے کے بعد تھوڑی دیر میں کمی واقع ہوئی۔ مگر کیا واقعی کسی تکلیف میں کمی ہو سکتی تھی۔ یا زندگی کے بہت سارے دھوکوں کی طرح یہ بھی ایک دھوکا تھا جو میں خود کو دے رہا تھا۔

میں نے تکیے پر سر رکھ دیا۔ اتنی سی دیر میں کافی نے نڈھال کر دیا تھا۔

"اب تم کیا کرو گے مسٹر خضر؟" میں نے خود سے سوال کیا۔

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے سوچا ہوا ہو گا کہ چار مہینے میں زندگی اتنے روپ بدل کر سامنے آئے گی۔

مجھے لگ رہا تھا۔ وہ میرا وجود نہ ہو۔ برف کا بے جان ٹکڑا ہو۔ نہ جانے کتنی دیر اس کیفیت میں رہا کہ پھر دروازہ کھلا۔ اب دروازے میں شہباز کے چہرے پر کینہ توز مسکراہٹ تھی۔

"تم اپنے آپ کو بہت اسمارٹ آدمی سمجھتے ہو نا؟" اس کے لہجے میں بے طرح نفرت تھی۔

"سب کچھ اس طرح نہیں ہوتا۔ جس طرح آدمی سوچتا ہے۔"

میں خاموشی سے یک ٹک اس کی آنکھوں میں گھورتا رہا۔

"کاش یہ خاموش ہو جائے کسی طرح۔" میں نے خواہش کی کہ اب مزید کچھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ جھنجلایا۔

"اب تنہائی کی۔ ممی ڈیڈی۔ جس نے بہت عرصے سے تم کو پالا ہوا تھا آج ہوا تھا اس نے اٹھا لیا ہے کیا محسوس کر رہے ہو...؟"

اس کے لہجے میں اب زہر تھا۔ اور میں حیران تھا۔ اس بات پر کہ مجھ سے کوئی اتنی نفرت کر رہا تھا۔ اور مجھے خبر ہی نہیں تھی۔

"بہتر یہی ہے کہ تم جلد ہی اپنا انتظام کر لو۔"

"تمہیں یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

"تم نے کیا سمجھا تھا کہ تمہارا جو دل چاہے گا۔ کر لو گے؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں سمجھا تھا۔ نہ میں نے ایسا کچھ کیا۔" میرا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ "اور یہ بھی جانتے ہو کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"بکواس نہیں کرو۔ ورنہ اسی وقت دھکے دے کر ملازموں سے باہر نکلوا دوں گا۔ اور مجھے کوئی روکنے والا بھی نہیں ہو گا۔"

"میں تمہاری کوئی بات نہیں سن رہا۔ میرے کمرے سے باہر جاؤ۔" میں اٹھ نہیں سکتا۔ مگر خضر کا یہ بولا۔ مجھے میرے پاتھ سے بہت دور نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میرے لہجے سے وہ بات سمجھ جائے۔ اور واقعی عقل اس میں سر حال تھی کہ اس نے بات سمجھ لی اور باہر چلا گیا۔

نور نے مجھ سے کیسی محبت کی تھی اور محبت کی بھی تھی یا نہیں۔ محبت میں بدگمانی آ جائے تو وہ محبت کہاں رہتی ہے۔

بھولا نے سمجھایا۔ اتنے جذباتی نہ ہو خضر! زندگی جذباتی باتوں کے سہارے نہیں گزرتی۔ کوئی اگر روٹھ جائے تو اسے منا لو۔ یہ سیدھا سادا سا حل ہے۔ لیکن اب کوئی چیز بھی آسان نہیں رہی تھی۔ یہ مجھے ایک ہفتے کے بعد پتا چل گیا۔

☼ ☼ ☼

آپ ایک گھر میں رہتے ہوں۔ جہاں چار مہینے آپ نے بہت اچھے گزارے ہوں وہاں سب لوگ ایک دم سے اجنبی بن جائیں۔ تو کیا محسوس ہوتا ہے؟

شہباز آتے جاتے مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس دن کے بعد۔ اس نے مجھ سے الجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا۔ جنہیں صرف طاقت کی زبان ہی سمجھ میں آتی ہے۔

نیلی کے چہرے پر زردی سی چھائی رہتی تھی۔ اس کی خوب صورت قل قل کرتی ہنسی نے چپ کی چادر اوڑھ لی تھی۔

اور نور کو میں نے اس دن کے بعد سے نہیں دیکھا تھا۔ جس کا رد عمل کیا ہوا میں نہیں جانتا تھا۔

مجھے بس اتنا پتا تھا کہ مجھے چاہے نور پر جتنا بھی غصہ ہو لیکن میں اس کی آواز سنوں گا اس کے چہرے کو دیکھوں گا۔ تو وہ غصہ ختم ہو جائے گا۔ وہ تتلی کہیں بھاگ دن گزار جائے گی۔

لیکن وہ نظر تو آئے۔ وہ کہیں دکھائی تو دے۔ ساتھ ہی میں نے ممی کی جان کھائی تھی کہ بس وہ کسی بھی طرح پاکستان آ جائیں۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے خضر! تمہارے بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اور تم وہاں نے بچے بنے ہوئے کہ جب چھوٹے تھے تب مجھے پریشان نہیں کیا اور آج بڑے ہو کر۔"

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے کتنی پریشانی ہو رہی ہے۔ جیسی جرح اس بات پر ہوتی ہے کہ اکیلے آدمی کو گھر نہیں دیا جائے۔ اس سے آدھی بھی محنت کسی اور بات میں کر لی جاتی۔ تو پاکستان کتنی ترقی کر چکا ہوتا۔

میں اب بھی وہ سب کچھ سوچتا تو یوں لگتا تھا جیسے میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ ابھی آنکھ کھلے گی تو سب کچھ پہلے کی طرح ہو گا۔

مگر اب کبھی کچھ بھی پہلے کی طرح نہیں ہونا تھا۔

وقت ہمیں جو کچھ دے کر گزر جاتا ہے ہمیں اسی سے اپنا دامن بھرنا ہوتا ہے۔ چاہے وہ خوشی ہو یا غم۔ اور حقیقت یہ تھی کہ اب وقت کے پاس میرے لیے کوئی

اچھی خبر نہیں لائی تھی۔

کل رات کو میں نے نور کو دیکھا تھا۔ اور یہ وہ نور نہیں تھی جسے میں نے دیکھا اور چاہا تھا۔

وہ کوئی اجنبی نور تھی۔ جس نے خود اپنے آپ کو مار ڈالا تھا اور مجھے بھی محبت کرنے والے اتنے ظالم کیسے بن جاتے ہیں میں سمجھ ہی نہیں سکا۔

وہ میری ہر راہ سے بچ کر نکل رہی تھی۔ راستے کو بند کر رہی تھی۔ کبھی دل زیادہ گھبراتا تو میں باہر نکل جاتا۔ ایک دو گھنٹے باہر زیادہ سرد ہوا۔ میں گزار کر گھر پہنچتا تو پھپھو اور نیلی میری منتظر ہوتیں۔

"پھپھو نہ جانے مجھے کتنا جانتی تھیں۔ اور کتنا نہیں مگر انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ اور نیلی کہتی۔

"خضر بھائی! میں اتنی شرمندہ ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔ میں زندگی میں بہت سارے حادثوں سے گزری ہوں۔ ہر حادثے نے مجھے باہمت ہونے کا سبق دیا۔ لیکن اب کوئی سبق یاد نہیں۔ دل چاہتا ہے کہ موت آجائے۔"

"نیلی اس طرح کی باتیں نہیں کرو۔ تمہاری ابھی کوئی عمر نہیں ہے۔ جو تم موت کی بات کرو۔"

"جو حادثے گزرے وہ بھی تو چھوٹے نہیں تھے۔ خضر بھائی آپ نور سے بات کیوں نہیں کرتے۔"

"میں نہیں کرتا۔" میں نے تھکے لہجے میں کہا۔

"پندرہ دن میں تین دفعہ وہ مجھے نظر آئی۔ اور ان تین دفعہ میں اس نے مجھے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں ہوں۔ نیلی! ایک لمحے کو تصور کرو کوئی آپ سے ناراض ہو تو آپ اسے منا سکتے ہیں لیکن آپ کسی کو نظر ہی نہیں آرہے ہوں تو وہ بندہ کہاں جائے؟"

"آپ ان کو نظر نہیں آرہے آپ کو تو وہ نظر آرہی ہیں نا۔" نیلی نے جھنجلا کر کہا۔ "ایک دفعہ بات کر کے دیکھ لیں صرف آپ کا نقصان نہیں ہوا ہے۔ کچھ غبار ان کے دل میں بھی ہوگا۔ ایک دفعہ بیٹھ کر سارے مسئلے ختم کرلیں۔"

"جو شخص یہاں رہ رہا ہے وہ مسئلوں کو کبھی ختم نہیں ہونے دے گا نیلی۔"

"اور جو شخص یہاں سے جا رہا ہے وہ بھی مسئلے ختم کرنے کے لیے کچھ نہیں کر رہا ہے۔"

وہ مجھے ہی باتیں سنا رہی تھی۔ لیکن اب میں اسے کیا بتاتا جب بھی وہ نظر آئی تھی میں نے اپنی ساری انا کو ایک طرف رکھ کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کی مکمل اجنبیت مجھے مزید اپنے حوصلوں کو آزمانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

جب آپ محبت کے گلاب چن رہے ہوتے ہیں تو آپ کو نہیں پتہ ہوتا کہ آپ بہت سارے غم جمع کر رہے ہوتے ہیں۔ یاد کرنے کے لیے۔

اور نور کے پاس اب صرف یادیں تھیں۔ درد تھے اور غم تھے اور اب اس غم میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔

پچھلی رات کو بڑے تایا آئے تھے۔ شہباز کے رشتے کے لیے۔ اسے بہت دنوں سے اندازہ تھا کہ پورے خاندان کا یہی ارادہ ہے اور اس نے سوچا تھا چاہے کچھ ہو جائے۔ وہ کبھی بھی اس رشتے کے لیے ہاں نہیں کرے گی۔ اسے کبھی بھی اپنا باپ اور ان کا خاندان پسند نہیں رہا تھا۔ جن کے پاس بہت دولت تھی مگر اسے وہ سارے لوگ انسانیت سے عاری لگتے تھے۔

"تین دن پہلے حشمت علی نے اسے کمرے میں بلایا تھا اور کہا تھا کہ "شہباز اچھا لڑکا ہے۔"

پتہ نہیں ان کے نزدیک "اچھے" کی کیا تعریف تھی۔

اسے تو یہ پتا تھا کہ دنیا میں کوئی مرد اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس نے جتنے مردوں کو دیکھا تھا۔ وہ سب ہی کردار کے لحاظ سے بڑے عجیب لوگ تھے۔

مگر جو ہوا۔ وہ کچھ اتنا عجیب تھا کہ وہ کئی راتوں تک سو نہیں پائی تھی۔ اسے لگتا ابھی وہ سوئے گی۔ اور کسی

کی چیخوں سے اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ پھر اس کے آنسو بہیں گے پھر اس کے آگے نور کو لگتا جیسے اس کی سانسیں کہیں اندر ہی اندر گھٹ جائیں گی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے جان ہو جاتے۔ کتنی دیر گزر جاتی اور وہ اسی کیفیت میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہتی۔ اس نے نفس سے بھی ریاضت کر رکھا تھا۔ لیکن زندگی کے معاملات الگ کر دینے سے زندگی تو نہیں ختم ہو جاتی۔ وہ اپنی جگہ چلتی رہتی ہے۔

وہ اب سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ کیا ہوا تھا۔ جو ہوا اچھا ہوا تھا۔

جو خواب ٹوٹا شکر کہ جلدی ٹوٹ گیا۔ اور جو دل ٹوٹا تھا اب اس کا مداوا کوئی نہیں تھا اور دل تک کب کسی کی نظر جاتی ہے۔

وہ بہت ضبط کرتی۔ اپنی طرف سے بہت برداشت کا مظاہرہ کرتی۔ خودداری اپنی عزت اسے بہت عزیز تھی۔ شاید سب ہی لوگوں کو ہوتی ہو لیکن اس نے اپنے گھر میں اس لفظ کی جتنی پامالی دیکھی تھی۔ اس چیز نے اسے بہت حساس بنا دیا تھا۔ اب اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ ایک عزت کے سوا۔

اس نے شہباز کے رشتے کے لیے بھی اسی لیے ہاں کر دی تھی۔

"خاندان کے باقی لوگوں سے کچھ علیحدہ ہی تھا۔ اس نے ہمیشہ نور کی عزت کی تھی۔ اس کے سخت رویے کے باوجود اس نے کبھی بھی اس کی بات کا برا نہیں مانا تھا۔

کبھی اس کی عزت میں کمی نہیں کی تھی۔

سب کچھ بظاہر اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ لیکن پھر بھی نور کو لگتا کہ اس کے اندر سے کوئی آگ اٹھتی ہے۔ جس کے ان دیکھے شعلے اس کو جھلسا رہے ہیں۔ اسے لگتا زندگی کو سیدھے راستے پسند ہی نہیں ہیں۔

جس دن نور نے حشمت علی کو ہاں کی تھی۔ اس دن سے حویلی پر جیسے کسی آسیب نے قبضہ کر لیا تھا اتنی ویرانی اور سناٹا تھا کہ لگتا تھا کہ اب یہاں انسان نہیں روحیں بسیرا کرتی ہیں۔

نیلی اس دن کے واقعہ کے بعد ویسے ہی گم صم رہتی تھی۔ اس کا ہنسنا بولنا سب ختم ہو گیا تھا۔ لیکن جس دن گھر میں اس خبر کی بازگشت پھیلی وہ اس دن بہت روئی۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا نور! کوئی اپنے ساتھ اس طرح بھی دشمنی کرتا ہے۔ اتنا غلط فیصلہ ——— کہ کبھی واپس دیکھیں۔ تو پتھر کی ہو جائیں۔"

اور نور اسے بتا نہیں سکی۔ اب وہ کبھی پتھر نہیں ہوسکے گی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی پتھر کی بن چکی ہے۔

"ایک دفعہ نور! میری بات مان لیں۔ آپ جا کر کہہ دیں منع کر دیں اس رشتے سے۔"

"اس کے لیے؟" اس کی خاطر نیلی؟ دنیا بڑی خراب جگہ ہے۔ اس اتنی بڑی دنیا میں ڈھونڈنے سے ایک اچھا انسان بھی نہیں ملتا۔"

"خضر۔۔۔" نیلی نے کچھ کہنا چاہا۔

مگر نور کی آنکھوں میں امنڈتی ہوئی دیوانگی دیکھ کر چپ ہو گئی۔

"دنیا! آج تو نام لے لیا ہے۔" اس نے کرسٹل کا شو پیس پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔

"مجبور سے ہوتے ہیں ان کا [illegible] لیکن جو اچھے نظر آتے ہیں۔" نیلی نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"تمہیں یاد ہے نور! تم اکثر خلیل جبران کا یہ مقولہ دہراتی تھیں۔

"اگر تم وہ دیکھتے ہوئے جو روشنی ظاہر کرتی ہے اور وہی سنتے ہو جس کا اقرار آواز کرتی ہے تو در اصل تم نہ دیکھتے ہو۔ اور نہ ہی سنتے ہو۔"

اور آج مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ہم چاہے جتنا علم حاصل کر لیں جتنی ڈگریاں لے لیں۔ اور چاہے جتنی چیزیں رٹ لیں مگر جب وقت آتا ہے تو ہم نہ دیکھ پاتے ہیں نہ سن پاتے ہیں۔"

نیلی یہ کہنے کے بعد ٹھہری نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

تایا جان اور تائی امی بہت سارے لوازمات کے

ساتھ آئے تھے۔ آتے ہی تائی جان نے نور کی بلائیں لیں۔ شہباز ان کا بڑا بیٹا تھا۔ انہیں سارے ارمان پورے کرنے تھے۔

بہو انہیں کچھ خوش نہیں لگی۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا وہ حسین تھی پھر پڑھی لکھی تھی اور پھر اتنی جائیداد زمین کی مالک۔ اتنے نخرے تو برداشت کرنے ہی تھے۔ خاندان بھر میں ایسی بہو کس کے پاس آنا تھی۔ جوان کے پاس آنے والی تھی سو سب ٹھیک تھا۔ سب سے بڑھ کر ان کا بیٹا بہت خوش تھا۔

پہلے تو یہی تھا کہ منگنی ہو جائے مگر شہباز کے دل میں بہت سارے خدشات تھے۔

"نہیں بس نکاح اور رخصتی۔"

"لڑکی اپنی ہی ہے کوئی بھاگی تو نہیں جا رہی۔"

"اس نے کہا کہ لڑکی اپنی ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔ وہ جلدی ہو۔"

کیسا عجیب سا جملہ تھا۔ عائلہ نے بھائی کی شکل دیکھی۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ بس تمیز نہیں کر پائی۔ کہ یہ کس چیز کی چمک ہے۔

کسی لڑکی کو پالینے کی یا اس کی دولت کو حاصل کر لینے کی۔

وہ دولت جس پر بہت عرصے سے اس کے بھائی اور باپ کی نظر تھی۔

☼ ☼ ☼

میں نے وہ فیصلہ کیوں کیا۔ مجھے خود نہیں پتا زندگی میں بہت ساری ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو ہو جاتی ہیں۔ اور یقیناً" ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی۔ بس ہمیں صحیح اب معلوم نہیں ہوتا۔

میں نے دنوں تک اس "کیوں" کا جواب سوچنا چاہا لیکن مجھے جب جواب نہیں ملا۔ تو میں نے اس کھوج کا پیچھا چھوڑ دیا۔

ممی میرے فیصلے سے خوش نہیں تھیں۔ اور میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میرا دل بھی میرے فیصلے سے خوش نہیں ہے۔ لیکن میرے دل و دماغ پر ایک بوجھ ہے۔

میں جہاں سے آیا تھا۔ وہاں ایسی بے بسی نہیں تھی۔ لڑکیاں اتنی آزاد تھیں کہ کبھی کبھی مجھے ان کے وحشی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اور میں یہاں نیلی کو دیکھ کر تو مجھے عجیب سا گمان ہوتا۔ وہ یہاں رہتے ہوئے خوف زدہ بھی تھی۔ اور یہاں رہنے پر مجبور بھی اگر میری شادی نور سے بھی ہو جاتی تب بھی میں نور سے یہی کہتا کہ اسے اپنے ساتھ لے کر چلو۔

اور اب بھی جب نور میری زندگی سے نکل گئی تھی میں نیلی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اس فرق کے ساتھ کہ اب وہ میری زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت اچھا گھر تھا۔ کافی بڑا سا۔ میں نے اسے نیلی کے نام سے ہی لیا تھا میرا دل چاہتا تھا کہ نیلی اس گھر کو سجائے 'سنوارے' اور خوش رہے اور وہ کام تو اس نے کر لیے وہ دن رات اس گھر کو سجاتی رسالوں میں سے تصویریں دیکھ دیکھ کر اسی طرح کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ قدرتی طور پر ذہین تھی۔

لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ وہ خوش رہنے کی کوشش ضرور کرتی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں کی اداسی اس کے پورے چہرے اور جذبات کی نفی کر دیتی تھی۔

"ایسا کیوں ہے نیلی؟"

بہت دنوں کے بعد ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے سوال دہرایا تو اس نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں ان میں آج بھی آنسو تھے۔

"میں اس لیے خوش نہیں رہ پاتی ہوں کہ آپ خوش نہیں ہیں جو کچھ بھی ہوا اس میں کہیں بھی میرا قصور نہیں تھا۔ جس شخص کے لیے میں نے ہمیشہ یہ دعا کی تھی کہ وہ خوش رہے میری وجہ سے۔۔۔" اس کی آواز اور لہجہ دونوں میں اذیت تھی۔

بہت دنوں میں بھٹکتا تھا۔ اپنے اندر کی گھٹن اور

اذیت سے لڑا تھا۔

جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہوتا تھا اور جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہوا تھا" میں جانتا تھا۔ بہت وقت لگ جائے گا۔

لیکن نیلی کے صرف دو جملوں نے جیسے میری ساری اذیت کو تحلیل کر دیا۔ میں بہت دنوں بعد دل سے مسکرایا۔ وہ میری وجہ سے پریشان تھی۔ اس کی اداسی کا سبب میں تھا۔

"تمہیں ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ میں خوش ہوں نیلی!"

"جو خوش ہوتے ہیں انہیں زبان سے بتانا نہیں پڑتا۔" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آواز میں ہلکی سی لرزش۔

"دیکھو نیلی!" میں نے اس کا برف جیسا سرد ہاتھ تھاما اور اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اور نظر بھر کر دیکھا تب پتا چلا کہ وہ کتنی خوب صورت ہے۔

وہ سراپا محبت تھی۔

"وہ سب کچھ جو کہیں پیچھے رہ گیا ہے" اس کے لیے ہم آج کیوں برباد کر رہے ہیں نیلی؟" میں نے نرمی سے کہا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ آئی۔

"وہ سب کچھ جو پیچھے رہ گیا ہے" یہ جملہ صحیح نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا وہ ہمارے ساتھ ہے اسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔"

"بھولنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں؟"

"لیکن میں بھولنا نہیں چاہتی۔" اس کا لہجہ ضدی اور اٹل تھا۔

اور میں اس ضدی نیلی سے واقف نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گیا" کہنے کو اب کچھ رہا ہی نہیں تھا۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کیا؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔

"نیلی! تمہیں جو کچھ کہنا ہے" تم آرام سے کہہ دو" میں یہیں تمہارے پاس موجود ہوں" لیکن آپ جناب سے بات نہیں کرنا۔" میں نرمی سے کہتے ہوئے اسٹول گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گیا۔

"ہاں بتاؤ۔"

اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا' وہ بے ربط جملے تھے۔ بے یقین باتیں تھیں۔ جو اگر نیلی کی زبان سے ادا نہیں ہوتیں تو میں کبھی یقین نہیں کرتا۔

دنیا چاند پر جا چکی ہے 'زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے' اب کس کو فرصت ہے کہ بیٹھ کر سچائیوں کو کھوجے۔

میں نے بہت کچھ کھویا تھا اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ جو کچھ پایا۔ وہ بھی کم نہیں ہے۔

"مجھے یہ احساس جرم ستاتا ہے کہ اس رات میں زبان کھول دیتی تو۔ اس رات نے تم سے سب کچھ چھین لیا۔ اس رات نے مجھے بہت نواز دیا" اس رات بہت کچھ بدلا تھا" جس میں سر فہرست میرا نصیب تھا" میں اتنے بہت زیادہ کے قابل نہیں تھی۔"

"آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" وہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی۔

"تم اتنی جلد خوف زدہ کیوں ہو جاتی ہو؟" میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ "زندگی کو جتنی سزا دینی تھی' اس نے دے دی۔ اب زندگی کے پاس جو خوشی کی چیزیں ہیں وہ بھی تو ہوں گی۔ آج انہیں تلاش کرتے ہیں وہ چیزیں ہمیں آسانی سے نہیں ملیں گی' لیکن اگر ہم کوشش کرتے رہے تو وہ ضرور ایک دن ہمارے پاس ہوں گی۔" میں نے اسے نرمی سے سمجھایا' پتا نہیں اس نے کتنا سمجھا کتنا نہیں۔ لیکن اس کے چہرے پر پھیلے وحشت اور خوف کے سائے تھوڑے کم ضرور ہو گئے۔

"میں ایک بات کہوں؟"

"بولو۔"

"مجھے نور العین بہت یاد آتی ہے۔ آپ کو بھی یاد آتی ہے؟" اس نے اپنی سنہری آنکھیں مجھ پر جماتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا جواب دوں؟" کمرے میں اے سی چل رہا تھا' تب بھی مجھے بے پناہ گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ جھوٹ

بولنے کی عادت نہیں تھی اور سچ اتنا قابل قبول ہو سکتا ہے۔

"نیلی! جو کچھ ہوا، وہ بہت تھا ایک عمر کے لیے۔ کچھ وقت لگ جائے گا۔" اس سے آگے میں خاموش ہو گیا۔

"ہاں کچھ وقت لگ جائے گا" مگر نورالعین! میں تمہیں بھلا ہی دوں گی۔"

"چھوڑو کوئی اور بات کرتے ہیں۔" میں نے کہا ضرور لیکن ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہو سکی۔

نارمل باتیں کرنا شاید پھر آسان ہو۔

نارمل زندگی کی طرف آنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

✡ ✡ ✡
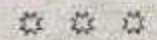
اس کی شادی طے ہو چکی تھی۔ کارڈ چھپ کر آ گئے تھے، ساری تیاریاں تقریباً" مکمل تھیں پھر بھی نور کو ایسا لگتا یہ شادی نہیں ہو رہی ہے کچھ اور ہے۔ دل اندر سے بالکل خالی لگتا تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ کسی دن بہت روئے، لیکن کس بات پر؟ زندگی کے سارے فیصلے تو خود کیے تھے، اور بندہ بڑی عجیب چیز ہے، ہر حال میں بے سکون ہی رہتا ہے۔ تقدیر اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، تدبیر سے وجہ گمان رہتا ہے۔ کیا فائدہ۔

تقدیر اب کون سا منظر کھولنے والی ہے؟ اس کا دل چاہتا میرون رنگ کے سنہری کارڈ کو آگ لگا دے، بلکہ اس پوری دنیا کو، ہر چیز جل کر راکھ ہو جائے، نہ خواب بچیں نہ ان کی راکھ۔

مگر آنکھ کھلتی تو کارڈ بھی سامنے رکھا ہوتا اور اس کے خواب بھی۔

ایک مہینہ یوں لگتا جیسے ایک صدی۔ جو گزر کر نہیں دے گی۔

نہیں کچھ غلط ہو رہا تھا یا ہو چکا تھا۔ کیا؟ سوچتے بیٹھتی تو وہ براؤن مسکراتی آنکھیں سامنے آ جاتیں پھر ان آنکھوں کا رنگ بدل جاتا، اس چہرے کا تاثر بدل جاتا، وہاں مسکراہٹ نہیں تھی، صرف ایک تلخی تھی۔ یہاں سے وہاں تک مگر کس لیے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ چوٹ تو اس نے کھائی تھی زخموں سے ابھی بھی لگتا جیسے خون رس رہا ہو، ابھی بھی وہ راتوں کو ایک دم سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔

یوں لگتا جیسے نیلی کی چیخیں ہر جگہ سے آ رہی ہوں، نیلی کی وحشت بھری چیخیں اور اس شخص کا بھیانک روپ۔

چہرے اتنے کیسے بدل جاتے ہیں۔

لمحے بھر کی بات کس طرح پھیل کر پوری زندگی کی جگہ لے لیتی ہے۔

بہت تھوڑے سے وقت میں عمر بھر کا سرمایہ کیسے ختم ہو جاتا ہے؟

✡ ✡ ✡

"مجھے لگتا ہے میں نے کسی مٹی کی مورت سے شادی کر لی ہے۔" شہباز جھنجلا جاتا۔ "تم زندگی سیدھے سادے طریقے سے کیوں نہیں گزارتیں؟"

"زندگی نے کبھی میرے ساتھ سیدھا رویہ اپنایا ہے؟ کوئی چیز مجھے سیدھے طریقے سے ملی ہے، جو زندگی سیدھی سادی گزر جائے۔" نور کے لہجے میں تلخی تھی۔

"اچھا۔ اچھا؟" شہباز کا اچھا بہت طویل تھا۔ "کون سی چیز تمہیں نہیں ملی ہے۔ میرا تو خیال ہے ایک لڑکی کو جن چیزوں کی خواہش ہو سکتی ہے وہ ساری چیزیں تمہیں حاصل ہیں۔ اب آسمان سے چاند تو کوئی توڑ کر نہیں لا سکتا، بلکہ جن کا مقدر ہی چاند جیسا ہو انہیں اس کی تمنا کرنی بھی نہیں چاہیے۔" آخری جملے کے آنے تک اس کی آواز میں استہزا سا آ گیا۔

"تم جانتی ہو، شادی والے دن لوگ تمہاری قسمت پر کتنا رشک کر رہے تھے۔"

"قسمت اگر ماتھے پر لکھی ہوئی ہوتی تو کیا تب بھی لوگ رشک کرتے؟" اس نے سر اٹھا کر شہباز کو دیکھا۔

"یہ دانشوروں والی باتیں یہاں اس کمرے میں نہیں چلیں گی، آئی سمجھ میں بات؟" شہباز نے غرا کر

کہا۔
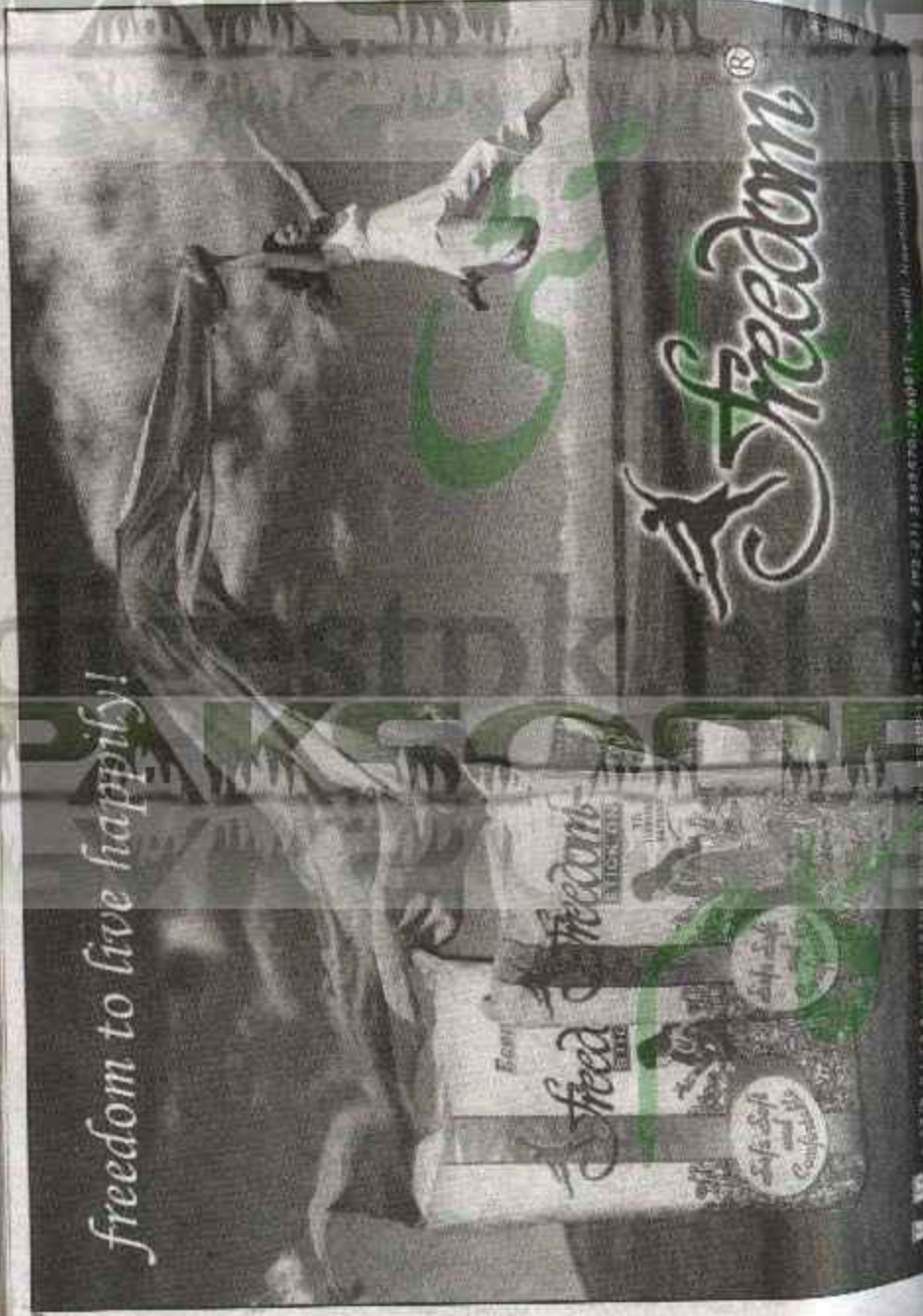
"دانشوروں والی باتیں۔" نور کا دل چاہا وہ اتنا ہنسے کہ پھر زندگی بھر بھی ہنسنے کی حسرت نہ رہے' "دانش مند کہاں کی تھی وہ؟ ایک ذرا سا فیصلہ تھا اور زندگی تپتا ہوا صحرا۔ خوشی کی ننھی سی رمق بھی پل میں جاتی نہیں تھی اور خوابوں کو بھی نیند نہیں آتی تھی۔"

اس کے کمرے میں دو ٹن کا اے سی تھا۔ دبیز قالین' بھیشم کی لکڑی کا بنا مہنگا ترین فرنیچر' امپورٹڈ فانوس مگر یہ ساری وہ چیزیں تھیں۔ جو اس کے میکے میں بھی تھیں کوئی چیز بھی اس کے لیے نئی نہیں تھی' اس ایک چیز کے علاوہ جو وہاں بھی کم کم تھی اور یہاں پر تو اس کا گزر بھی نہیں تھا۔ سکون۔

نور کو یوں لگتا جیسے مدت گزر گئی ہے اور اور یہ لفظ کبھی بھی اس کی زندگی میں نہیں آئے گا۔ وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھے گزار دیتی۔ اپنے عکس کو اجنبی نظروں سے دیکھتے' پھر دیکھتے دیکھتے آئینے سے وہ عکس ہٹ جاتا اور اس کی جگہ ایک اجنبی شخص کی تصویر ابھر آتی۔

"میں اس سے اتنی ہی نفرت کرتی ہوں' جتنی نفرت کرنی چاہیے اور اس بات کو اگر میرا دل نہیں سمجھتا تو ایک دن ضرور اس دل کو بھی یہ بات سمجھ میں آجائے گی۔"

عائلہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کو آئینے سے باتیں کرتے دیکھ کر ڈر گئی۔

"نور! تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے آہستہ سے نور کے کندھے پر ہاتھ رکھا' لیکن نور جس طرح ڈری اس نے عائلہ کو شرمندہ کر دیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" نور نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" عائلہ بوکھلا گئی "میں یوں ہی پوچھ رہی تھی۔"

"ہر بات یوں ہی نہ پوچھا کرو۔ کسی بات کی بہت کھوج میں رہو گی تو ہاتھ میں صرف سانپ آئیں گے۔ اور سانپ کا کام صرف ڈسنا ہوتا ہے' تم سمجھ رہی ہونا میری بات؟"

"عائلہ کو سانپ کے نام سے ہی الٹی آنے لگی' رات تک وہ بلاوجہ ہی دس مرتبہ اپنے ہاتھ دھو چکی تھی' پھر بھی اسے لگتا جیسے ہاتھوں پر کوئی چیز رینگ رہی ہے۔"

"اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا میں نے۔" وہ خوف زدہ ہو گئی۔ صرف سچ ہی تو چھپایا تھا' گواہی چھپائی تھی تو یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں' نبیلی بھی تو چپ رہی تھی' وہ ہی بول دیتی' وہ تو خوشی خوشی خضر سے شادی کرا کے بھی گئی۔ اس نے سوچا۔ خضر مل رہا ہے تو میں زبان کیوں کھولوں' پھر میں کیوں؟" اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا' وہ صرف ذرا سی بات نہیں تھی اس ذرا سی بات نے تین لوگوں کو برباد کیا تھا' آباد تو نبیلی بھی نہیں تھی۔

نہیں کوئی کسی کی زندگی نہیں برباد کر سکتا۔ سب نور کے اپنے فیصلے تھے۔ کون سی اتنی بڑی بات ہو گئی تھی۔ اگر وہ خضر کو قصوروار سمجھ رہی تھی تو معاف بھی تو کیا جا سکتا تھا' معاف کر دیتی تو اپنی زندگی بھی سکون میں گزارتی اور اوروں۔" عائلہ نے سر جھٹکا۔

رات کو شہباز گھر آیا تو اس نے ـــــ پی ہوئی تھی۔ حالانکہ ابا جی نے اسے کتنا سمجھایا تھا کہ شہر کی لڑکی آ رہی ہے' شہری لڑکیاں بہت تیز ہوتی ہیں' یہ سارے شوق اپنے باہر ہی پورے کر آنا۔

مگر صرف تین مہینے میں وہ اپنے اصل پر واپس آگیا تھا۔

"شرم کر۔" تائی نے اسے جھڑکا "چار مہینے کی بیاہی دلہن گھر میں ہے اور تیرے شغل میلے ہی ختم نہیں ہوتے۔"

"چار مہینے بہت ہوتے ہیں بے بے جی۔"

"تو اچھا نہیں کر رہا ہے شہباز' اکیلے ہی وہ بہت چپ چپ رہتی ہے۔"

"چپ رہتی ہے تو رہا کرے' بلکہ زیادہ بہتر ہے کہ اپنی اوقات میں رہے اور میری وجہ سے تھوڑی بہت

کو پیچھے چھوڑ کر آئی ہے' اس کا ہی دکھ ہے۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے اندر چلا گیا۔

"ہمیشہ کی عادت ہے۔" تائی جی نے سر جھٹکا۔ "پی کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ لو پیچھے ہے کون۔ ایک معذور ماں' اور دوسرا سارے زمانے کا عیاش اس کا باپ۔ مردوں کی بھی اپنی کھوپڑی ہوتی ہے' اپنے دل سے ہی سوچتے ہیں بھلا مردوں کو کیا پتا' جب عورتیں نکاح کے دو بولوں میں بندھ جاتی ہیں تو پچھلے رشتوں کو بھی پلٹ کر نہیں دیکھتیں' اپنا گھر اپنا شوہر ہی سب سے عزیز ہو جاتا ہے۔"

"صحیح کہہ رہی ہوں نا عائلہ؟" تائی جی نے عائلہ سے بھی تائید چاہی۔

"پتا نہیں۔" عائلہ نے بے زاری سے کہا "لیکن اگر شوہر واقعی شوہر ہو۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" تائی جی نے اعتراض کیا۔ "شوہر تو شوہر ہی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"نبیلی!" میں نے اسے آواز دی۔

"جی۔" وہ ایک دم بھاگتی ہوئی آئی۔ "کوئی کام ہے؟"

"یہ کیا بات ہوئی' میرا خیال ہے میں نے تمہیں کام کے لیے تو کبھی آواز نہیں دی' باہر میں اپنے سارے کام خود کرتا تھا اور ابھی بھی کرنے کی کوشش کرتا ہوں' اور بات کر لے اب تھوڑا سا کاہل ہو گیا' تم مجھے کچھ کرنے ہی نہیں دیتی ہو۔"

"میں۔ میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا۔" اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

"کیا نہیں چاہا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں' نہیں' اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ "میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ تمہیں میری عادت نہ پڑے' چیزوں کو ایک دن اپنے مقام پر واپس جانا ہوتا ہے۔"

"تم چیز نہیں ہو نبیلی۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"پتا ہے مجھے۔" اس کی مسکراہٹ آج بھی پھیکی تھی۔ "میں چیز نہیں ہوں' میں ایک ڈراؤنا خواب ہوں۔" اس کے دکھ اور لہجے کی شکستگی نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔

"اس طرح مت کہو نبیلی! اس طرح تو تم مجھے بھی کچھ بھولنے نہیں دو گی۔"

"میں چاہتی بھی نہیں ہوں کہ تم کچھ بھول جاؤ' کچھ چیزیں بھی بھولنے کے لیے نہیں ہوتیں' انہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے' جانے کب کون پلٹ کر آجائے۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "تم پلٹ کر آنے والوں کا انتظار کرتی رہو۔"

"کیا آپ انتظار نہیں کرتے؟"

"آپ نہیں' تم' ویسے ہی ہمارے درمیان اتنی دوریاں ہیں۔ اس پر تم آپ جناب کا تکلف نہیں ڈالا کرو اور دوسری بات یہ کہ مجھے خیانت پسند نہیں' ہر ایک نے کسی طرح ہی سہی۔ اپنی زندگی شروع کرلی ہے۔"

"نہیں' خضر۔" اس کا لہجہ ضدی تھا۔ "زندگی ہر ایک کے لیے شروع نہیں ہوتی ہے۔ کبھی تم نے آئینے میں اپنا چہرہ' اپنی آنکھیں دیکھی ہوتیں۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔" میں ـــــ کہا۔

"مجھے بہت فرق پڑتا ہے' مجھے تکلیف ہوتی ہے' کبھی مجھے لگتا ہے ہم لوگ زندگی میں کبھی ایک ـــــ اگر بات نہیں کر سکیں گے' مجھے تمہیں ہمیشہ بہت اوپر سر اٹھا کر دیکھنا پڑے گا' آپ ہمیشہ بلندی پر نظر آؤ گے اور میں نیچے کھڑے کھڑے تھک جاؤں گی۔"

"نبیلی! ایک وقت آتا ہے جب ہم سب کو کچھ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ اس سے کوئی کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں ہو جاتا۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

"میرا نام ممی نے رکھا تھا اور انہوں نے ہمیشہ مجھے خضر عارفین کے نام سے پکارا۔ انگلینڈ جیسی جگہ پر رہتے ہوئے بھی کبھی انہوں نے میرا نام نہیں بگاڑا' وہ کہتی تھیں میں نے تمہارا نام خضر رکھا ہے' کبھی اس کو برا نہیں کرنا اور وقت کو دیکھو۔" میری آواز بھاری

ہو گئی۔ مجھ سے کچھ لیا ہی نہیں گیا۔
ایک دم سے کوئی منظر جیسے پوری جزئیات کے ساتھ یاد آ گیا تھا۔

"اور کسی کو پتا ہی نہیں ان کے بیٹے کے ساتھ کیا کیا کچھ ہو گیا' کتنے بڑے بڑے الزام لگ گئے۔" میری آنکھوں میں جیسے دھند سی بھر گئی۔

بہت کچھ تھا' بہت دنوں کی تھکن تھی' بہت سارے لمحوں کی اداسی تھی' اپنے آپ سے لڑتے رہنے کی لاحاصل کوشش تھی۔

نیلی میرے لیے کافی بنا کر لے آئی' کمرے میں ملگجا اندھیرا اتر آیا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پردے برابر کیے کونے میں لگی فینسی لائٹ کو آن کیا' کمرے میں روشنی سی ہوئی مگر غبار آلودی۔

نیلی کا چہرہ لائٹ کے نیچے تھا اور اس میں سے جیسے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں' اس کے سنہرے بالوں کی خوشبو نے مجھے جکڑ لیا۔ پردہ ہلنے سے پلا اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ نیلی نہیں تھی' وہ تو نور تھی جو نہ جانے کس وقت اندر آ گئی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرنا چاہا لیکن پتا نہیں کس طاقت نے مجھے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ مجھے لگا مجھے اس وقت کچھ بھی نہیں بولنا چاہیے' کہیں یہ سحر' یہ طلسم ٹوٹ نہ جائے۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا' اس کی خوشبو کے سوا مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔

زندگی کے سارے فلسفے' وہ ساری لایعنی باتیں جو اب تک ہم کرتے آئے تھے۔ وہ سب کہیں پیچھے رہ گئے۔

صبح میری آنکھ کھلی تو نیلی سو رہی تھی۔ یہ سات ماہ میں پہلی دفعہ تھا کہ وہ میرے ساتھ تھی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف نگاہ کی' وہ سحر' وہ طلسم کہیں غائب ہو چکا تھا۔ میں نیلی کو دیکھتا رہا کھڑکیوں پر دبیز پردے تھے پھر بھی کہیں کسی جگہ سے سورج کی نرم شعاعوں نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ وہ چہرہ کل کی طرح آج بھی روشن تھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہ چہرہ ہمیشہ روشن رہے گا۔

کیونکہ روشنی تو اندر ہوتی ہے اور اس کا ظہور بھی اجلا تھا' یہ میں جانتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"سچ کہہ رہا ہوں نور العین صاحبہ! میں تنگ آ گیا ہوں' لوگ زندگی میں سکون کے لیے شادی کرتے ہیں اور میں نے عذاب گلے میں ڈال لیا ہے۔"

"آپ نے زندگی میں جن چیزوں کے لیے شادی کی تھی' وہ ساری چیزیں تو آپ کو مل گئیں' ایک سکون نہیں ملا تو کیا ہوا۔"

سکون زندگی میں تو نہیں مگر اس وقت نور العین کے لہجے میں بہت تھا۔ کیسے اور کس طرح؟ یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا۔

کوئی چیز باہر تھی۔

اور کوئی زہر اندر تھا جو پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے شہباز سے شادی کرتے وقت بہت زیادہ توقعات نہیں باندھی تھیں کیونکہ ایک بات تو اسے پتا ہی تھی کہ دنیا کا کوئی مرد بھی اچھا نہیں ہوتا' سب برے ہوتے ہیں۔ اپنے باپ سمیت ہر ایک سے متنفر تھی۔ اور کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ یہ صرف متنفر ہونا نہیں تھا' نفرت تھی حشمت صاحب سے۔

شہباز کی بہت ساری عیاشیوں کی داستان سن رکھی تھی' پھر وہ لوگ شہر میں شفٹ ہو گئے تھے۔

اور جب شہباز ان لوگوں کے پاس کراچی آیا تو اسے لگا کہ وہ کافی بہتر ہو گیا ہے' وہ اس طرح کا ہرگز نہیں تھا جیسا اس نے اپنے ذہن میں سوچا تھا۔

اب یہ اور بات کہ نیلی نے اسے کبھی بھی پسند نہیں کیا لیکن نور سے بہت دوستی ہونے کے باوجود اس نے کبھی نیلی کو نہیں بتایا کہ کیا وجہ ہے وہ شہباز کو پسند کیوں نہیں کرتی۔

پھر وہ سیاہ اندھیری رات آ گئی' جس نے سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا۔

ایک کے چہرے سے نقاب جلدی ہٹ گئی'

ہونے کی دیر سے' مگر دونوں نے ہی اسے مار دیا تھا' بیٹھے بیٹھے سوچتے اس کی نگاہ سامنے جائے نماز پر چلی گئی۔ پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا' ہر وقت ہاتھ دھوتی رہتی تھی اور جب وہ پوچھتی تو خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہتی۔

تائی جی اس کی وجہ سے پریشان رہنے لگی تھیں۔ ہر وقت اپنا سر جھاڑتی رہتی تھی' ایک دن بے خیالی میں کہنے لگی "میرے بستر میں سرسراہٹ ہوتی رہتی ہے جیسے سانپ کہیں چھپ بیٹھا ہو۔"

اور تائی جی نے لپک کر اس کا منہ بند کر دیا۔

"کنواری لڑکی اور سانپ آسیب کی باتیں۔ کل کو کہیں شادی بھی نہیں ہو گی۔"

آسیب والی بات پر تو ان کا بھی یقین تھا کہ ضرور گھر میں کہیں نہ کہیں آسیب ہے' جس نے چار دن بھی دلہن کو خوش نہیں رہنے دیا۔

پھر شہباز کا رویہ۔ زور زور سے چیخنا۔ چیزیں اٹھا کر پھینکنا' وہ اتنا غصیلا اور تند خو تھا کہ تائی جی کو بخوبی علم تھا کہ اگر دلہن اتنی ساری جائیداد والی نہیں ہوتی تو وہ تو اب تک [illegible] خوشی تو نہیں بھی کی کہ سو طرح جائیداد ہے مگر اس سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ بہو وہ نیک اور خوب صورتی کا ایسا چاند تھی کہ اندھیرے کمرے میں رکھ دو تو وہ بھی جگمگا اٹھے۔

انہوں نے ایک دفعہ پیار میں یہ بات دلہن کو بتا بھی دی' مگر دلہن خوش نہیں ہوئی اپنی تعریف سن کر' صرف اتنا کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہوتا تائی جی! جب دلوں میں اندھیرے ہوں۔"

"یہ آج کل کی لڑکیاں بڑی نازک ہوتی ہیں۔" تائی جی نے دل میں قیاس آرائی کی۔ "سمجھانا پڑتا ہے۔ دل مارنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر گھر بستے ہیں' پھر بھی تائی جی نے ہمت نہیں ہاری۔

"سارا وقت گھر میں بند رہتی ہو' ماں کو دیکھنے ہی چلی جاؤ' نہیں تو وہ جو تمہارا رشتہ دار خضر' جس کی شادی نیلی سے ہوئی ہے' وہیں چلی جایا کرو' شہباز نہیں لے کر جاتا تو عاکف ہے' گھر کا ڈرائیور' اس کے ساتھ چلی جایا کرو۔"

تائی جی نے دلہن کو خوش رہنے کے بہت سارے نسخے بتائے' نہ کوئی نسخہ ہی کارگر ہوا' نہ دلہن کے پھیکے پڑتے چہرے پر ہی کوئی سرخی آئی' تائی جی نے سیدھی بات ہی کر لی۔

"دلہن! مرد ذات ایسی ہی ہوتی ہے۔ کچھ برے ہوتے ہیں' کچھ زیادہ برے' مگر سب ایسے ہی ہوتے ہیں تو کیوں دل کا روگ بناتی ہے' ہنسا بولا کر' میں تو تم دونوں لڑکیوں کی وجہ سے بہت پریشان ہو گئی ہوں۔"

اور وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی رہی۔

یوں ہی بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ اپنے سفید موتی ہاتھوں پر چلی گئی' وہاں نیل کا بڑا سا نشان تھا۔ رات کو ہی شہباز نے پرفیوم اسپرے کرتے کرتے اسے کھینچ مارا تھا۔

"نور!" اس کا لہجہ سخت تھا اور وہ ٹوٹ بکھر اٹھی۔

"یہ جو تمہاری صورت پر ہر وقت سوگ چھایا رہتا ہے [illegible] اچھا آدمی نہیں تھا۔" اور یہ واضح بات تھی [illegible] شہباز نے شادی کے بعد [illegible] ورنہ ہر بات میں اس کی اپنی منطق تھی' زندگی بسر کرنے کے اپنے اصول تھے۔

اور یہ بات نور شہباز کو کس طرح سمجھاتی کہ وہ اس شخص سے کتنی نفرت کرتی ہے' جس کا حوالہ دے کر ابھی شہباز نے پرفیوم کی بوتل کھینچ کر ماری تھی۔

"بس اسی چپ پر مجھے غصہ آتا ہے' کوئی جواب نہیں' پہلے تو بہت بولتی تھیں۔"

"کیا جواب دوں۔" نور نے افسردگی سے سوچا' "نفرت کی کوئی شکل نہیں ہوتی کہ وہ اس کو دکھا سکوں۔"

اور ہر وقت' اور ہر بات میں میرے ماضی کو کھینچ کر لانے والے اس شخص کو کیا بتاؤں کہ اس نے مجھے حال کی کوئی بات سوچنے کے قابل نہیں رکھا ہے۔ ماضی کو کاٹ کر علیحدہ نہیں کیا جا سکتا' اسے کوشش کر کے

بھلایا جاتا ہے۔

اور یہ شہباز دونوں کلام نہیں کرنے دیتا اور پھر کہتا ہے کہ تمہاری صورت پر یہ سوگ کیوں چھایا رہتا ہے۔

زندگی اتنا بھیانک روپ سامنے لائے گی یہ خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے احساس ہوا کہ اس کے بازو پر پانی کے قطرے گرے ہیں۔

"بارش!" اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان بالکل صاف شفاف تھا۔ تب اسے اپنے گیلے ہوتے گال کا احساس ہوا۔

"اوہ!" نور نے دونوں ہاتھوں سے گالوں کو رگڑا۔ ایسا بھی ہوتا تھا۔

"نور!" نیلی نے اس کا کندھا ہلایا، نور نے ایک دم چونک کر اوپر نگاہ کی۔

نیلی دروازے پر کھڑی اسے اداس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اندر آؤ نیلی!" اس نے نیلی سے کہا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک اداسی کی تحریر تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی چپ کی ایک مہر تھی۔ مگر اس کے چہرے پر سکون تھا۔ آسودگی کا احساس تھا۔ جس سے اس کا پورا وجود منور تھا۔ وہ اس کی طرح بھٹکی ہوئی روح نہیں معلوم ہو رہی تھی۔

پتا نہیں کیوں، مگر نور کو لگا کہ نیلی اس کے لیے اداس تھی۔

نور کو پتا تھا۔ نیلی اس سے کتنا پیار کرتی ہے، ناراض ہو جاتی تھی تو اس کی جان نکل جاتی تھی۔

نور نے اس کے ساتھ کتنی غمخواری کی تھی۔ اس کو دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی تھی۔ اس کو سمجھایا تھا کہ خود کو سنبھال کر لیے دیے رکھے۔

جب وہ ناراض ہوتی تو فوراً ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ "قسم سے نور جی! وہ سارے انداز جو آپ سکھانا چاہتی ہیں۔ وہ سارے انداز، وہ سارے رنگ تو آپ کے لیے بنے ہیں، ہر چیز ہر ایک کے لیے نہیں ہوتی، مجھے مغرور لوگ اتنے برے لگتے ہیں کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔ مگر آپ کی کیا بات ہے" آپ پر تو غرور بھی اتنا جچتا ہے۔"

"اچھا بس چپ کر جاؤ۔" نور اسے ڈانٹ کر چپ کروا دیتی تھی۔ مگر چپ رہ کر بھی اس کی چھوٹی موٹی شرارتیں جاری رہتی تھیں۔

اور اب نور نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ آج یہ چپ اور اس کا چہرہ دونوں کوئی الگ چیز لگ رہے ہیں۔

اس نے قریب آ کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ جیسے تحلیل ہو گئی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا، نور نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"نیلی!" اس نے سرگوشی کی۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اس شخص سے شادی نہیں کرو جو لوگ اچھے بن کر ملیں، وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، مگر تم نے میری بات نہیں مانی اور آج تم اداس ہو، سوگوار ہو۔"

پھر ایک خیال، ایک سوچ نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"پھر اس نے وہ بات نہیں مانی تھی نور! تو تم نے کون سا کسی کی بات مان لی تھی۔ نیلی نے بھی ہاتھ جوڑ کر کہا تھا کہ شہباز سے شادی نہیں کرو، اور غضنفر اس نے کتنی دفعہ تمہاری راہ روکی تھی، کچھ سمجھانا چاہا تھا، کچھ بتانا چاہا تھا۔ تم نے بھی تو ہر چیز ٹھوکروں پر رکھ دی تھی۔"

اس کا نام سوچ میں آتے ہی جیسے کسی درد نے دل کو چھوا تھا۔ نور خوف زدہ ہو گئی۔ درد کیوں؟ وہ تو اس سے نفرت کرتی تھی۔

اس نے اپنے اندر جھانکا، وہاں کہیں نفرت نہیں تھی۔ صرف ایک خلا تھا، یہاں سے وہاں تک صرف ایک تشنگی تھی۔

"یہ کیا ہوا؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" جس نفرت کی بساط پر اس نے اس کانٹوں بھرے راستے پر قدم رکھا تو وہ نفرت نہیں رہی تو اتنی لمبی مسافت کس طرح طے ہو گی؟

"نور!" عائلہ نے اندر جھانکا لیکن اس کا حلیہ دیکھ کر ڈر گئی۔ بال بکھرے ہوئے۔ سرخ آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ آنکھیں بالکل سرد تھیں۔ ان میں زندگی کی کوئی چمک نہیں تھی۔

"کیا یہاں نیلی آئی تھی؟" اس نے سر گھمائے بغیر سوال کیا۔

"نیلی نہیں تو۔" عائلہ گھبرا گئی "بھلا وہ کیسے آ سکتی ہے۔"

"کیوں نہیں آ سکتی؟" نور نے غائب دماغی سے کہا۔ "تم نہیں جانتیں عائلہ! اسے مجھ سے کتنا پیار تھا، میں جان بھی مانگ لوں تو وہ کبھی انکار نہیں کرے۔"

"مجھے پتا ہے۔" عائلہ نے مختصراً کہا، وہ نور سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی، پچھلی دفعہ کے کہے اس کے ایک جملے نے ایسی آگ لگائی تھی کہ وہ اب تک سنبھل نہیں پائی تھی۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی بینڈیج لپٹا ہوا تھا اور نور نے تو پوچھا بھی نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔ شاید نور پوچھتی تو وہ بتا بھی دیتی۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ صرف اس لیے کہ جب کسی اور کو تکلیف پہنچتی ہے تو بوجھ اتار کرتے ہیں۔ عائلہ اب تھک گئی تھی۔ اس بوجھ کو سنبھالتے سنبھالتے جو اس سے کسی آسیب کی طرح چمٹ گیا تھا۔

نہ جانے قبولیت کی کون سی گھڑی تھی، جب نور کی نظر اس کے ہاتھوں پہ چلی گئی۔

"کیا ہو گیا ہے؟"

اور عائلہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"کچھ، کچھ نہیں۔" اس نے ہاتھ پیچھے کی طرف کیا۔

"اچھا!" نور نے بھی اصرار نہیں کیا۔ شہباز نے اس سے یہی کہا تھا کہ "اپنے کام سے کام رکھا کرو، میرے اور گھر کے معاملات میں گھسنے کی کوشش نہیں کیا کرو۔" اور ہر بات کی طرح اس نے شہباز کی یہ بات بھی مان لی تھی، وہ گھنٹوں چپ رہتی اور تائی جی کے علاوہ کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا اور لاتعلقی زندگی میں ہویدا

رشتوں میں دونوں ہی جگہ زہر قاتل ہے اور یہ زہر آہستہ آہستہ ہی پھیلتا ہے۔

ابھی بھی عائلہ نے نہیں بتانا چاہا۔ تو اس نے دوبارہ پوچھا بھی نہیں، چینل سرچنگ کرنے لگی، وہ کسی بھی چیز کو ایک منٹ سے زیادہ نہیں دیکھ رہی تھی۔

اضطراب کی کیفیت تھی، کوئی بے چینی، جس نے اس کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔

"کون سی چیز ہے، جو سب کی زندگی میں اندھیرا لے آئی تھی، سچ کو چھپانا، گواہی کو چھپانا، کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے۔"

عائلہ نے افسردگی سے سوچا "اتنا بڑا گناہ کہ سزا دنیا میں ہی مل جائے۔"

اسی وقت اس کی نظر ٹی وی پر چلی گئی، وہاں پر سانپوں کی کوئی فلم چل رہی تھی۔ ہر قسم کے چمک دار خوب صورت زہریلے سانپ۔ اسے یوں لگا وہ سارے ٹی وی پر نہیں، تڑپ رہے ہیں، اس کے ہاتھ پر لپٹے ہوئے ہیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا، کیا ہوا؟" نور خوف زدہ ہو گئی۔ "عائلہ تم کو کیوں کیا ہوا ہے؟"

"سانپ میرے ہاتھ پر ہیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تم ڈر گئی ہو، میں ٹی وی بند کر دیتی ہوں۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"نور! خوف تو اندر ہوتا ہے اور اس کا علاج نہ کرو تو وہ زندہ نہیں رہنے دیتا۔"

"کیا بات ہے عائلہ!" نور نے غور سے اس کی شکل دیکھی، عائلہ فیشن، گانے، ہلا گلا، ان سب کی شوقین تھی۔ اس کی زندگی میں اتنی مشکل باتوں اور سوچوں کا کوئی گزر نہیں تھا۔

اسے خوب صورتی اور خوب صورت لوگ بہت اچھے لگتے تھے۔ جب وہ ان کے گھر میں آئی تھی تو ایک دم سے غضنفر سے متاثر ہو گئی تھی۔

"اور غضنفر کو بھی تو لڑکیاں بہت پسند تھیں، ایک منٹ میں ان سے دوستی ہو جاتی تھی۔"

نور نے تلخی سے سوچتے ہوئے عائلہ کو دیکھا۔ جس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور وہ آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے۔

"نور! اس رات نیلی کے کمرے میں خضر نہیں تھا' حشمت انکل تھے خضر تو میرے ساتھ تھا اس وقت۔" اتنی رات گئے میں خضر کے پاس یہ پوچھنے گئی تھی کہ کیا وہ مجھے پسند کرتا ہے' مجھ سے شادی کر سکتا ہے۔ اسی وقت نیلی کے کمرے سے چیخوں کی آواز آنے لگی۔"

عائلہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی تھی' اب کمرے میں گہری خاموشی تھی۔

☆ ☆ ☆

ممی کا فون آیا تھا' وہ ہم دونوں کو باہر بلوا رہی تھیں' مگر میں نے ابھی تک اس موضوع پر نیلی سے بات نہیں کی تھی۔

وہ ان دنوں بہت چپ چپ تھی اور چڑچڑی بھی ہو رہی تھی' اس نے تو آج تک خود کو میری بیوی کے روپ میں ہی قبول نہیں کیا تھا۔ تو یہ تو بالکل ہی ایک دوسرا روپ تھا۔

میں نے اس کی ڈاکٹر سے پوچھا تھا تو وہ ہنس پڑی تھیں۔

"بہت ساری لڑکیاں' بہت سارے طریقوں سے ری ایکٹ کرتی ہیں' ہو جاتا ہے اس طرح سے' آپ پریشان نہ ہوں۔"

اور میں اتنی جلدی پریشان ہونے والا آدمی بھی نہیں تھا۔ لیکن نیلی بہت کمزور ہو رہی تھی' نہ وہ وقت پر کھانا کھاتی تھی' نہ دوائیں باقاعدگی سے استعمال کر رہی تھی' اور جب میں اسے یاد دلاتا تو وہ فوراً اپنی غلطی مان لیتی۔ "میں بھول گئی تھی خضر!"

اور اس معاملے کا سب سے برا پہلو یہ تھا کہ وہ سچ کہتی تھی' یہ میں جانتا تھا' ایک دن میرے ڈانٹنے پر اس نے صبح' دوپہر دونوں کی میڈیسن ساتھ ہی نکال لیں۔

"صبح کی بھول گئی تھی۔ ابھی ہی کھا لیتی ہوں۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے' کیسی بے وقوف لڑکی ہو' اس قسم کے کام کرتے ہیں۔" میں نے اس کے ہاتھ سے دوائیں لے کر پھینکیں۔

"تو پھینک کیوں دیں' اتنی مہنگی دوائیں ہوتی ہیں' میں واپس اس کو ریپر میں رکھ دیتی۔"

"اس طرح نہیں ہوتا ہے نیلی!" میں نے تحمل سے کہا۔

"کس طرح نہیں ہوتا ہے؟" اس نے ضدی لہجہ میں کہا۔ "تمہارا مطلب ہے خضر کبھی بھی ایک دفعہ۔"

"میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روکا۔ "تم ہر بات کو گھسیٹ کر کہاں لے جاتی ہو۔"

"ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا خضر! میں نے زندگی میں بہت تکلیف اٹھائی ہے' بہت سارے غم' پھر وہ جو آخری دھچکا تھا' اس کے بعد میں زندہ رہی تو صرف اس وجہ سے کہ زندگی ابھی باقی تھی' ورنہ اندر کچھ باقی نہیں بچا تھا' پھر تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا' وہ بہت زیادہ تھا' اس معاشرے میں جہاں ایسی لڑکیوں سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہو' جن کے دامن پر ہلکا سا بھی داغ آ جائے' ان کو اتنی خوشیاں دیں' عزت' وقار' ہر وہ چیز جس کی ایک لڑکی کو ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کوئی کیسے کفر ہو سکتا ہے' مجھے خوشیاں چاہئیں' اپنے لیے نہیں اور جو تمہاری خوشی ہے' وہ کوئی چھپی بات نہیں ہے۔"

"مجھے تمہاری طرح اتنی باتیں کرنی نہیں آتیں' لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ تم بے وقوف ہو۔"

"میں کوئی بے وقوف نہیں ہوں۔" اس کی آنکھوں میں خفگی تھی۔ "مگر میں نے تم سے کہا تھا خضر کہ..." وہ خاموش ہو گئی۔

"میں تھک گئی ہوں' تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔"

اس نے کروٹ لے لی' میں کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا' پھر باہر نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

نور نے کتنی دیر اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے' وہ بھی نہیں جانتی تھی۔ بس گرتے رہنے کا ایک عمل تھا۔ جس سے وہ مسلسل گزر رہی تھی۔ عائلہ اندر جا چکی تھی۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا' وہ اس سے نظریں ملائے بغیر کہا تھا۔ اچھا ہی ہوا' خود وہ بھی کب اپنے آپ سے نظریں ملانے کے قابل رہ گئی تھی۔ بس ایک لمحہ لگا تھا یا شاید اس سے بھی کم اور سب کچھ ختم ہو گیا' اب دامن بھی خالی تھا اور دل بھی۔

وہ چیخ چیخ کر رونا چاہ رہی تھی۔ مگر آج اس آخری تنکے نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

آنکھیں بالکل خشک اور ویران تھیں۔ "قسمت کو سارے کھیل میرے ساتھ ہی کھیلنے تھے۔" اس نے تلخی سے سوچا۔

"نہیں غلط ہے یہ بات' قسمت کو کوئی شوق نہیں ہوتا ہے ہمارے ساتھ کھیل کھیلنے کا' یہ کام تو ہم خود بہت اچھا کر لیتے ہیں۔" فضا میں جیسے کسی نے سرگوشی کی' بہت کچھ یاد آ رہا تھا' بہت کچھ یاد آنے کو تھا۔

نور کو لگا جیسے دل اندر سے خالی ہو گیا ہو' زندگی کے سارے راستوں میں اندھیرے تھے۔ اور تجربے اب مکمل ہوتے ہیں۔ اب صرف بیٹھ کر انتظار کرنا تھا کہ وہ آگ جو اندر تک اسے راکھ کر چکی ہے' وہ باہر کب آتی ہے۔

وقت کو اس انداز میں بھی سامنے نہیں آنا چاہیے کہ سوچنا پڑے کہ زندہ کس لیے ہیں' اور زندگی کس کے لیے بسر کرنی ہے؟

جس غم سے ساری رونق تھی' جس نفرت کو روزانہ کا خون دے کر روشن رکھنا پڑتا تھا' وہ غم ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔ آج نور کو احساس ہو رہا تھا۔ کہ وہ غم بھی اسے کتنا عزیز تھا اور وہ درد بھی جو اس سے منسلک تھا۔ اس نفرت کے رشتے سے' اس تعلق سے وہ اسے سوچتی تو تھی' آج کے بعد سے وہ کس کو اسے سوچ پائے گی' جانے کتنا وقت گزرا' کتنی صدیاں۔

پھر اسی وحشت نے سر اٹھایا تھا۔ جس وحشت کو اس نے بڑی مشکل سے سلایا تھا۔

نور نے تلخی سے سوچتے ہوئے عائلہ کو دیکھا۔ جس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور وہ آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے۔

"نور! اس رات نیلی کے کمرے میں خضر نہیں تھا' حشمت انکل تھے خضر تو میرے ساتھ تھا اس وقت۔" اتنی رات گئے میں خضر کے پاس یہ پوچھنے گئی تھی کہ کیا وہ مجھے پسند کرتا ہے' مجھ سے شادی کر سکتا ہے۔ اسی وقت نیلی کے کمرے سے چیخوں کی آواز آنے لگی۔"

عائلہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی تھی' اب کمرے میں گہری خاموشی تھی۔

☆ ☆ ☆

ممی کا فون آیا تھا' وہ ہم دونوں کو باہر بلوا رہی تھیں' مگر میں نے ابھی تک اس موضوع پر نیلی سے بات نہیں کی تھی۔

وہ ان دنوں بہت چپ چپ تھی اور چڑچڑی بھی ہو رہی تھی' اس نے تو آج تک خود کو میری بیوی کے روپ میں ہی قبول نہیں کیا تھا۔ تو یہ تو بالکل ہی ایک دوسرا روپ تھا۔

میں نے اس کی ڈاکٹر سے پوچھا تھا تو وہ ہنس پڑی تھیں۔

بہت ساری لڑکیاں' بہت سارے طریقوں سے ری ایکٹ کرتی ہیں' ہو جاتا ہے اس طرح سے' آپ پریشان نہ ہوں۔"

اور میں اتنی جلدی پریشان ہونے والا آدمی بھی نہیں تھا۔ لیکن نیلی بہت کمزور ہو رہی تھی' نہ وہ وقت پر کھانا کھاتی تھی' نہ دوائیں باقاعدگی سے استعمال کر رہی تھی' اور جب میں اسے یاد دلاتا تو وہ فوراً" اپنی غلطی مان لیتی "میں بھول گئی تھی خضر!"

اور اس معاملے کا سب سے برا پہلو یہ تھا کہ وہ سچ کہتی تھی' یہ میں جانتا تھا' ایک دن میرے ڈانٹنے پر اس نے صبح' دوپہر دونوں کی میڈیسن ساتھ ہی نکال لیں۔

"صبح کی بھول گئی تھی۔ ابھی ہی کھا لیتی ہوں۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے' کیسی بے وقوف لڑکی ہو' اس قسم کے کام کرتے ہیں۔" میں نے اس کے ہاتھ سے دوائیں لے کر پھینکیں۔

"تو پھینک کیوں دیں' اتنی مہنگی دوائیں ہوتی ہیں' میں واپس اس کور میں رکھ دیتی۔"

"اس طرح نہیں ہوتا ہے نیلی!" میں نے تحمل سے کہا۔

"کس طرح نہیں ہوتا ہے؟" اس نے ضدی لہجہ میں کہا۔ "تمہارا مطلب ہے خضر کہ جیسے ایک دفعہ"

"میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روکا۔ "تم ہر بات کو گھسیٹ کر کہاں لے جاتی ہو۔"

"ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا خضر! میں نے زندگی میں بہت تکلیف اٹھائی ہے' بہت سارے غم' پھر وہ جو آخری دھچکا تھا' اس کے بعد میں زندہ رہی تو صرف اس وجہ سے کہ زندگی ابھی باقی تھی' ورنہ اندر کچھ باقی نہیں بچا تھا' پھر تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا۔ وہ بہت زیادہ تھا' اس معاشرے میں جہاں ایسی لڑکیوں سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہو' جن کے دامن پر ہلکا سا بھی داغ آجائے' تم نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ عزت' وقار' ہر وہ چیز جس کی ایک لڑکی کو ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کوئی کیسے کفر اہو سکتا ہے' مجھے خوشیاں چاہئیں' مگر اپنے لیے نہیں اور جو تمہاری خوشی ہے' وہ کوئی چھپی بات نہیں ہے۔"

"مجھے تمہاری طرح اتنی باتیں کرنی نہیں آتیں' لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ تم بے وقوف ہو۔"

"میں کوئی بے وقوف نہیں ہوں۔" اس کی آنکھوں میں خفگی تھی۔ "مگر میں نے تم سے کہا تھا خضر کہ۔" وہ خاموش ہو گئی۔

"میں تھک گئی ہوں' تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔" اس نے کروٹ لے لی' میں کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا' پھر باہر نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

نور نے کتنی دیر اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے' وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ بس گرتے رہنے کا ایک طویل عمل تھا' جس سے وہ مسلسل گزر رہی تھی۔ عائلہ اٹھ کر جا چکی تھی۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا' وہ اس سے نظریں ملائے بغیر کہا تھا۔ اچھا ہی ہوا' خود وہ بھی کب اپنے آپ سے نظریں ملانے کے قابل رہ گئی تھی۔ بس ایک لمحہ لگا تھا یا شاید اس سے بھی کم اور سب کچھ ختم ہو گیا' اب دامن بھی خالی تھا اور دل بھی۔ وہ چیخ چیخ کر رونا چاہ رہی تھی۔ مگر آج اس آخری چیز نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

آنکھیں بالکل خشک اور ویران تھیں۔ "قسمت کو ہمارے کھیل میرے ساتھ ہی کھیلنے تھے۔" اس نے تلخی سے سوچا۔

"نہیں غلط ہے یہ بات' قسمت کو کوئی شوق نہیں ہوتا ہے ہمارے ساتھ کھیل کھیلنے کا۔ یہ کام تو ہم خود بہت اچھا کر لیتے ہیں۔" فضا میں جیسے کسی نے سرگوشی کی' بہت کچھ یاد آرہا تھا' بہت کچھ یاد آنے کو تھا۔

نور کو لگا جیسے دل اندر سے خالی ہو گیا ہو' زندگی کے سارے راستوں میں اندھیرے تھے۔ اور معجزے اب کہاں ہوتے ہیں۔ اب صرف بیٹھ کر انتظار کرنا تھا کہ وہ آگ' جو اندر تک اسے راکھ کر چکی ہے' وہ باہر کب آتی ہے۔

وقت کو اس انداز میں' کبھی سامنے نہیں آنا چاہیے کہ سوچنا پڑے کہ زندہ کس لیے ہیں' اور زندگی کس کے لیے بسر کرنی ہے؟

جس غم سے ساری رونق تھی' جس نفرت کو روزانہ اپنا خون دے کر روشن رکھنا پڑتا تھا' وہ غم ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔ آج نور کو احساس ہو رہا تھا۔

کہ وہ غم بھی اسے کتنا عزیز تھا اور وہ درد بھی جو اس سے منسلک تھا۔ اس نفرت کے رشتے سے' اس تعلق سے' وہ اسے سوچتی تو تھی' آج کے بعد سے وہ کس طرح اسے سوچ پائے گی؟ جانے کتنا وقت گزرا' کتنی صدیاں۔

آج پھر اسی وحشت نے سر اٹھایا تھا۔ جس وحشت کو اس نے بڑی مشکل سے سلایا تھا۔

اسے یوں لگا جیسے کوئی زہر آہستہ آہستہ اس کے وجود میں پھیل رہا ہو۔ بچپن سے ابھی تو زہری جیسا اثر دکھاتا ہے۔

اس نے گہری سانس لینا چاہی۔ لیکن وہ سانس اندر ہی اندر ٹوٹ گئی۔ پھر اندھیرا بڑھنے لگا اندھیرا اور تاریکی اب روشنی نہیں تھی' لیکن تھوڑی دیر بعد روشنی اسے واپس مل گئی۔

اور اس روشنی میں زندگی کے بہت سارے بھاگتے دوڑتے دنوں میں۔ بھی یاد نہیں رہا کہ کہیں یہ ایک لمحہ بھی مقدر میں رقم ہو گا جس سے فرار ممکن نہیں۔

پھر وہ روشنی معدوم ہونے لگی' اندھیرا بڑھنے لگا تھا' نور نے سر جھٹکنے کی کوشش کی' پھر درد کی تیز لہر اٹھی۔ وہ اذیت سے دہری ہو گئی۔ لیکن وہ درد نہیں تھم رہا تھا' گھٹن پھر بڑھ رہی تھی' یوں لگ رہا تھا جیسے سارے منظر تاریک ہوں' کہیں کوئی آواز نہیں تھی' کوئی سایہ نہیں تھا' کوئی روشنی نہیں تھی۔

چاروں طرف سناٹا تھا۔ سکوت اور خاموشی۔

گہری سانس لیتے ہوئے اس نے کلمہ پڑھا۔ جانے کیوں اسے لگا جیسے صرف یہ ہی چیز اسے اذیت سے نجات دے سکتی ہے' درد اب ختم ہو رہا تھا آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں نے مسکراہٹ کو چھوا' ہر درد ختم ہو جاتا ہے' پھر چل اے نفس امارہ جہاں ہر ذی نفس کو پلٹ جانا ہے۔

جس وقت سے ہمیشہ شکایت رہی تھی' آج وہ وقت ہی ختم ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
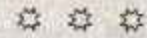
میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ شام اتر آئی تھی' شام کا وقت گزرنا اور گزارنا دونوں میرے لیے بڑا مشکل ہو جاتا تھا۔

نور کی خبر میں نے شام کے وقت سنی تھی اور وہ شام میرے اندر ہی ٹھہر گئی تھی۔ اور وہ دکھ بھی' پھر دکھ تعلق کا ایک حصہ بن جاتا ہے' ہم اس کو قبول کر لیتے ہیں' میں نے بھی اس دکھ کو اس تعلق کو بالکل اسی طرح قبول کر لیا تھا۔ جیسے میں نے اس کی محبت کو کیا تھا۔

نور کو برین ہیمبرج ہوا تھا۔ وہ اس طرح گئی کہ دنیا اس کے دو ماہ بعد بھی یقین نہیں آتا تھا کہ جانے والے اس طرح کیسے چلے جاتے ہیں' محبت اور وہ بھی بڑی عجیب محبت جو کہیں بہت اندر رہ جاتی ہے' یاد بن کر روشنی بن کر' اور اس محبت کو مجھے اپنے اندر ہی رکھنا تھا' ورنہ میری زندگی کے آنے والے کل مجھے معاف نہیں کرتے۔

مجھے اور نیلی کو آگے بڑھنا تھا' زندگی کو آگے بڑھنا تھا' زندگی جو کسی کے جانے سے رکتی نہیں ہے' میں نے کہا تھا نا کہ آدمی کے ساتھ بہت کچھ ایسا ہو جاتا ہے جب اسے وقت سے آگے جا کر فیصلے کرنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر زندگی اتنی مہلت دیتی ہے کہ آپ اپنے فیصلے کو صحیح ہوتا دیکھیں۔

میرے پاس اپنی اور نیلی کی محبت کی بھی کوئی وضاحت نہیں' نیلی نے بہت خوب ایک بات کہی تھی۔

"دیکھیں مجھے لگتا ہے خضر کہ ہم لوگ زندگی میں کبھی ایک سطح پر آ کر بات نہیں کر سکیں گے' مجھے ہمیشہ بہت اوپر سر اٹھا کر تمہیں دیکھنا پڑے گا' میں بیٹھے کھڑے کھڑے تھک جاؤں گی۔" پھر جب وقت کی گھڑی ہمارے درمیان لگی اس وقت تک نیلی کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی وہ دوبارہ موت کی سرحدوں سے واپس پلٹی۔ وہ تکلیف جو اس نے اٹھائی ہی انتہائی اس نے میرے دل کو چھو لیا تھا۔

میں نے نیلی کا سرد ہاتھ تھاما تھا اور محبت سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل پیلا ہو رہا تھا' جیسے اس میں خون کی ایک بوند بھی نہ ہو' اس کے بیمار سی اس کی نرم آنکھوں میں ایک گہری مسکراہٹ تھی۔

"نیلی! اب شاید تمہیں کبھی یہ احساس نہ ہو کہ ہم لوگ زندگی میں کبھی ایک سطح پر آ کر بات نہیں کر سکتے۔" میں نے گہری سانس لی۔

"جو تخلیق کرتا ہے' وہ بلند ہوتا ہے۔"

☼

چھولیا ایسے

ام ثمامہ

ٹرن ٹرن ٹرن۔ فون کی گھنٹی کب سے بج رہی تھی مگر میں اپنی عادت سے مجبور آخری فائل پر آخری لفظ لکھنے کے بعد ہی فون کی طرف متوجہ ہوا تھا مگر وہ اب بج بج کر کسی روٹھی ہوئی حسینہ کی طرح منہ پھلائے مجھے گھور رہا تھا۔ سرکاری دفتر کا سرکاری فون بھی پتہ چلانے سے قاصر تھا۔ کون ہو گا یہ سوچتے سوچتے میں دوبارہ فائلوں کی طرف مڑا کہ فون نے پھر سے ٹرن ٹرن کرنی شروع کر دی۔ اب کے بار میں نے پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ میں غصے سے بھرا "ہیلو" کا پتھر کسی کے سر پہ مارتا ریسیور سے بیگم صاحبہ کی مترنم آواز سنائی دی۔

"سنیے آتے ہوئے ہوٹل سے کھانا لے آیئے گا۔"

اور پھر فون میں سے ابھرنے والی ٹوں ٹوں نے احساس دلایا کہ مطالبہ بیان کرنے کے بعد کھٹ سے فون رکھ دیا گیا ہے۔ آج تو پہلا دن تھا اور اب یہ دیکھنا تھا کہ آگے آگے کیا ہوتا ہے۔

ڈیڑھ سال پہلے رشتے کروانے والی بوا کو پیسے دیے تھے کہ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر میرے ہاتھ پیلے اور منہ لال کرنے کا انتظام کریں۔ بوا نے ڈبل رقم لے کر ایک گھرانے سے ملوایا اور جب میں نے ڈبل رقم پر اعتراض کیا تو بوا اٹک کر بولی۔

"ارے چھڑے چھانٹ چھوڑنے کے لیے اپنی ذمہ داری لینی پڑتی ہے۔ کل کلاں کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو لڑکی والے تو میری چوٹی پکڑیں گے ناں اور تمہارے تو نہ آگے کوئی نہ پیچھے کوئی۔ اللہ جانے پیدا ہوئے تھے کہ

اُٹھ آئے تھے۔"

بوا اپنی تھوڑی کی چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئیں۔

بات تو ان کی بھی ٹھیک ہی تھی۔ ابا کا میرے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے سبب۔ اماں نے جوانی میں ہی بیوگی کی چادر اوڑھ لی مگر حوصلہ نہیں ہارا اور پھر تمام عمر اسکول میں ٹیچری کر اور سلائیاں کر کر کے مجھے پالا پوسا اور تعلیم دلوائی۔

میرے بی ایس سی کرنے کے فوراً بعد اماں کی دعاؤں اور ابا کے ایک دوست کے تعاون سے اچھی سرکاری نوکری مل گئی۔ مکان چھوٹا سا تھا مگر پختہ اور اپنا تھا۔ امی اور ابا نے پسند کی شادی کی تھی اس لیے میں نے کبھی کسی رشتے دار کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور پھر جب اماں کے سکھ سے رہنے اور میری خوشیاں دیکھنے کے دن آئے تو وہ ایک دن چپ چاپ مجھے اکیلا چھوڑ کر ابا کے پاس چلی گئیں۔

چھ مہینے بہت تنگی میں گزرے۔ اماں نے مجھے بہت لاڈ میں رکھا تھا۔ کبھی ابال کر پانی بھی نہیں پینے دیا تھا اور پھر جب بازاری کھانے کھا کر جیب اور پیٹ دونوں کمزور ہونے لگے تو ایک دوست کے مشورے سے رشتہ کروانے والی بوا سے رابطہ کیا۔ بوا کی کوششوں اور اماں کے نوٹوں کی طاقت نے کمال دکھلایا اور خدیجہ دلہن بن کر میرے سونے آنگن میں خوشیوں کے ننھے ننھے دیے جلانے چلی آئی۔

خدیجہ کے ابا کی زمینیں تھیں۔ وہ دو ہی بہنیں تھیں۔ بڑی کی دو سال پہلے ماموں کے گھر لاہور میں شادی ہوئی تھی۔ میرے سسرالی اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے مگر میری شرافت، اچھی نوکری اور ساس سسر، نند دیور جیسے بکھیڑے نہ ہونے کی وجہ سے یہ رشتہ انجام ہو گیا تھا۔ سسر صاحب نے کئی بار گھر داماد کے عہدے کے لیے آفر کی مگر میں نے احسن طریقے سے انہیں ٹال دیا کیونکہ میں گھر جوائی بننا کسی طور گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

خدیجہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ سال ایک خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے بیت گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ اور پھر ننھے منے گول مٹول سے عبداللہ نے ہماری خوشیوں کو چار چاند لگا دیے۔ خدیجہ اچھی ماں بھی ثابت ہوئی۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ زندگی کی گاڑی مسرتوں کے سی این جی کے ساتھ سکون کی سڑک پر رواں دواں تھی کہ یکدم اس میں بھونچال آ گیا اور بھونچال بھی ایسا کہ بیوی کا [illegible] کر رہ گیا۔

ماں باپ کو اپنی بیٹیاں بیاہتے وقت ان کے شوق کے بارے میں ہونے والے میاں کو آگاہ کر دینا چاہیے اور شوق بھی ایسے جو جنوں کی راہ پر چل نکلے ہوں ورنہ اس کا جھٹکا اتنی ہی زور سے لگتا ہے جتنا کہ اب مجھے لگ رہا تھا۔

ایک دن دفتر سے جلدی گھر واپس ہوئی تو دیکھا، بیگم صاحبہ "اے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار" گاتے ہوئے ٹی وی کو چمکانے میں دل و جان سے مشغول تھیں اور جس طرح گھر پر خاص مہمانوں کی آمد پر گھر کو سجایا جاتا ہے اسی طرح ٹی وی چمکا رہی تھیں کہ [illegible] اب ڈیڑھ مہینے تک اسے شرف میزبانی ادا کرنا تھا۔

جی جناب! آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔ بیگم صاحبہ کرکٹ کی ڈائی ہارٹ فین تھیں۔ یہ جوہر ہم پر اس لیے نہیں کھل سکا کہ جب ڈیڑھ سال کے درمیان کوئی بڑا ایونٹ آیا وہ اتفاق سے اپنے میکے ہوتی تھیں اور اب کرکٹ کی آگ تھی اور ہم تھے دوستو۔

ہوٹل سے نان نہاری لے کر گھر پہنچے تو خدیجہ نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور جس رفتار سے آئی تھی اسی رفتار سے اندر کی طرف غائب ہو گئی نا کوئی سلام نہ [illegible] بھری مسکراہٹ جو تھکن اتار سکے۔

خیر تھکے تھکے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ وہ ٹی وی سے چند انچ کے فاصلے پر رکھی کرسی پر آلتی پالتی مارے براجمان تھیں۔ تمام تر توجہ پاکستان اور کینیا کی ٹیموں پر

مرکوز تھی جن میں سے آدھے ان کے بڑے بھائی تھے آدھے چھوٹے بھائی تھے۔ کسی کے دس دس سالے اور ایک ان میں ہمارا انتہائی رقیب روسیاہ بھی تھا مسٹر بوم...

کھانا سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بستر پر ڈھے سا گیا۔ پاس ہی عبداللہ خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ کینیا کی تین چار وکٹیں جلدی جلدی گر گئی تھیں اور بیگم صاحبہ غم و یاس کی تصویر بنی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ پڑھ کر ٹی وی اسکرین پر پھونک رہی تھیں۔ مسٹر بوم بیٹنگ کرنے آئے تھے جیسے ہی مسٹر بوم نے چھکا مارا بیگم ہال سے زیادہ اوپر اچھلیں اور چلائیں "بوم مچا ہے دھوم۔"

"بیگم! ذرا آہستہ۔ عبداللہ اٹھ جائے گا تو میچ دیکھنے نہیں دے گا۔" میں نے چڑ کر تنبیہ کی۔

"آپ اس کی فکر نہ کریں میں نے اسے فنرگن پلا دی ہے۔ اب یہ میچ ختم ہونے کے بعد ہی اٹھے گا۔"

"کیا!" میں شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے چلایا اور اتنے میں مسٹر بوم بنا دھوم مچائے پویلین کی طرف جا رہے تھے۔

"اچھا تو آپ بھی تو ہر بات میں اتنی کیا کیوں اور کیسے کرتے ہیں۔ سو دیکھا گرا دی نا وکٹ۔" بیگم منہ پھلا کر بیٹھ گئیں۔ دھیان اب بھی ٹی وی کی طرف ہی تھا۔

"اچھا ایسا کرو۔ برتن تو لے آؤ۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

مسٹر بوم کی وکٹ گرانے کے جرم میں میں نے شرمندہ شرمندہ لہجے میں کہا۔

"مگر برتن کہاں سے لاؤں۔ صبح تو میں نے دھوئے ہی نہیں۔ میچ کا انتظار کرتے ہوئے کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ آپ کو کیا پتہ کتنی مشکل سے دو بجے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے معصومیت سے خود کو درپیش مشکل بیان کی اور واپس گردن نوے ڈگری کے زاویے پر موڑ لی۔

گھر کا سارا کام محترمہ خود کرتی تھیں۔ میں نے کام والی رکھنے کے لیے کہا بھی مگر ان کا کہنا تھا کہ دو بندوں کا کام ہی کتنا ہے۔ پھر کچن میں جا کر میں نے ایک ڈونگا اور دو پلیٹیں دھوئیں اور کھانا نکال کر خود ہی کھا لیا۔ کیونکہ بیگم صاحبہ نے کرکٹ ورت رکھا تھا جو مسٹر بوم کے ہاتھ میں جیت کا چیک دیکھنے کے بعد ہی ٹوٹنا تھا۔

مجھے خدیجہ سے بہت محبت تھی اور پھر سارا سال وہ میرا اتنا خیال رکھتی تھی تو ایک دن اس کے شوق اور خوشی کی خاطر تھوڑا سا کام کر لیا تو کیا ہوا۔ برتن دھوتے کھانا نکالتے ہر مرد کے اندر چھپے روایتی اور غیرت مند شوہر کی آواز کو ان لفظوں سے تسلی دی اور عبداللہ کے پاس ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ مگر ہائے اب ہمارے نصیب میں نیند کہاں اور چین کہاں.....

☼ ☼ ☼

آج سری لنکا اور پاکستان کا میچ تھا۔ میں نے دفتر سے چھٹی کر لی تھی تاکہ عبداللہ کو فنرگن نہ پینی پڑے۔

"خدیجہ! ابھی تو میچ کے شروع ہونے میں [illegible] تم جا کر چائے بنا لاؤ۔" میں نے بیٹ بال اور عبداللہ کے بیچ چکراتے ہوئے سر کو تھامتے فرمائش کی۔

"آپ بھی نا... اگر میچ کو شروع سے نہ دیکھا تو کیا دیکھا! اور ہاں یہ عبداللہ کو ذرا برآمدے تک لے جائیں۔ آپ دونوں مل کر اتنا شور مچا رہے ہیں کہ کچھ بھی پلے نہیں پڑ رہا۔" بیگم نے فری ہٹ پر پڑنے والے چھکے کی بال کی طرح باپ بیٹا دونوں کو باؤنڈری لائن کی راہ دکھائی۔

چند گھنٹے عبداللہ کو سنبھالنے کے بعد میرا دل چاہا کہ اپنی بیوی سمیت دنیا کی ہر ماں کو سلیوٹ پیش کروں جو دن رات بچوں کو سنبھالتی ہیں۔ نواب صاحب ابھی صرف آٹھ ماہ کے تھے مگر چند گھنٹوں میں ہی مجھے ناکوں چنے چبوا کر دن میں تارے دکھا چکے تھے۔

"خدیجہ! عبداللہ بہت تنگ کر رہا ہے۔ اسے

سمجھاؤ۔ میں جائے خود ہی بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔"
میں نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

اب تو میچ کے اوور چل رہے تھے۔ پاکستان ٹھیک ٹھاک بیٹنگ کر رہا تھا اور مجھے امید تھی کہ اب تو وہ کرسی سے اٹھ ہی جائے گی۔۔۔ مگر جناب کرسی اتنی آسانی سے کون چھوڑتا ہے۔

"آپ بھی بھلا ایک دن صبر نہیں ہو رہا۔ اگر میچ کے بیچ کے اوور نہ دیکھو تو لینڈ کی سمجھ ہی نہیں آتی۔" ناصحانہ انداز میں معلومات فراہم کی گئیں۔ ڈونٹ ڈسٹرب کا بورڈ ابھی بھی چہرے پر آویزاں تھا۔

میں برآمدے میں واپس آ گیا اور پلنگ پر لیٹے عبداللہ کو تھپکنے لگا جو اب سونے کے لیے ریں ریں کر رہا تھا۔ ایک کانٹے دار مقابلے کے بعد گرین شرٹ میچ جیت گئی تھی اور مسلسل دوسری کامیابی کے بعد بیگم صاحبہ کے حوصلے اور شوق میں اضافہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج پاکستان کا مقابلہ کینیڈا جیسی بے بی ٹیم سے تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ آج میں نے بیگم سے اصرار کر کے بریانی پکوائی تھی۔ ہوٹلوں کے کھانے کھا کھا کر طبیعت بے زار ہو گئی تھی۔

وہ بریانی کو دم لگا کر فارغ ہو کر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھی تو تب تک پاکستان کی ایک کے بعد دیگرے چار وکٹیں گر چکی تھیں۔ اس نے مجھے اتنے غصے سے دیکھا کہ جیسے اگر وہ کرسی پر بیٹھی ہوتی تو وکٹیں گرنے سے روک لیتی۔

"ٹیک اٹ ایزی۔ یہ تو بے بی ٹیم ہے۔ فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے بریانی کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے تسلی دی۔

"ارے آپ کو کیا پتہ آج کل کے بچے بھی ایسے ایسے کارنامے انجام دے رہے ہیں کہ بڑوں بڑوں کے منہ کھلے رہ جاتے ہیں۔" اس کا اشارہ انگلینڈ اور آئرلینڈ کے میچ کی طرف تھا۔

دیکھے وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی ابھی پرسوں ہی میں نے آٹھ ماہ کے عبداللہ کو شیلا کی جوانی اور منی بدنامی پر بیٹھے بیٹھے ڈانس کرتے دیکھا تھا۔ تو میری دونوں آنکھیں دونوں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

پاکستان کی ساری ٹیم بہت کم اسکور پر آؤٹ ہو گئی تھی اور آج بھی مسٹر یوم اپنی بیٹنگ کے جوہر نہیں دکھا پائے تھے۔ جس کی بیگم شدت سے منتظر تھیں۔

اور اب آدھے گھنٹے کے وقفے میں وہ پاکستانی قوم کی طرح گیارہ کھلاڑیوں کو نجانے کون کون سے طعنے دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ پیسے لینے کا الزام بھی بے چاروں کے سر دھر رہا تھا۔ جانے ہم اتنے جذباتی کیوں ہوتے ہیں؟ ہر بار جیت ہمارے ہی نصیب میں بھی تو ممکن نہیں۔ ہار ہم سے برداشت ہی نہیں ہوتی اور ایسے موقعوں پر قوم جس طرح ایک ہوتی ہے دعاؤں کے لیے ہاتھ بلند کیے جاتے ہیں۔ یکجہتی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ حب الوطنی کا درد ہر دل میں کروٹیں لیتا ہے وہ عام دنوں میں ناپید نظر آتا ہے۔

یہ نہیں تھا کہ مجھے کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ غلطی سے پہلے تک کرکٹ دیکھی بھی اور کبھی محلے کے لیول تک کھیلی بھی تھی مگر اب خدیجہ کی کرکٹ سے اس قدر محبت بلکہ جنون دیکھ کر مجھے کرکٹ اور بلے سے وحشت ہونے لگی تھی۔ راتوں کو خوابوں میں اسٹیڈیم امپائر اور پلیئر نظر آتے تھے۔
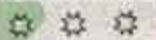
☼ ☼ ☼

"ارے مُنے! ایسے تو کیا اسٹائل ہے۔ کیا ایلیٹ ہے۔ بیٹنگ میں کامیابی نہیں ہوئی تو کیا ہوا باؤلنگ میں تو مسٹر یوم اپنا جادو دکھا رہا ہے۔" میں فائل پر جھکا ایک اور ایک دو کر رہا تھا کہ جب بیگم نے مجھے شرٹ سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ بچوں نے واقعی کمال کر دیا تھا۔ مسٹر یوم کے دھڑا دھڑ وکٹیں گرانے سے قبل بیگم صاحبہ بھی ایک ایک اوور کے بعد لے رہی تھی۔ میچ بڑے سنسنی خیز موڑ پر پہنچ چکا تھا اور ساری باتوں

ذرا ہوش کر کے میں بھی چند لمحوں کے لیے کرکٹ کے جادو میں کھو سا گیا۔ اتنے میں عبداللہ نے مچل مچل کر رونا شروع کر دیا۔

خدیجہ کرسی سے اٹھی عبداللہ کے پاس گئی اور واپس آ کر پھر اس کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اپنے عبداللہ نے پیمپر گیلا کر لیا ہے۔ آپ اسے چینج کروا دیں۔"

بیگم کا جملہ فل شوٹنگ یارکر کی طرح میرے کانوں سے ٹکرایا اور دماغ کی وکٹ اڑا گیا۔

اچھے پڑھے لکھے مددگار اور شریف شوہر کی طرح چار و ناچار یہ کام بھی کرنا پڑا جس کے بارے میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

اس سے پہلے کہ میری زندگی مڈ آن اور مڈ آف کی پوزیشن پر کچن اور واش روم میں فیلڈنگ کرتے بیت جاتی۔ میں نے انصاف کے لیے تھرڈ امپائر سے رابطے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان یہ میچ بھی جیت گیا تھا۔ ساری بے زاری پلس خواری کے باوجود بھی اندر ہی اندر دل نے مسلسل تیسری کامیابی پر بھنگڑے ڈالے تھے اور خدیجہ کی خوشی تو دیدنی تھی اور اب وہ دروازے پر کھڑی بچوں میں جلیبیاں بانٹ رہی تھی۔ گول گول رس دار جلیبیاں بھی آج جیت کی خوشی میں پھولی پھولی لگ رہی تھیں۔ صحت مند سی ایک جلیبی منہ میں رکھتے ہوئے اب میں کچھ مطمئن تھا۔

☼ ☼ ☼

دروازے کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں دروازہ کھولنے صحن کی طرف گیا۔

"ارے امی! آپ؟" دروازے پر بیگم کی امی یعنی میری ساس صاحبہ کھڑی تھیں۔ میں نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے ان کو راستہ دیا۔

ارے آپ حیران مت ہوں مجھے پتہ ہے داماد ساسوں کے آنے پر خوش نہیں ہوتے مگر میری خوشی اور ان کو بلانے کے پیچھے اک وجہ پوشیدہ تھی۔

پاکستان اور نیوزی لینڈ کے میچ کو شروع ہونے میں تھوڑا وقت تھا اور خدیجہ جلدی جلدی ٹی وی کے پاس رکھی کرسی کے گرد اپنی اور عبداللہ کی ضرورت کی چیزیں جمع کر رہی تھی۔

"امی! آپ اپنی بیٹی کو سمجھائیں سارا گھر تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ میں اور عبداللہ بارہویں کھلاڑی کی طرح سارا دن اس کا انتظار کرتے ہیں۔ میری تو خیر ہے مگر عبداللہ ابھی بچہ ہے اس کے شوق کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ چڑچڑا ہو گیا ہے اور آئے دن آفس سے چھٹیوں کی وجہ سے بھی مسئلہ ہو رہا ہے اور پھر ہر چیز میانہ روی کے دائرے میں ہی ٹھیک لگتی ہے۔"

میں نے دبی دبی زبان میں بیگم سے نظر بچاتے ہوئے ساس صاحبہ سے اپنا دکھڑا رویا۔

"اے ہائے اک ذرا سا تو شوق ہے بچی کو۔ اور وہ بھی ورلڈ کپ کے میچ ہے تو اتنی مگن ہو گئی ہے اور پھر پورے چار سال بعد آتا ہے ورلڈ کپ۔ پھر عام دنوں میں تمہیں اور عبداللہ کو بھی شکایت کا موقع ملا جو تم یوں شکایتیں لگا رہے ہو۔"

لو جی تھرڈ امپائر نے بھی لال بتی جلا دی تھی۔ الٹا میں ہی مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا۔ خدیجہ نے حیران پریشان نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ سچ کہتے ہیں کہ رشتے بدلتے ہیں تو لہجے بدل جاتے ہیں اور لہجے بدل جائیں تو لفظ خود بہ خود تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہی امی تھیں جو تمام عمر اسے کرکٹ دیکھنے پر اس کے پیچھے پڑی رہتی تھیں کہ کیا کم بخت بائیس کے بائیس چھ چھ فٹ کے مرد ایک بال کے پیچھے باؤلے ہوئے پھر رہے تھے۔

اب ورلڈ کپ پاکستان آئے نہ آئے مجھے امور باورچی خانہ داری اور امور غسل خانہ داری بخوبی آ جائے گی۔ اور پلیز دعا کیجیے گا کہ ورلڈ کپ ہم لے کر آئیں کیونکہ اگر مسٹر یوم خالی ہاتھ واپس آ جاتے ہیں تو بیگم کے بے انتہا غم اور غصے کا سامنا مجھ غریب کو ہی کرنا پڑے گا۔

☼

سدرۃ المنتہیٰ
آ دور تک اک ساتھ چلیں
جب تک یہ کشتی چلتی ہے
جب تک رستے لے جائیں ہمیں
جب تک راہیں ہموار ملیں
ہم دور تک اک ساتھ چلیں
بند مٹھی میں کوئی آس کا جگنو کسی لمحے آ رکا تھا گر
مکمل ناول

اب مٹھی خالی تھی۔ شاید سوتے میں مٹھی سے پھسل گیا مگر اسے تو ہمیشہ نیندوں سے گلے رہے تھے۔

اس نے کھلی کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے رات سے تارا مانگ لیا۔

رات اس کی خواہش پر سر جھٹک کر ہنس دی۔

تارے آسمان پر رینگتے ہوئے جگہیں بدل بدل کر کہیں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ ہاسٹل کے کمرہ نمبر چار کی کھڑکی بھی بند ہو گئی۔

ہنہل نے اپنے بستر کے برابر والے خالی بستر کی طرف دیکھا۔ آج نے زندگی میں پہلی مرتبہ جاتے ہوئے بستر نہیں سمیٹا تھا۔ کمبل بستر پر ایسے پھیلا تھا جیسے کوئی سمٹا سو رہا ہو۔ اسے آج کا میسج یاد آیا جو آج اس نے کیا تھا۔

"جب ملتے رہیں گے تو آخری بار کیوں ملتے؟" وہ دوبارہ میسج دیکھ کر مسکرا دیا۔

جاتے ہوئے وہ اس کے لیے کھانا بھی چھوڑ گیا تھا۔

جاتے ہوئے نہ ملنے کا گلہ جا رہا۔ وہ کسی اور کو سوچتے سوچتے لیٹ گیا۔ ایک خوشی تھی تکیے کے سرہانے رکھ دی۔

"جب ملتے رہیں گے تو آخری بار کیوں ملتے"

تھکن سے بوجھل آنکھیں بند ہونے لگیں۔

نیند میں وقت کہاں دیکھتی ہیں۔

ہاسٹل کے کمرہ نمبر چار میں اندھیرا تھا۔ یہاں کی آخری صبح اسے لوریاں دے کر سلا رہی تھی۔

باہر پو پھٹنے کو تھی اور وہ سو رہا تھا۔ دیا گل ہی تو تھا۔

☼ ☼ ☼
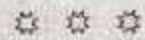
کرم پور میں آج صبح شام کی طرح اتری تھی۔

نجانے کتنی تھکن تھی جو اس کے وجود میں سما گئی تھی۔ اس نے سورج کو کھڑکی کھول کر اندر آنے کی دعوت دی۔ کمرے میں روشنی کی لہریں پھیل گئیں۔ جیسے اچانک ہی زندگی کا کوئی احساس جاگا تھا۔ ورنہ تمام رات اس کمرے میں زندگی بجھی ہوئی تھی۔ زرد بلب کی روشنی بھی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ پلکیں لیے رات بھر اندھیرا کیے وہ منہ لپیٹے پڑی رہتی۔ نیند کے نام پر ایک سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔ وقفے وقفے سے کوئی سوچ سر اٹھاتی۔ پھر وہی خواب تمنا۔ جھٹکا کھا کر پوری آنکھیں کھول دیتی۔

ایک گھڑی کی ٹک ٹک تھی اور ایک دل کی جو اس اندھیرے میں بھی زندگی کا احساس دلاتی تھی۔

اسے لگا تھا کہ جیسے وہ اپنا آپ وہیں چھوڑ آئی ہو اور دل تو وہ پہلے ہی کہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔ ایک روز اس نے کہا تھا۔

"تمہارا دل ڈھونڈ کر لاؤں گا۔" اور وہ ہنس دی تھی۔

دل تو اس نے ان ہی گلیوں میں کہیں چھوڑا تھا جہاں سے وہ روز گزرتا تھا۔

ایک دن ایسے ہی انقلاب کی باتیں کرتے کرتے اس نے پانی میں کنکر اچھال کر بھنور پیدا کیا اور کہا۔

"پرو! تم جب خاموش ہوتی ہو تو جیسے فضا میں ہر چیز تھم سی جاتی ہے۔ تم بولا کرو تاکہ زندگی کا احساس بنا رہے۔"

"تم بھی سنبھا سوان کی کہانی کے ہیرو ہنہل ہو۔ جب سنبھا انقلاب کی بات کرتی ہے تو ہنہل اسے ہتھیلی میں رکھ کر خواب پیش کرتا ہے اور اب تم بھی میری مٹھی میں وہی خواب تھمانا چاہتے ہو۔" اس نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا تھا مگر خاموش رہی تھی۔ کیونکہ ہنہل کے پاس اس کی ہر بات کا جواب ہوا کرتا تھا۔

مگر ابھی یکدم اس کے دل میں خواہش نے سر اٹھایا تھا کہ ایک دفعہ اس سے ملے اس کو بتائے کہ دیکھو تمہاری پرو مر گئی ہے۔ اس کو کچھ محسوس نہیں ہو رہا۔ نہ خوشی اور نہ ہی غم۔ تم خواہشات کی خوشیوں کی بات کرتے ہو محبت کی بات کرتے ہو محبت تو کب کی روٹھی ہوئی سہیلی کی طرح منہ موڑ کر چلی گئی ہے۔ اسے منانا اب آسان تو نہیں نا!

"اور انقلاب کی بات تو جیسے کہانی لگتی ہے۔ سنبھا سوان کی کہانی اور ہنہل کی کہانی۔ مگر میں زیادہ دیر خوابوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہیں ڈھو سکتی۔ میں نے یہ بوجھ اتار پھینکا ہے۔ تم بھی اتار پھینکو۔ کہانیوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ جنگلات کی خاموشی سے نکل کر مشینوں کے شور میں کھو جاؤ۔ پھر سے حالات کی باتیں کرو۔ مہنگائی کا رونا رونے بیٹھ جاؤ' سیاست کی باتیں کرو مگر انقلاب کی امید رہنے دو۔ اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو۔

تو اپنے آپ کو کہیں رکھ کر بھول جاؤ۔ میری طرح' بھول جاؤ کہ کبھی ہنہل اور پرو راستوں میں ٹکرائے تھے۔

محبت کو کسی بھول کے کھاتے میں ڈال کر سو جاؤ تاکہ آرام سے سو سکو۔"

آئینے میں بال سمیٹتے ہوئے اپنے عکس پر اک نگاہ ڈالی تو خود کو لمحے بھر کے لیے پہچان ہی نہ سکی۔ اس نے بالوں کا جوڑا بنایا اور کمرے کی تنہائی سے نکلنے کے لیے باہر جھانکا تو لگا کہ زندگی جاگ رہی ہے۔ ایک وہ تھی کہ ساری رات میں سو سکی اور نہ ہی دن میں جاگنے کا احساس باقی تھا۔ گھر کے افراد اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ ابو اپنی بیوی کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ وہ کپڑے دھو رہی تھی اور وہ کچھ ذکر کر رہا تھا۔ اس نے انسانی جاندار اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دیکھی تو اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ یہی زندگی ہے۔

وہ دوپٹے کا لٹکتا ہوا پلو سمیٹ کر برآمدہ عبور کر کے صحن میں نکل آئی۔ چمکیلا سورج کی روشنی ایک پُرجوش دن کی نشان دہی کر رہی تھی۔ جیسے جیسے روشنی اس کے وجود میں تحلیل ہوتی گئی اس کے اندر جیسے کوئی توانائی بھرتی گئی۔ اس کے اندر اندھیروں سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہو رہا تھا۔ سورج اس کے وجود میں اپنی کرنیں چھوڑ کر شام کو غروب ہونے لگا تھا۔ آج کے لیے اتنی روشنی کافی تھی۔

اسے اگلے دن کا انتظار تھا اور اپنی تقدیر کے فیصلے کا بھی۔

"آخر کیوں کیا آپ نے ایسا؟ کیا کوئی اپنی اولاد کو اس طرح روایتوں کے جہنم میں دھکیل دیتا ہے۔ کیا کوئی اس حد تک بھی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ بتائیے بتائیے نانا؟"

وہ آج سارے سوال لے کر نانا کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

اور وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے بغیر کچھ کہے۔ وہ اس کی سن رہے تھے۔

"ان کی زندگی میں نے دیکھی ہے۔ سسکتی ہوئی۔ کیا آپ نہیں جانتے؟ بے خبر ہیں ان سارے طوفانوں سے جو ان کی زندگی میں آئے اور ان کا سکھ چین اڑا کر لے گئے؟ کیا بے خبر رہے ہیں آپ ان عذابوں سے جو ان پر بیتے اور ان کی زندگی مشکل میں ڈال دی؟ کیا آپ بے خبر تھے ان کے حالات سے؟"

"اس نے ایک دفعہ بھی خود آ کر ہمیں نہیں بتایا۔ ہم لوگوں سے ہی سنتے رہے سب کچھ۔" ان کے بجائے خالہ بول پڑیں جو اتنی دیر سے اس کے سوالوں کے جواب سوچ رہی تھیں۔

"اچھا۔ یعنی کہ لوگوں نے کہا اور آپ سب کچھ سنتے رہے غیروں کی طرح۔ کتنے افسوس کی بات ہے نا۔ پھر آپ میں اور ان لوگوں میں کتنا فرق رہتا ہے۔ جو بابا ان کی راہوں میں پتھر لے کر آ گئے تھے۔ ناانصافیاں ہوتی رہیں اور آپ سب سنتے ہوتے رہیں' واہ کیا بات ہے۔"

"ہاں لوگ باتیں بناتے رہے اور ہم سنتے رہے۔ ہماری عزت کا بھی خیال نہیں کیا اس نے مگر پھر بھی طلاق لے کر آ گئی اسے گھر میں رکھا۔ پناہ دی' جگہ دی۔ کچھ بھی نہ کہا اس کو کہ وہ پیچھے کیا تماشا کر آئی تھی۔"

وہ بات کو اپنے رنگ میں ڈھال کر اپنے تئیں اسے لاجواب کر چکی تھیں۔

"جب وہ طلاق کا طوق گلے میں ڈال کر آئیں تو

آپ کو ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس کے پیچھے کوئی طوفان ہو گا۔"

"ارے اس نے بھی گھر بنانے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ ایک دن بھی وہ اپنے شوہر کو خوش نہ رکھ سکی اور الزام ہمارے سر پر ڈال دیا۔ حد ہے بھئی۔"

"وہ ایک شرابی نشئی اور جواری شوہر کو خوش رکھ بھی کیسے سکتی تھی۔ اور گھر کون سا؟ جہاں وہ ایک ملازمہ سے بھی کم حیثیت میں رہتی تھی۔ رات دن دیور، دیورانیاں ان کے بچے اور مال مویشیوں کی خدمت کرتی۔ میری ماں اس گھر میں جانوروں کی طرح رہی تھی۔ وہ بھینسوں کو چارہ ڈالتی، دودھ دوہتی، گوبر تھاپتی، جانوروں سے لے کر گھر کے تمام افراد کی ذمہ داری ان پر تھی جو انہوں نے نبھائی۔ مگر اس سب کے بدلے کیا ہوا ان کے ساتھ اس گھر میں؟ اور کسی نے ان ظالم لوگوں سے یہ تک نہیں پوچھا کہ جس کو لاڈوں سے بیاہ کر گئے تھے اس کا یہ حال کر دیا۔ ایک بار تو نانا ان سے کہنے گئے۔ وہ نہ نوٹس لیتے مگر انہیں پتا تو چلتا کہ کوئی ہے، جو ان کی خاطر لڑ سکتا ہے، بات کر سکتا ہے۔ یتیم نہیں۔۔۔ مگر آپ نے تو انہیں احساس دلایا کہ آپ ان کے نہیں، روایتوں کے باپ ہیں۔ آپ نے انہیں مرنے کے لیے چھوڑ دیا اور وہ مر گئیں۔ یہ تھا آپ کا انصاف؟" وہ روہانسی ہو گئی۔ آنسوؤں کا گولہ سا گلے میں اٹک گیا تھا۔

"ہر عورت گھر بنانے کے لیے قربانیاں دیتی ہے۔ گاؤں کی ہر عورت گوبر تھاپتی ہے، دودھ دوہتی ہے، چارہ کاٹتی ہے، مویشیوں کی دیکھ بھال بھی کرتی ہے۔ گھر بار بھی دیکھتی ہے۔ یہ تو عورت کا کام ہے۔ کمال نہیں کیا اس نے۔ بیاہ ہوتا ہے تو نبھانا بھی پڑتا ہے۔" اس بار بھی ان کے زہر پڑنے سے پہلے ہی وہ پھر شروع ہو گئیں۔

"نہ چاہتے ہوئے بھی نبھایا ہی تھا۔ مگر صلہ کیا ملا ان کو؟ ان لوگوں نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا اور آپ لوگوں نے بھی مجھے تو لگتا ہے ان کو ہی برا سمجھا۔ قربانی ضائع اور بے کار ہی گیا تھا۔ جس معاشرے میں آپ جیسی بہنیں۔۔۔ محمد صابر جیسے شوہر اور ان جیسے باپ ہوتے ہیں، وہاں کسی قربانی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"ارے اگر اتنی ہی معصوم ہے تمہاری ماں۔ ہم برے ہی بھلے، مگر پھر بیٹھتی نا صبر کر کے وہیں پر۔ کیوں آ گئی طلاق لے کر ہم جیسوں کے پاس؟"

"کاش کہ وہ طلاق لے لیتیں۔۔۔ مگر طلاق انہیں دی گئی وہ بھی ایک گھٹیا سا الزام لگا کر جس کو بتاتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔" اس کے لہجے میں اب صرف افسوس تھا۔

"تو اس کے پچھن پہلے کیا کم تھے، جو کچھ وہ یہاں کر گئی تھی۔ وہ کیا کم تھا وہاں بھی اصلیت دکھا دی۔ اس نے ماں باپ کی عزت کا خیال تک نہیں کیا تھا۔" وہ جیسے پھٹ پڑیں۔

"اوہ۔۔۔ تو آپ بھی شامل تھیں۔ واہ۔۔۔ ذرا تفصیل سے بتایئے۔ وہ یہاں کیا کر گئی تھیں۔ البتہ وہاں ان پر کیا الزام لگا [illegible] جو ان کے بھائیوں کی طرح تھا جو کبھی کبھی ان کی طرف داری کر لیا کرتا۔ اس بات کو پوائنٹ بنا کر انہیں ذلیل کر دیا گیا۔ یہ حالات میرے سامنے تھے۔ ایک گیارہ سال کی بچی میں اتنی سمجھ بوجھ ہوتی ہے کہ وہ سمجھ سکے۔ میری ماں جتنی پاکیزہ تھی۔ شاید ہی اس گوٹھ میں کوئی اور ہو۔"

"انہوں نے یہ الزام لگایا تھا اس پر اور تمہیں پتا تھا صغریٰ! پھر بھی مجھے نہ بتایا تم نے؟ مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ جھگڑا کر کے آئی ہے۔ اس نے خود طلاق لی ہے۔" نانا کو جیسے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔

"میری بچی ایسی نہیں تھی۔" وہ زیر لب بڑبڑائے۔

"بابا! میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک تو آپ پہلے ہی پریشان تھے۔ پھر اگر ایسی بات پتا چلتی تو کتنا دکھ ہوتا آپ کو۔ میں آپ کو یہ زخم دینا نہیں چاہتی تھی۔" صغریٰ کی آواز دھیمی تھی۔

"مگر میری بچی ایسی نہیں تھی۔۔۔ وہ نہیں تھی ایسی، خدا گواہ ہے۔ میری بچی کی فطرت ان چیزوں سے پاک تھی۔ اس کا ایمان مضبوط تھا۔ اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس سے اس کے کردار پر کوئی چھینٹا پڑتا ہو۔۔۔ اس کے ساتھ برا ہوا۔۔۔ غلط ہوا۔ وہ ایسی نہیں تھی۔ کاش تم لوگ مجھے بتاتے۔۔۔ یا وہ مجھ سے بات کرتی۔ مجھے بتاتی۔۔۔ کچھ تو کہتی۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"مگر وہ تو بہت دور ہو گئی تھی مجھ سے۔ بہت شکایتیں تھیں اسے مجھ سے۔ مجھے ہی قصور وار سمجھا اس نے۔" ان کا دل بھر آیا تھا۔ کتنے عرصے بعد پھر کتنے ملال سر اٹھانے لگے تھے۔

"اس سب کے ذمہ دار آپ تھے نانا۔ انہیں روایتوں کی چکی میں پیس دیا آپ نے۔ گاؤں کا ایک اچھا اور شریف لڑکا ان سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر نہیں آپ نے تو روایتوں اور لوگوں کی پروا کی۔ اور پھر بیٹھ کر ان کی زندگی کی تباہی کا تماشا دیکھا۔ اس کے بعد بھی کیا وہ آپ سے شکوہ نہ کرتیں؟ انہیں تو آپ سے نفرت ہونی چاہیے تھی۔"

"بہت گستاخ ہے یہ، بڑی بے ادب۔۔۔ اس سب کے آگے وجہ کیا ہے بابا! یہ دو ٹکے کی لڑکی آپ کو کٹہرے میں کھڑا کر رہی ہے۔ جواب دہی کر رہی ہے آپ سے اور آپ کیسے چپ سن رہے ہیں۔ جیسے سنجھا کو سنتے تھے۔ آپ نے اسے ڈھیل دی اور اس کی زبان بڑھتی گئی اور اب یہ لڑکی اپنی ماں کی طرح آپ سے حساب برابر کرنے لگی ہے۔" صغریٰ نے اسے لتاڑنا چاہا تھا۔

"اسے کہنے دو صغریٰ!" وہ جیسے تھک سے گئے تھے۔

"کیا تھا اگر آپ ان کے سامنے ایک دفعہ مان لیتے کہ آپ نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ ان کو اپنی روایت پر قربان کیا تھا۔ کم از کم انہیں آخری خوشی تو ملتی کہ آپ کو اپنی زیادتی کا احساس ہے۔ وہ کہتی تھیں مجھے اب اس لمحے کا انتظار ہے کہ یہاں کے باسیوں کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو۔۔۔ کیا پتا اس سنجھا کے بعد اب کوئی اور سنجھا روایت کی بھینٹ چڑھنے سے بچ جائے۔ کیا پتا یہ قربانی آخری قربانی ہو۔ چاہے وہ سنجھا آخری نہ تھی قربان ہونے کے لیے مگر ایک جھوٹی تسلی ہی سہی۔۔۔ انہیں کچھ سکون تو مل جاتا۔"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ میرا باپ تمہاری ماں سے معافی مانگتا؟ اپنی بچی سے کوئی باپ معافی مانگتا کیا اچھا لگتا؟" صغریٰ کوئی ایک موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دے رہی تھیں۔

"کاش وہ مجھے کچھ بتاتی۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔" وہ کرسی کی ہتھی کو تھام کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔

"رہنے دو ابھی ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم ہے کہ اپنا بار اٹھا سکیں۔" صغریٰ سہارا دینے کو آگے بڑھیں تو انہوں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا اور گھٹنوں پر زور دیتے بیڈ تک گئے۔

"آپ نے ایسا کیا کر دیا جو معافی مانگتے۔ اس گھر سے ہر بیٹی والدین کی مرضی سے شادی کرتی ہے۔ کوئی انوکھا تو نہیں تھا۔"

"والدین اپنی اولاد کی زندگی کا سودا آنکھیں بند کر کے نہیں کرتے۔ مگر نانا نے اپنی عقلمند، باشعور، خوب صورت اور خوب سیرت بیٹی کے لیے ایک نشئی، شرابی اور آوارہ کا انتخاب کیا۔" وہ ہار نہیں مان سکتی تھی۔

"وہ اس کا بچپن کا منگیتر تھا۔ پہلے ایسا نہیں تھا، وہ بعد میں ایسا ہوا اور پھر یہاں تو سب ہی لوگ ایسے تھے پھر تمہاری ماں کے مزاج پر پورا کون اترتا؟ میری بھی شادی بابا جی کی مرضی سے ہوئی مگر میں نے بھی تو نباہ کیا۔" انہوں نے اب اپنے آپ کو بھی مثال کے طور پر پیش کر دیا تھا۔

"وہ اس سے پھر بھی بہتر ہی تھے۔ کم از کم دو وقت کی روٹی عزت سے تو مہیا کرتے تھے۔ آپ پر اتنا بوجھ نہیں ڈالا گیا اتنی ناانصافیاں نہیں ہوئیں آپ کے ساتھ۔ ان کے گھر پر راج کرتی رہیں آپ۔"

"اب یہ تو ہر ایک کا نصیب ہوتا ہے۔" وہ نصیب پر

ذلیل کروا میں بچا گئیں۔

"سب کچھ ہی نصیب میں لکھا ہوتا ہے وہ بھی جو ہم کسی کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔۔۔۔ اگر انسان کے ہاتھ میں خدا کوئی اختیار نہ دیتا تو انسان کے لیے روز حساب نہ ہوتا۔ مگر رب نے تو اسے آزمانے کے لیے اختیار دیا اور وہ دائرے سے نکل کر دوسروں کا جینا حرام کرنے میں لگ گیا۔"

اسے اندازہ تھا کہ وہ گفتگو کا رخ موڑنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ مگر وہ ان کی ہر بات کا جواب دینا چاہتی تھی۔

"تمہاری زبان سے تو پناہ مانگنی چاہیے ماں سے زیادہ تیز ہو۔"

"بابا! پار میری مرحوم ماں کا نام مت لیں۔ جب تک وہ زندہ تھیں۔ آپ نے ان کا دل دکھانے میں کسر نہ چھوڑی۔ اب تو معاف کر دیں انہیں۔"

"تم سے بھی کون باتوں میں جیتے کتنا بولتی ہو۔" وہ بے زاری سے کہتی باہر نکل گئیں۔

اسے ان سے اسی کی توقع تھی' اس لیے حیرت نہ ہوئی تھی۔

"مرہ! ادھر آؤ۔" وہ پلنگ پر لیٹتے ہوئے اسے بلانے لگے۔

"نانا! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" انزل جو اتنی دیر سے باہر کھڑا ان سب کی گفتگو سن رہا تھا' خاموشی ہونے پر اندر چلا آیا۔

"انزل! پر۔ آج یہاں سوئے گی۔ میرے پاس۔ تو اپنا بستر آج صغریٰ کے کمرے میں لے جا۔" وہ اسے اپنے پاس بلا کر کہنے لگے۔

اس نے پہلے انہیں دوائی کھلائی' پانی پلایا اور پھر انہیں کمبل اڑھا کر سونے کی تلقین کرتے ہوئے اپنا بستر چارپائی سے اٹھا کر باہر لے گیا۔

"سوری نانا! میری باتوں کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی مگر یہ تو حقیقت تھی نا نا!" وہ ان کے پاس آ بیٹھی تھی۔

"تم بالکل اپنی ماں پر گئی ہو۔ پہلے خوب لڑتی ہو پھر معذرت بھی اس انداز سے کرتی ہو جیسے احسان کر رہی ہو۔" وہ ہلکا سا مسکرائے تھے۔

"وہ ہر بات منوا لیتی تھی مجھ سے ضد کر کے۔"

"ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں مان کر بہت بڑی بات منوالی آپ نے ان سے؟"

"ٹھیک کہتی ہو تم۔" وہ پھر سے رنجیدہ ہو گئے۔

"نانا! دودھ لایا ہوں۔ پی لیں۔" انزل دودھ لے کر ان کے پاس آیا۔

"پی لوں گا یار! تم سو جاؤ میرے بچے پھر صبح فصل بھی جانا ہے۔" وہ اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

وہ مسکرا کر دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کمرے سے چلا گیا۔ پر نے اتنی دیر میں ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ نانا کا بہت خیال رکھتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے کتنا مختلف تھا۔ اس نے سوچا۔

"تم صرف بولتی رہو۔ میں سننا چاہتا ہوں۔ تمہارے دل میں اور کیا کیا ہے میرے لیے اپنے نانا کے لیے؟" وہ اسے خاموش دیکھ کر بولے۔

"وہ بھی بہت سارے دن رہوں گی کیا ساری باتیں آج ہی کر لوں؟"

"ہاں یہ بات بھی ہے مگر اس کے بعد ہم اچھی اچھی باتیں کریں گے جیسے شبنا مجھ سے کرتی تھی۔"

انہیں بہت عرصے بعد وہ بہت یاد آ رہی تھی پھر ساری رات وہ دونوں شبنا کی باتیں کرتے رہے تھے۔

یہ اس کی یہاں پہلی رات تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ لڑکی یہاں ہمارا سکون برباد کرنے آئی ہے۔" صغریٰ چارپائی پر پچھلی رضائی میں استر لگاتے ہوئے باآواز بلند کہہ رہی تھیں۔

"ارے بابا جی کی تو عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ حد ہے جوان جہان لڑکی کل کو اس کا باپ آ پہنچا تو کیا جواب دیں گے ہم۔ اتنا تماشا ہو گا گھر میں۔ دو دن ہو چکے ہیں لیکن خبر نہیں لی ہے ان لوگوں نے۔ خدا جانے کیا کہہ آئی ہے کسی کو بتایا بھی یا نہیں کیا گل کھلائے گی یہ لڑکی یہاں رہ کر۔"

"اماں! خدا کے لیے یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ کیوں تپ رہی ہیں فالتو میں۔" وہ جو جھولے میں لیٹا کتاب دیکھ رہا تھا آخر کار جھنجلا کر اٹھ بیٹھا جو پچھلے دو دن سے وہ یہی سب سنتا آیا تھا اور اب تو یہ الفاظ اسے ازبر بھی ہو چکے تھے۔

"ارے تو کیوں اس کی طرف داری کرتا ہے؟ کیا لگتی ہے وہ تیری؟ ہو گا جو تجھ پر جادو ٹونا کر گئی۔ ہے۔ دو دن نہیں ہوئے اسے یہاں آئے۔ ہر کسی پر اس کا بھوت چڑھ گیا ہے۔ حد ہے۔"

"خدا کے لیے اماں! میری جان بخشی کر دیں' جا رہا ہوں اوطاق میں۔ نہیں آؤں گا اب۔ جس وقت بھی گھر آؤ' یہ سب سننے کو ملتا ہے۔" ٹھیک کیا ہوں میں۔ ارے یہ گھر صرف آپ کا نہیں نانا کا ہے اور وہ ان کے گھر آئی ہے۔ آپ اتنی آسانی سے اسے نہیں نکال سکتیں اور ویسے بھی اس نے کون سا نقصان پہنچایا ہے آپ دو دن میں کہ آپ نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔" وہ جھولے سے اٹھ کر کتاب ہاتھ میں لیے جھنجلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"ہائے انزل تو بھی۔۔۔ بھی مت سمجھنا تم لوگ میری بات کو۔ ارے جب وہ کوئی گل کھلائے گی تب سر پکڑ کر بیٹھنا پھر مت کہنا کہ ہمیں تو اندازہ ہی نہیں تھا۔" وہ رضائی پھینک کر غصے سے اٹھیں۔

"میں نے آخر کیا بگاڑا ہے آپ کا کہ آپ مجھے یہاں چند دن بھی سکون سے رہنے نہیں دے رہیں۔ اور پھر جس طرح کے الفاظ میرے لیے آپ استعمال کر رہی ہیں' کسی لڑکی کے استعمال کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ شاید آپ کی کوئی بیٹی ہوتی تو آپ جان سکتیں کہ بیٹیوں کی عزت کتنی نازک ہوتی ہے مگر بیٹی تو کسی کی آپ بھی ہیں۔ میں تو جب سے آئی ہوں۔ میں نے آپ کے منہ سے انگارے ہی نکلتے دیکھے ہیں۔ میں جو دو دن سے یہ سب برداشت کر رہی ہوں تو صرف آپ کا لحاظ کر کے کہ کچھ بھی ہو آپ میری ماں کی بہن رہ چکی ہیں۔ مگر اب مجھے شک ہو رہا ہے اس رشتے پر بھی۔ کیا تو میرے نانا کیسے سے آپ کو اٹھالائے ہوں گے۔ رحم کھا کر یا پھر میری ماں کو بھی کیونکہ آپ کہیں سے بھی ان کی بہن نہیں لگتیں۔ لگتا ہے ان سے بھی آپ نے اسی طرح کا سلوک کیا ہو گا' آپ نے مگر اب میری برداشت سے باہر ہے یہ سب ان کا حوصلہ کمال کا تھا۔"

وہ اتنا سب کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دو دن بیگ میں اپنا مختصر سا سامان رکھا تھا' چند منٹ میں وہ اس گھر سے باہر تھی۔

وہ گھر جسے اس نے اپنی پناہ گاہ سمجھا تھا۔ اپنا تحفظ جانا تھا۔ محض دو دن میں اسے اپنی حیثیت کا پتا چل چکا تھا اور اب میری صبح وہ اپنا بیگ اٹھائے اس گھر سے باہر تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کس راستے جائے اور کہاں جائے۔ راستے الجھے ہوئے تھے۔ راستوں میں بہت سی پگڈنڈیاں تھیں۔ وہ کہاں قدم رکھتی اور اپنا راستہ دیکھتی۔ راہ میں کتنے کانٹے اور پتھر تھے۔ وہ جیسے رستہ صاف کرتی پہلے قدم پر ہی اس کے پاؤں کی ایڑی میں کانٹا چبھ گیا اور خون ٹپ ٹپ بہنے لگا۔ اتنا کہ ایڑی خون سے تر ہو گئی۔ اس نے جھک کر موٹا سا کانٹا نکالا مگر چبھن کا احساس کانٹا نکلنے کے بعد بھی رہ گیا تھا۔

لگ رہا تھا جیسے کانٹا ایڑی میں نہیں دل میں چبھا ہو۔ اس نے چبھن کا احساس بھلانے کے لیے سمت کی تعین میں چاروں اور نگاہ دوڑائی' کھیتوں کی طرف جانے والی پگڈنڈی کی طرف لوگوں کا ہجوم تھا' شاید فصل کی کٹائی کا دور تھا۔

دوسری طرف نہر کنارے مچھیرے اپنا جال بچھا رہے تھے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لیے۔ اور جھیل کے اس پار گھنا جنگل تھا۔

اسے کسی ایک طرف سے گزرتے ہوئے پار پہنچنا تھا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک گھنا جنگل اور ایک وہ گھر جہاں سے وہ یہاں آئی تھی۔ ہر جگہ گدھ

تھے۔ کہیں جانور تو کہیں انسانوں کی صورت۔ اس کا امتحان جیسے شروع ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میرا وجود اس گھر کے مکینوں سے دو دن کے لیے بھی برداشت نہ ہو سکا اور آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں گھر چھوڑ کر کیوں جا رہی تھی۔ ان لوگوں سے پوچھیے۔"

ابھی وہ اسٹیشن تک ہی گئی تھی کہ انزل اس کا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا اور اسے زبردستی سمجھا بجھا کر گھر واپس لے آیا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جس کو اس کا احساس ہوا تھا۔

"تمہیں یہاں سے نکالا تو نہیں گیا تھا۔ خود ہی سامان اٹھا کر نکل گئیں جیسے آئی تھیں ویسے منہ اٹھا کر چل دیں بغیر کسی کو بتائے۔"

وہ اپنے سابقہ انداز میں بجائے اپنی صفائی دینے کے اسی پر چڑھ دوڑیں۔

"نکلنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی آپ نے۔"

وہ انہیں افسوس سے دیکھے گئی جن کے چہرے پر شرمندگی کا عکس تک نہ تھا۔

"تم دونوں اسی طرح لڑتی رہو گی کیا؟ اور صنوبر! تم تو بچی نہیں ہو۔ تم بھی بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔ ہر وقت بچی کے ساتھ بحث بازی کے لیے تیار رہتی ہو۔ کم از کم اس کی اور تمہاری عقل میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔" نانا اس جھک جھک سے بیزار آ گئے تھے۔

"آپ نے ہمیشہ اس کی ماں کو مجھ پر فوقیت دی اور پھر اب اس کو دے رہے ہیں۔ ارے رکھیں اس کو اپنے پاس دیکھتی ہوں کب تک رکھیں گے کل کلاں کو اس کا باپ منہ اٹھا کر آ گیا اسے لینے کے لیے تو...؟" وہ اپنے تئیں انہیں ڈرا رہی تھیں۔

"تو پھر میں اس سے بات کر لوں گا... اور یہ میرا مسئلہ ہے۔ یہ یہاں مہمان ہے۔ تم اس کا کچھ تو لحاظ کر لو صنوبر! حد ہے تم تو اس کی خالہ ہو بیٹا! سر پر ہاتھ رکھو اس کے، بہن ماں کی بچی ہے اور پھر تیری بھانجی ہے کوئی غیر تو نہیں۔" انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔

"مہمان ہے تو مہمانوں کی طرح رہے۔ آتے ہی گھر پر جھنڈے بجانے بیٹھ گئی ہے۔ اسے تو وڈے (بڑے) نہ چھوٹے (چھوٹے) کا لحاظ ہے نہ خیال، ہر بات پر زبان کتر کتر چلتی ہے اس کی، ہمارے خاندان میں اس عمر کی چھوکریاں اس طرح بات کرتی ہیں کیا بھلا سے۔ اڑے اگر دو چار لفظ میں نے کہہ بھی دیے تو چپ نہیں رہ سکتی کیا۔" ان کے پاس دلائل کی کمی نہ تھی۔

"یہ تیری خالہ ہے بیٹا! تو بھی اس کا لحاظ کرے گی تو یہ غصہ نہیں ہو گی تجھ پر۔ زبان سے کہہ دیتی ہے۔ دل میں تیرے لیے میل نہیں اس کے۔"

"نانا! میں اتنی برداشت کر سکتی ہوں کہ یہ مجھے کچھ کہیں تو میں خاموش ہو جاؤں مگر ان کی ہر بات میں میری ماں کے لیے جو نفرت کا زہر ہوتا ہے وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ مر چکی ہیں نانا! اور کوئی مرے ہوئے لوگوں سے اس قدر نفرت نہیں کرتا وہ بھی بلا وجہ۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ میری ماں نے ان کے ساتھ ایسا کیا کیا ہے جس کا غصہ یہ ابھی تک ان پر نکالتی ہیں انہیں برا بھلا کہہ کر۔ آپ ان سے پوچھیے پلیز... میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"صنوبر! تو ایسا کیوں کرتی ہے؟" اس نے تو کبھی تیرے ساتھ کچھ غلط نہ کیا۔ وہ بڑی بہن تھی تیری ہمیشہ ہی تیری عزت کرتی تھی تیری ہر کڑوی بات برداشت کی اس نے پر اب تو وہ مر چکی ہے نا اب تو اس کو کچھ نہ کہا کر۔ اس کی روح دکھی ہوتی ہو گی کہ تو کسی طریقے سے اسے یاد کرتی ہے۔ اس کے لیے دعا کیا کر۔" وہ بھی ان کی طرف افسوس سے دیکھنے لگے۔

"رہنے دیں بابا! اس کو یاد کرنے والے، اس کے لیے دعائیں کرنے والے بہت ہیں اس دنیا میں اور آپ کیا کافی نہیں جو ہر وقت اس کے لیے روتے اور دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔"

وہ ساری بات ان کے گلے ڈال کر کمرے سے چلی گئیں۔

وہ دونوں بھی بھیگی بھیگی نگاہوں سے انہیں دیکھتے رہ گئے۔ ان پر کسی بات کا بھی اثر نا ممکن تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔

"کیا سوچتی رہتی ہو جو پریشان رہتی ہو پٹ؟" وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"میں پریشان تو نہیں نانا! آپ جو میرے ساتھ ہیں۔" وہ مسکرا کر انہیں یقین دلانے لگی۔ "بس یوں ہی سر میں درد ہو رہا تھا۔"

"سنبھا بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت سوچتی تھی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھی رہتی۔ لیکن وہ کہانیاں بہت لکھتی تھی۔ تم تو کہانی نہیں لکھتی نا؟"

"میں صرف کہانی پڑھتی ہوں اور دیکھتی ہوں۔ چلتی پھرتی کہانیاں، سانس لیتی ہوئی۔ زندگی بھی تو کہانی ہے نانا، ہے نا؟"

"ہاں زندگی بھی کہانی ہے۔ جب سنبھا کے سر میں درد ہوتا تھا تو وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی اور کہتی بابا میرے سر میں تیل لگا دیں نا!" وہ بچوں کی طرح اسے بتانے لگے۔

"پھر میرے سر میں بھی تیل لگا دیں نا بابا!" وہ ان ہی کے انداز میں کہنے لگی۔

"تم بابا کی گود میں سر رکھ کر لیٹو۔ وہ تیل اٹھا لاؤ۔" انہوں نے سنگھار میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ تیل کی شیشی انہیں پکڑا کر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ انگلیاں تیل میں ڈبو ڈبو کر اس کے سر پہ پھیرتے رہے۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

"نانا!"

"ہوں، بولو!"

"آپ نے مجھے وہاں کیوں چھوڑ دیا، ساتھ کیوں نہیں لے آئے؟"

"وہ تیرے باپ کا گھر تھا، میں کیسے زبردستی لے آتا میرے بچے!"

"باپ کا گھر۔ جہاں ہمیشہ مجھے میری ماں کے طعنے ملتے رہے۔" اس نے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا۔ "کچھ بھی نہ ملا مجھے وہاں سے سوائے محرومی کے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "ماں کے پاس بھی مجھے دینے کے لیے وقت نہیں تھا اور پھر اتنی جلدی چلی گئیں مجھے چھوڑ کر۔ باپ جس نے ایک دفعہ بھی پیار سے بات نہ کی مجھ سے۔ اس محبت کے لیے تو میں ترس گئی تھی۔" اس کا لہجہ بہت نرم مگر دکھی تھا۔

"اب تو میرے پاس رہنا۔ میں ہوں تیرا بابا، میں تجھے محبت دوں گا۔" انہوں نے اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

"میں پوری زندگی آپ کے پاس رہوں گی، اپنے پیارے نانا کے پاس۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔ اسے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ یہاں آ کے محفوظ ہو گئی ہے۔ ہر پریشانی سے ہر دکھ سے۔ زندگی سے جو گلے تھے وہ جاتے رہے۔

"میں تمہیں پڑھنے کے لیے حیدر آباد بھیج رہا ہوں، تم اپنی تعلیم مکمل کرو پھر وہیں اور فیصلہ کریں گے۔"

"آپ مجھے اپنے آپ سے دور کر رہے ہیں؟"

"بس کچھ وقت کے لیے میرے پٹ (بیٹا) پھر تو آبیلا گھر میں اپنی پوہ کو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔" وہ اسے تسلی دے رہے تھے۔

"یہ آپ کے کپڑوں کو کیا ہوا؟" صغریٰ ابھی دودھ کا گلاس لے کر ان کے کمرے میں آئی تھیں۔

"تیل کا دھبہ ہے خیر ہے۔"

"یہ داغ صاف نہیں ہو گا بابا جی!"

"کوئی بات نہیں میں کپڑے بدل لوں گا۔"

"کب تک داغ دار دامن کو بدلتے رہیں گے۔ عمر تو آ چکی ہے۔" ان کے لہجے میں حسب معمول طنز تھا۔

"کس کو بدلنے کی بات ہو رہی ہے؟" افزل ابھی لوٹا تھا اور سیدھا ان کے کمرے میں آیا تھا۔ پریشانیاں سمیٹے، سر دھانپتے ہوئے اٹھی۔

"کچھ نہیں بیٹا! تمہاری ماں کو مجھ پر رحم آتا ہے میرے بڑھاپے پر۔ شکر ہے تیری ماں کو کسی پر تو رحم آتا ہے۔" وہ ان کی بات سمجھ گیا تھا۔

"اگر تجھے اپنی ماں پر رحم نہیں آتا۔ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔" وہ پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں۔

"مت کہا کر تو افزل اسے، تیری تو ماں ہے جیسی بھی ہے۔" وہ اسے سمجھانے لگے۔

"اماں بھی نا۔ بس۔" وہ ان کو منانے کے خیال سے ان کے پیچھے چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"جیسے ماں کے لچھن تھے ویسے بیٹی کے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئیں آفت کی طرح اس پر نازل ہوئیں جب وہ سامان باندھ رہی تھی۔

"پھر کیا کر دیا ہے میں نے؟ اور میری ماں آپ کو خواب میں ڈراتی ہیں کیا جو انہیں گھسیٹ لیتی ہیں بار بار۔ کیوں آخر۔ آپ کیوں بھول جاتی ہیں کہ وہ مر چکی ہیں۔ اب چھوڑ دیں ان کا پیچھا خدا کے لیے۔" وہ بیگ پھینک کر اٹھی۔ "کیا چاہتی ہیں آپ مجھے بتا دیں۔"

"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور میرے بیٹے کا پیچھا چھوڑ دو تاکہ وہ شادی کر لے یہاں سے۔ خدا جانے کیا سحر پھونکا ہے اس پر تم نے۔" وہ کھل کر اصل بات پر آ گئیں۔

"جا تو رہی ہوں۔ اب اور کیا کروں اور آپ کے بیٹے کو پیچھا میں کیوں کروں گی؟ اپنی غلط فہمیوں کی بنیاد پر کسی کو بھی ذلیل کر کے رکھنا آپ کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔"

"اگر میں غلط فہمی کا شکار ہوں تو وہ شادی کے لیے کیوں نہیں مان رہا۔ آخر کیا کمی ہے آمنہ میں کہ وہ مسلسل انکار کر رہا ہے۔"

"تو اپنے بیٹے کو بلا کر پوچھیں، مجھے کیوں کہہ رہی ہیں آپ۔"

"کیا ہوا۔" افزل ٹھیک وقت پر آیا تھا۔

"اپنی ماں سے پوچھو اور ان کے سامنے کہو۔ کیا میں نے تمہیں آمنہ سے شادی کرنے کے لیے منع کیا ہے یا میں تمہارے پیچھے پڑی ہوں۔ خدا کے لیے اپنی ماں سے کہو کہ مجھ پر رحم کریں۔ اب تو جا رہی ہوں میں یہاں سے۔"

وہ تھک گئی تھی اس مسلسل جنگ سے۔ وہ زخم دینے سے کبھی باز نہ آتی تھیں۔ وہ روہانسی ہو کر کچن میں جا کر زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"اچھا نہیں کیا آپ نے اس کے ساتھ۔ معاف نہیں کرے گی وہ آپ کو۔" وہ دھاڑتا ہوا باہر نکلا تھا، یہ کی تلاش میں۔

"اور میں تجھے معاف نہیں کروں گی، اگر تو نے آمنہ سے شادی نہ کی تو۔" ان کی آواز نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر باہر نکل گیا۔

آج ساری رات وہ گھر نہیں لوٹا۔ دل چاہا کہیں بھاگ جائے یہاں سے۔ گھر کا سکون جیسے تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس پر اپنی بے بسی اور بے رخی لاتعلقی، آسانی کہاں تھی اور سکون کہاں تھا۔ اسے ان سب چیزوں کے ساتھ محبت کی طلب بھی تھی۔ مگر محبت کہاں تھی اس کے حصے کی، شاید کہیں نہیں۔

☆ ☆ ☆

"میں نے اسے مہران کی وادیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ کوئی شہزادہ ہے، بہت خوب صورت۔ مگر اس کا دل اس کی صورت سے زیادہ خوب صورت ہے۔

لوگ اسے نہیں سمجھتے، مگر میں سمجھتی ہوں۔
لوگ اسے نہیں جانتے، مگر میں جانتی ہوں۔

وہ پہاڑ پر چڑھ کر سورج کو دیکھتا ہے اور جب سورج چمکتا ہے تو وہ جنگلوں میں نکل آتا ہے، بکریاں کاٹتے پھر اپنی فصل میں ہل چلاتا ہے، بیج بوتا ہے اور محبت کاشت کرتا ہے۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ محبت کی فصل کسی کا پیٹ نہیں بھرے گی۔ وہ ناحق محنت کرتا ہے۔ مگر وہ لوگوں کو نظر انداز کر کے اپنا کام جاری رکھتا

ہے۔
جب فصل کی کٹائی کا وقت آتا ہے تو سنبھا، سوہل اور سورٹھ اس کی مدد کرتی ہیں۔
وہ سب محبت کا پھل ٹوکریوں میں بھر کر گھر گھر مفت بانٹتی ہیں۔
محبت کا پھل میٹھا ہوتا ہے شہد سے بھی زیادہ۔ جو بھی شہزادے کی فصل کا پھل کھاتا ہے۔ وہ میٹھی بولی بولتا ہے۔ وہ شہد تقسیم کرتا ہے اس کا لہجہ پھر کبھی کڑوا یا تلخ نہیں ہو پاتا۔
مگر اب شہزادہ مہران کی وادیوں میں گم ہو گیا ہے۔ نہ وہ صبح سویرے پہاڑی پر چڑھ کر سورج کو دیکھتا ہے اور نہ ہی لکڑیاں کاٹنے جنگل کا رخ کرتا ہے۔ نہ فصل میں ہل چلاتا ہے۔ نہ بیج بوتا ہے۔ نہ کٹائی ہوتی ہے۔
محبت کے پھل سے بستی والے محروم ہیں۔۔۔ ہر کوئی تیکھا ہوتا ہے۔
شہد کا ذائقہ زبان بھول چکی ہے۔
بستی والے کہتے ہیں۔ سنبھا، سورٹھ اور سوہل کو قتل کر دیا گیا ہے کاری کر کے۔ شہزادہ لاپتہ ہے۔ جب سے صرف ایک واقعہ بستی میں آیا تھا اس نے بستی والوں سے کہا کہ وہ تینوں بے قصور تھیں۔
جنگل کے پیچھے جو سایہ تھا وہ بھوت تھا۔ سنبھا پانی لینے ندی تک گئی تھی۔ ندی سوکھی ہوئی تھی۔ سنبھا کا مٹکا گر کر ٹوٹ گیا۔ قحط کی نشانی تھی۔ پانی زمین داروں کی فصلیں نگل گئیں۔
سوہل کی چوڑیاں کنوئیں کے پاس ملیں۔۔۔ اسے کنوئیں میں گرا دیا تھا۔ پھر اس کی لاش ہی کنوئیں سے نکلی۔
اور سورٹھ وڈیرے کے گھر کام کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے باپ نے زبردستی وڈیرے کے حکم پر بھیجا تھا۔ حویلی کے خفیہ تہ خانے میں اس کو بند کر دیا گیا۔ اس نے احتجاج کیا۔ وہ وڈیرے سے لڑتے لڑتے خود کو تو کسی طرح بچا لائی مگر پھر صبح کو فیصلے میں سورٹھ کو کاری کر کے مار دیا گیا۔
شہزادے نے کہا۔ اب محبت کا پھل کون بانٹے گا؟

اس لیے وہ بستی سے منہ موڑ کر چلا گیا ہے اور اب دو پہاڑی کے درمیان بنے ہوئے غار میں رہتا ہے جہاں روحوں کا مسکن ہوا کرتا ہے۔
وہ صدیوں سے سنبھا کی روح کا انتظار کر رہا ہے تاکہ سنبھا آئے اور وہ دونوں امر ہو جائیں۔ انتظار طویل تر ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ وقت گزاری کے لیے زمین کے کوئلوں کی کہانیاں لکھتا ہے۔"
شمس العارفین نے سنبھا کی کہانی پڑھ کر تنقید و تبصرے کے لیے کہا تھا۔
"سنبھا کے کردار بڑے خواب ناک قسم کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر علامتی لکھا ہے۔ ان کی یہی خوبی ہے کہ وہ زمینی مسائل پر لکھتی ہیں۔ انہوں نے کہانی میں حقیقت کو پرو دیا ہے۔ حقیقت جو کڑوی ہے مگر سنبھا کا لہجہ سنبھا کا تاثر بڑی نرمی سے بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ پرو جاتی ہیں۔ وہ تلخ نہیں ہوتیں وہ اداس ہوتی ہیں۔
جانے سنبھا کے اندر اتنی نرمی کہاں سے آگئی ہے۔ اتنا ضبط اور ٹھہراؤ۔۔۔ مجھے ان کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی پہاڑی پر شہزادے کا انتظار کرتی ہو کہ وہ آئے اور اس کی منزل تک لے جائے۔ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارا ادب اب کسی سنبھا سے جیسے محروم ہو چکا ہے۔ مگر بہرحال ان کی کہانی ہمارے پاس ہے۔ جتنی سنبھا کی صورت ابھی تک ہمارے ساتھ ہے۔ یہ محفل جو ان کے اعزاز میں سجائی گئی ہے۔ کاش ان کی زندگی میں ہی ان کے سامنے انہیں قدر دانی کا احساس دلایا جاتا۔
بہرحال۔۔۔ میں ان کے فن کو آج سلام پیش کرتا ہوں۔"
پنھل نے سنبھا کی تحریروں پر بڑا خوب صورت تبصرہ کیا تھا سب لوگ ساکت بیٹھے تھے۔ پروفیسر عارفین نے آج اس میں جیسے کوئی عکس دیکھا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے جیسے وہ پتھر کے ہو گئے تھے انہیں لگا جیسے پنھل کے اندر عارفین [illegible] بن کر سما گیا ہے۔
"اور میں کون ہوں؟" انہوں نے لمحے بھر کے لیے خود سے سوال کیا۔
"شمس العارفین یا سنبھا کا بھائی؟"
یا پھر صرف ایک پاگل پروفیسر۔ سندھی ادب اور فلسفہ پڑھانے والا ایک خبط دماغ اور الٹی کھوپڑی والا پاگل استاد۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ خود کو کس نام سے پکاریں۔ اپنی شناخت کیسے کریں۔
وہ کئی حصوں میں بٹے ہوئے انسان ہو گئے تھے۔
ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھے کہ پچھلی نشستوں سے سنبھا کا عکس کسی پرانی روح کی طرح چہرے پر گھونگھٹ لیے سفید آنچل سمیٹے ان کے سامنے آیا۔ وہ آگے پیچھے اٹھ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی پلکیں جھپکیں۔ مگر جب بھی اس کی طرف دیکھا یقین پختہ ہوتا چلا گیا۔ وہ سنبھا ہی تھی۔ ان کی سنبھا یا پھر بھی پنھل کی۔۔۔ مگر وہ سنبھا تھی۔
ہو بہو وہی چہرہ، وہی ناک نقشہ، وہی قد کاٹھ، وہی آواز، وہی لہجہ۔
اس کی آواز سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ انہوں نے آنکھیں میچ لیں۔ وہ اس وقت صرف اپنی سماعت کا یقین چاہتے تھے۔ آنکھیں بند تھیں جب ہی سنبھا سامنے کی سمعیات کر رہی تھی۔
محفل کب برخاست ہوئی۔ پتہ ہی نہ چلا پورا ہال خالی ہو چکا تھا۔ کسی نے ان کا شانہ تھپتھپایا تھا۔ وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آئے۔
"سنبھا کہاں ہے؟"
"آپ شاید کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئے تھے۔ تقریب تو کب کی ختم ہو چکی ہے۔ چلیں، میں گھر چھوڑ دوں آپ کو۔"
"سنبھا چلی گئی؟" ان کا ذہن جیسے مفلوج سا ہو رہا تھا۔ وہ غائب دماغی سے اس کو دیکھنے لگے۔
"سنبھا کہاں تھی سر؟" وہ حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔
"پھر وہ کون تھی۔۔۔ جو سنبھا دکھتی ہے؟" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہال سے باہر نکل آئے تھے۔
"وہ پروین تھی۔۔۔ پروین محمود کاظمی!"
"پھر وہ سنبھا کی طرح کیوں دکھتی تھی؟" وہ اس الجھن میں پڑ گئے۔
"پتہ نہیں۔۔۔ شاید اس کا سنبھا سے کوئی رشتہ ہے۔ مجھے بھی ایسا لگا۔ کیا وہ اس کی بہن ہو سکتی ہے؟" وہ فن فیلو کے درمیان سے گزرتے ہوئے گیٹ تک آئے۔
"نہیں۔۔۔ سنبھا ہی تھی وہ۔" انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسی غائب دماغی سے کہا تھا۔
ان کے لہجے کے یقین نے پل بھر کو اسے سوچنے پر مجبور کیا تھا۔
"مگر نہیں ان کو تو مرے ہوئے بھی بہت عرصہ ہو گیا ہے۔" اس کی سوچ نے اس خیال کی نفی کی۔ وہ گاڑی راستے پر ڈال چکا تھا۔
"سر! ہمیں کس علاقے کی طرف چلنا ہے؟"
"میں نہیں جانتا، میرا گھر کہاں ہے؟" انہوں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکایا۔
اسے اس پل ان کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا۔
"وہی تو مسئلہ ہو گا؟ کہاں رہتے ہیں آپ؟"
"سڑک پہ یا فٹ پاتھ پر۔" انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔
"اپنے استاد کو وہ یوں اس حالت میں کیسے سڑک پر اتار دیتا۔ سو اس نے گاڑی ہاسٹل کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی۔
"میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں سر۔۔۔ آپ بتائیں تو سہی۔"
"میں نے تم سے کہا ہے نا تم مجھے یہیں سڑک پر اتار دو۔ میں خود چلا جاؤں گا۔"
اس نے ڈرے ہوئے انداز میں گاڑی جھٹکے سے روک دی۔ اور وہ فوراً اتر گئے وہ وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ آگے چل کر انہوں نے رکشہ کو روکا تھا اس نے مطمئن ہو کر گاڑی موڑی تھی۔
گاڑی عرفان کے گھر چھوڑ کر وہ ٹیکسی میں ہاسٹل پہنچا تھا۔ آپچر چارہ ابھی تک اس کے انتظار میں بھوکا

بیٹھا تھا۔

"آچر! ہم کھانا کھا لیتے ہیں نا یار!"

"تو کیسے کھانے کی عادت نہیں نا۔ تیرا ایس ایم ایس بھی نہیں مل رہا تھا۔ پھر سوچا تو مصروف ہو گا۔ تقریب کیسی رہی؟" وہ کھانا دسترخوان پر رکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"بہت اچھی۔۔۔ ہماری یونیورسٹی سے بھی کافی لوگ تھے۔ اچھا لگا۔"

"تو بڑے بڑے ادیبوں سے بھی ملا ہو گا؟" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

"ہاں۔۔۔ بڑے عجیب لوگوں سے۔" وہ کھانے کے درمیان رک کر سوچتے ہوئے کہنے لگا۔

"اچھا۔۔۔ کبھی مجھے بھی ملاؤ ناں عجیب لوگوں سے۔ مجھے عجیب لوگوں سے ملنے کا بہت شوق ہے۔"

"شوق ختم ہو جائے گا۔ پروفیسر عارفین کی صحبت میں کچھ دیر بیٹھ کر دیکھو۔"

"وہ تو بڑے ذہین اور جینئس انسان ہیں یار!"

"تو نے ان کا صرف ایک روپ دیکھا ہے۔ خیر کھانا کھا، پھر بات کریں گے۔" وہ چند نوالے لے کر اٹھ گیا۔ اسے دونوں کی نیند آ رہی تھی۔

✿ ✿ ✿

"نانا جی! یہاں کا موسم بھی اچھا ہے اور لوگ بھی مگر ابھی سب کچھ نیا نیا سا ہے ماحول بھی اور لوگ بھی۔ ہاسٹل کی عمارت تو بہت پرانی ہے۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا ہے۔ کمروں کے نام پر بڑے بڑے ہال ہیں۔ ایک کمرے میں اس طرح بہت سے لوگوں کے رہنے کی گنجائش نکل آئی ہے گو کہ میرا پلنگ کونے میں پڑا ہے مگر پھر بھی اتنے لوگوں اور شور میں نیند کہاں آتی ہے۔ تمام رات لڑکیاں جاگتی رہتی ہیں۔ اور ٹی وی ڈراموں کہانیوں اور فلموں کے قصے ہوتے ہیں یا پھر نئے فیشن اور ڈیزائن کی باتیں۔

میں ان کی باتیں سنتی رہتی ہوں اور سوچتی ہوں۔ میرے ذہن میں ایسی باتیں کیوں نہیں آتیں۔ میں اس طرح کی باتیں کیوں نہیں کرتی۔۔۔ کبھی کبھی مجھے ان کی بے فکری پر رشک سا آتا ہے۔ پتا نہیں میں ایسا سوچتی کیوں ہوں۔

چلیں جانے دیں۔ گاؤں میں سردی عروج پر ہو گی۔ یہاں بھی بہت سردی ہے۔ لڑکیاں اتنی سردی میں آئس کریم کھانے باہر جاتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل نہیں چاہتا کہ میں بھی ان کے ساتھ آئس کریم کھانے جاؤں۔ وہ چلی جاتی ہیں اور میں کمرے میں اکیلی رہ جاتی ہوں۔

تنہائی میں مجھے سوچیں ڈرانے لگتی ہیں۔ بچپن میں بھی بہت ڈرتی تھی جب اکیلی ہوتی تھی۔ مگر شاید آپ کو نہیں معلوم۔ خیر آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤں گی۔ خیر ہے۔

ارے پتہ ہے نانا! آج سنجا کے اعزاز میں ایک تقریب ہوئی تھی میں بھی گئی تھی۔ ہمارے ہاں سنجا کسی کو یاد نہیں ہے۔ مگر یہاں وہ کچھ لوگوں کے دلوں میں ابھی تک زندہ ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور بہت ہی اچھا لگا آپ کو بھی اچھا لگے گا اور پتہ ہے کیا! یہاں بہت لڑکیاں دیہات سے آئی ہیں پڑھنے کے لیے۔ ہے ناں خوشی کی بات!

میں چھٹیوں میں آؤں گی اور یہاں انزل کی شادی کی ڈیٹ کنفرم کر دیں بلکہ مجھے کچھ پیسے بھی بھیج دیں تاکہ اس کی یہاں سے شاپنگ کر لوں یا پھر انزل کو بھیج دیں اس طرح ملاقات بھی ہو جائے گی اور وہ اپنی پسند سے چیزیں لے لے گا۔ اسے سلام کہیے گا اور اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

اپنی بیٹی کے لیے بہت دعائیں کیجیے گا۔ مجھے آپ کی طرف سے بہت ساری دعائیں چاہئیں ابھی نانا بہت یاد آتے ہیں۔ سوچ رہی ہوں کب چھٹیاں آئیں گی جی چاہتا ہے کیلنڈر کو پلٹ دوں مگر اس سے وقت تو نہیں بدلے گا نا! خیر انزل سے کہیں خط کا جواب ضرور دے۔ میں انتظار کروں گی۔"

آپ کی بیٹی۔۔۔ آپ کی پری۔

اس نے خط لپیٹ کر لفافے میں تہہ کر کے رکھا اور لیٹ گئی۔

"کس کو خط لکھ رہی تھیں؟" وہ چھلانگ مار کر اس کے پلنگ کی پائنتی پر آ بیٹھی۔

"اپنے نانا کو۔" نانا کا نام لیتے ہی اس کے ہونٹوں پر پُرجوش سی مسکراہٹ آ گئی۔

"فون کر لیا کرو۔ مجھے امی ابو یاد آتے ہیں تو میں فون کر لیتی ہوں۔"

"فون تو ہے پورا رابطہ ہے مگر نانا نے کہا تھا کہ خط لکھنا میں بار بار پڑھوں گا جب تم یاد آؤ گی تو۔"

"تمہارے نانا تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"پتا نہیں شاید وہ اپنا قرض اتار رہے ہیں۔" اس نے کروٹ بدل لی تھی۔ حرا اسے دیکھتی رہ گئی۔

✿ ✿ ✿

"اس کا تعارف صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے لفظوں کی طرح گہری، اپنے لہجے کی طرح نرم اور اپنی باتوں کی طرح خوب صورت، صاف اور شیشے کی طرح شفاف، آئینے کی طرح سچی، ہواؤں کی طرح ٹھنڈی اور راحت بخش، سورج کی طرح چمکتی ہوئی روشنی یا تھی۔ لیکن جیسی اندھیرے میں جلتی ہوئی لالٹین ہوتی ہے، تنہائی 'لو دیتی' جیسے طاق میں رکھا ہوا دیا، جو وقت کے ڈستے سے لو دیتا ہے اور پھر ایسے بھڑکتا ہے جیسے دنیا کو روشن کر دے گا۔"

"ہنھو! تو نے اسے اتنی غور سے دیکھا ہے؟" حفیظ نے رضائی سے سر نکالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"پرائی لڑکیوں کو اتنا غور سے نہیں دیکھا کرتے پتھل، گناہ ہوتا ہے۔ اماں بھی کہتی ہیں۔" آچر اپنے بستر کی چادر درست کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آچر! بچے ابھی اس بات کو نہیں سمجھ سکتے تو چپ رہو۔ ہاں تو بتاؤ بات کچھ آگے بڑھی؟ کیا بات ہوئی اس سے؟" حفیظ کا تجسس اپنی جگہ قائم تھا۔

"میرا اور اس کا تعلق خیال اور خواب کا سا ہے۔ اس سے آگے نہیں اور میں اس سے کیا بات کروں گا بھلا اسے اچھا تو نہیں لگے گا۔ میں تو اس کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا مگر کیا کروں میں۔ اس کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اسی کو دیکھتا ہوں پتہ نہیں کیوں اور کیسے۔ وہ تو اس قابل ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔" وہ اپنا ہاتھ شال میں لپیٹ کر خشک کرتے ہوئے اپنے بستر تک آیا۔

"واہ پیارے واہ! یہ بات لفظوں تک تو اچھی ہے۔ چند ایسے لفظ ہمیں بھی دے دے تاکہ کوئی ہمارے لفظوں کے جال میں پھنس سکے۔ ویسے کون سی کہانی کے کس صفحے سے اقتباس چرایا ہے تو نے بتا تو سہی؟" وہ رضائی ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔

"نجانے تم میرا مذاق اڑا رہے ہو یا ان کتابوں کا۔ بہر حال۔۔۔ تمہیں میں یہ حق نہیں دوں گا حفیظ!" وہ ذرا بددل سا ہو کر لیٹ گیا۔ دل پر کوئی بوجھ سا آن پڑا تھا۔ اسے لگا جیسے اظہار اسے راس نہیں آیا ہے۔

وہ جب اس سے کہہ نہیں سکتا تو کسی اور سے بھی یہ ذکر کیوں کرتا۔

"پتھل! تو دل چھوٹا مت کر۔ یہ اس سے زیادہ سوچ ہی نہیں سکتا۔" آچر نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھائی۔

"میں اس ٹاپک پہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ کسی کتاب کا ہی اقتباس تھا۔" اس نے کہا اور کتاب سرہانے سے اٹھا کر کھول لی۔

"اگر یہ واقعی اقتباس نہیں تو تو عنقریب مستقبل کا محمود مغل نہیں طارق عالم نہیں بنا۔ ایسے آنا سکیم جو رومان کو کیا خوب صورتی دیتا ہے وہ بننے والا ہے۔" آچر نے سوچتے ہوئے پیش گوئی کی تھی۔

"اچھا مذاق کر لیتے ہو۔" وہ ہلکا سا ہنس کر بولا اور کروٹ بدل لی۔

آچر بھی بتی بجھا کر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر میں آچر کے خراٹوں نے دونوں کو جگا دیا۔ حفیظ تکیہ اور چادر اور رضائی لے کر ساتھ والوں کے روم میں چلا گیا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر باہر نکل آیا۔ ٹھنڈ بہت تھی مگر تازہ ہوا نے جیسے اسے راحت سی بخشی تھی اس نے سر اٹھا کر روشن چاند کو دیکھا اور چاند میں چھپی صورت کو کھوجنے کی کوشش کی۔

✹ ✹ ✹

"پہلے مجھے یہ بتائیے کہ آپ کو کس سے ملنا ہے؟ پروفیسر شمس العارفین سے، ما بجھی سے یا پھر کسی اور سے؟" وہ دروازہ کھولتے ہی سلام کے بعد پوچھنے لگے، خاصے دوستانہ انداز میں۔

"میں یہاں نہ تو اپنے پروفیسر سے ملنا چاہتا ہوں نہ سنبھا کے ما بجھی سے میں یہاں مرحوم ماسٹر حسین احمد کے عزیز دوست سے ملنے آیا ہوں اگر آپ جگہ دیں تو ہم باقی باتیں اندر کرلیں بیٹھ کر آرام سے۔"

"ماسٹر حسین احمد کو تم کیسے جانتے ہو؟" وہ آگے سے ہٹتے ہوئے کچھ حیرانی سے پوچھنے لگے۔

"ماسٹر حسین احمد کا فرزند ہونے کا اعزاز رکھتا ہوں سر!"

"اوہ... تم حسین کے بیٹے... تو تم ہو وہ ارے میں نے تمہیں بہت پہلے دیکھا تھا جب تمہیں بولنا بھی نہیں آتا تھا اور اب تم اتنی باتیں کرنے لگے ہو۔" وہ اسے پیار سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہنے لگے۔

"تمہارا باپ کہتا تھا" خدا کرے میرا بیٹا مجھے باتوں میں مات... نہیں تو مجھ سے تمہیں جیت سکتا..."

"انہیں اندازہ نہیں تھا کہ آپ کو تو کوئی بھی مات نہیں دے سکتا سر!"

"نہیں یار! ہر انسان بہت بار زندگی میں ہارتا ہے بہت لوگوں سے ہارتا ہے۔ کبھی تقدیر اسے اس کی اوقات بتاتی ہے۔ مگر انسان احمق ہے نا...! پھر سے اپنے آپ پر فخر کرنا شروع کرتا ہے... خیر تم بیٹھو میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاؤں۔"

"ارے نہیں سر! ہم صرف باتیں کریں گے۔ ویسے یہاں اور کون کون رہتا ہے؟"

"یہاں عارفین رہتا ہے... ایک پاگل پروفیسر رہتا ہے۔ سنبھا کا ما بجھی رہتا ہے... اور... اور ایک خوب صورت عورت عارفین کی بیوی کی حیثیت سے رہتی ہے۔" وہ چمک کر رازدارانہ انداز میں اسے بتانے لگے۔

"اتنے مردوں کے ساتھ ایک عورت؟" اس نے اسی رازدارانہ انداز میں کہا۔

"نہیں وہ صرف عارفین سے مطلب رکھتی ہے نہ اسے پروفیسر سے کوئی لینا دینا ہے۔ نہ ہی ما بجھی سے مگر ایک مزے کی بات بتاؤں پھر بھی وہ پروفیسر سے ہمیشہ چڑتی ہے اس پر بگڑتی ہے۔ اسے پاگل کہتی ہے اور اس سے بیزار ہوتی ہے اور ما بجھی سے تو جیسے اس کو عجیب سی چڑ ہے۔ شاید نفرت یا اس سے بھی زیادہ وہ یہاں صرف عارفین سے مطلب رکھتی ہے۔" وہ اسی انداز میں کہتے ہوئے کچن کی طرف چل دیے۔

"ابھی وہ کہاں ہے سر؟" وہ ان کے پیچھے ہی کچن میں آیا تھا۔

"وہ خفا ہو کر چلی گئی ہے۔ اسے چڑ ہے پروفیسر سے جس کی باتیں اس کی سمجھ سے باہر ہیں۔"

"اور ما بجھی سے اس لیے کہ وہ خاموش رہا کرتا ہے۔ سنبھا کے خیالوں میں کھویا ہوا ہے۔ وہ سنبھا سے حسد کرتی ہے۔ جلتی ہے اس محبت سے جس نے ما بجھی کو ابھی تک جکڑ رکھا ہے اپنے حصار میں۔

اسے جھوٹی ہنسی ہنستا ہوا عارفین چاہیے... جو اس کی ہر بات پر اثبات میں سر ہلائے۔ اس کے ساتھ باہر ڈنر پر جائے۔ اسے اپنے ساتھ گھمانے پھرانے لے جائے اور گھر میں بیٹھ کر تمام دن اس کے حسن کی تعریف کرے... اسے سراہے جو بیں گھنٹے اسے اپنی بے پناہ محبت کا احساس دلاتا رہے۔ تب وہ خوش رہ سکتی ہے کہہ گئی ہے اگر مجھے عارفین خود منانے آیا تو آؤں گی ورنہ پھر اسے الگ..." وہ اس کے لیے کافی بناتے ہوئے بتانے لگے۔

"وہ اپنا جائز حق مانگتی ہے۔ وہ غلط نہیں ہے۔"

"حمیرا جب مجھ سے شادی کے لیے کہتی تھی تب ہی میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھ سے تمہیں کچھ بھی نہ ملے شاید جھوٹا پیار بھی نہیں۔

وہ میرے بارے میں جانتی تھی کہ... میں ایک جنونی ما بجھی ہوں۔ لکھتا ہوں تو ڈوب جاتا ہوں۔ مجھے دنیا جہاں کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ میں سنبھا کا ما بجھی

ہوں آہی کار ہوں گی۔ مگر تمہیں بتاؤں پنچھو! اس نے مجھ سے کہا میں تم سے تمہاری محبت نہیں مانگوں گی' میں تو صرف تمہیں محبت دینا چاہتی ہوں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ میرے ماں باپ نہیں بھائی شادی کر کے الگ شفٹ ہو گیا ہے۔ میں تنہا ہوں۔

میں نے اس سے کہا بھی تمہیں مجھ سے بہتر کئی لوگ مل جائیں گے۔

مگر اس نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ تب تو وہ میری طوفانی محبت سے متاثر تھی' اس نے کبھی مجھے غلط نہیں سمجھا۔ کئی رشتے ٹھکرا کر میرا انتظار کرتی رہی۔ سب نے کہا اس سے شادی کر لو۔ وہ مر جائے گی۔ اسے مزامت دو۔ وہ تمہارے لیے بیٹھی ہے اور میں نے اس سے کہہ دیا تھا تم سنجا سے کبھی اس کا مانجھی مت چھیننا۔۔۔ تم اپنی جگہ الگ بنانا۔۔۔ اپنا مقام الگ بنانا۔ میں نے اس سے شادی صرف اس کے بچے کی اپنے لیے نہیں۔ میں سنجا سے بے وفائی تو کر ہی نہیں سکتا تھا۔۔۔ مگر اسے پتا ہے پنچھو۔۔۔ اس نے پہلے دن سے سنجا کے خلاف محاذ بنا لیا۔

کوئی مرے ہوئے انسان سے اتنی نفرت نہیں کرتا۔ مگر اس نے کی پھر بھی میں سب سہتا رہا۔ اس کے سمجھنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے پروفیسر پر نکتہ چینی شروع کر دی اور اب اسے عارفین میں بھی کئی طرح کے عیب دکھتے ہیں۔ در حقیقت وہ اپنے غلط فیصلے پر پچھتا رہی ہے۔"

"سر! آپ نے کبھی سنجا کو بھولنے کی کوشش نہ کی؟"

وہ اپنے حصے کا کپ اٹھاتے ہوئے ان کے ساتھ کچن سے باہر آ گیا۔

"بہت دفعہ۔۔۔ پہلے نہیں اب جب بڑھاپا حاوی ہونے لگا ہے۔ تب انسان کمزور ہو جاتا ہے۔ مگر در حقیقت حمیرا نے سنجا کو بھلانے ہی نہ دیا۔ میں چپ ہوتا تو وہ کہتی تم اس کو سوچ رہے ہو۔ بار بار اس کا احساس دلاتی۔ میں نے اپنی ڈائریاں جلا دیں۔ اپنی کتابیں بانٹ دیں۔ لکھنا چھوڑ دیا۔ لگتا تھا اب لکھنے کو کچھ بھی نہ رہا ہو جیسے۔ سب کچھ لکھ لیا جیسے۔ میں نے اپنے اندر مانجھی کا گلا گھونٹ کر اسے دفن کر دیا۔ ویسے بھی مانجھی تو کتابوں سے پیدا ہوا تھا۔ اس کا جنم کتابوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ میں نے مانجھی کے نام سے لکھا تھا اور سنجا مجھے مانجھی کہتی تھی۔ میرے ابا نے میرا نام شمس العارفین رکھا تھا۔ میں ان کے لیے اور باقی دنیا کے لیے عارفین ہی رہا۔ بعد میں پروفیسر کا خطاب دے دیا گیا۔ ابا کہتے تھے کہ میرا عارفین پروفیسر بنے گا۔ یہ دعا بھی نہ کی کہ اسے زندگی میں خوشی ملے گی' سکون ملے گا۔ ماں باپ بچوں کے لیے دعائیں تو خوب کرتے ہیں مگر کاش ابا بھی میرے لیے خوشی کی بھی دعا کر لیتے۔۔۔ ان کی زندگی میں پیسے کی کمی تھی تو انہیں صرف اس کمی کا احساس تھا۔ ان کے پاس سکون تھا اس لیے انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ اگر نہ ہو تو انسان کہیں کا نہیں رہتا۔"

ان کی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ بڑے دنوں بعد دل کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ ساری باتیں جو کبھی کسی سے نہ کہیں' باہر آ گئیں۔

"بہت دنوں سے لکھا نہیں۔ اس لیے اندر بہت غبار جم گیا ہے۔ سوچتا ہوں اب لکھنا شروع کروں تاکہ دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جائے۔" ان کا لہجہ تھکا ہوا تھا۔

اسے ان کی تنہائی پر بے تحاشا ترس آیا تھا۔

"سر۔۔۔ اسے منائیں۔"

"نہیں یار! میں چاہتا ہوں وہ اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے شروع کرے۔ وہ خود فیصلہ کرے۔ میں چاہتا ہوں اس بار بھی فیصلہ وہی کرے۔ ہاں یہ آسان ہے کہ نتائج کا ذمہ دار میں ٹھہروں گا۔ اس سے مگر فرق تو نہیں پڑتا۔ بہر حال یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے لیے اچھا سوچے۔"

"اور آپ۔۔۔ آپ کی تنہائی؟" وہ فکر مند ہو گیا ان کی حالت دیکھ کر۔

"میں پہلے بھی تنہا تھا۔ جب جوانی ایسے گزر گئی تو بڑھاپا بس کچھ سال۔ میری عمر ساٹھ سال ہو چکی ہے۔ باقی چند برس اور پھر۔۔۔" وہ لمبی سانس بھر کر خاموش ہو

گئے۔

"سر! اچھا نہیں ہوا یہ سب۔ زندگی کے کچھ سال ہی اچھے گزار لیں۔۔۔ کیوں اپنے ساتھ اتنی زیادتی کر رہے ہیں۔"

"اپنے ڈھنگ سے مت سوچو۔ بس یہ دعا کرو اب جتنی بھی عمر ہو سکون سے گزرے۔ میں سکون چاہتا ہوں پنچھو۔۔۔! دیکھو اگر حمیرا سے الگ رہ کر میری زندگی سکون سے گزرے گی تو یوں ہی سہی۔"

"میں دعا کروں گا۔۔۔ مگر آپ اپنا خیال بھی تو رکھیں نا۔"

"تم میرے ساتھ آ کر رہو نا پنچھل!" انہوں نے بچوں کی سی معصومیت سے اس سے درخواست کی۔ ان کے لہجے میں اصرار تھا۔

"سر! میرے دوست میرے ساتھ ہوتے ہیں انہیں دکھ ہو گا۔ آج تو میرے بغیر کھانا بھی نہیں کھانا۔ حنیف اسے میری بیوی کہہ کر چڑاتا ہے۔ وہ بہت حساس ہے اکیلا پن محسوس کرے گا۔"

اس کو نہ چاہتے ہوئے بھی انکار کرنا پڑا۔

"چلو پھر ٹھیک ہے کوئی بات نہیں مگر یہاں سے تمہارا ہاسٹل دور تو ہے پھر بھی میں کہوں گا مجھ سے روز ملا کرو۔ تمہارے اندر سے مجھے تحسین کی خوشبو آ رہی ہے۔ پتا ہے کلاس کے سب بچوں میں سے پروا اور تم کو میں بہت اپنے دل کے قریب محسوس کرتا ہوں۔ پروا ابھی تک ایک سراب کی سی ہے۔ کھلتی ہی نہیں۔ پتہ نہیں کیوں جب بھی اس کو دیکھتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سنجا سامنے ہو میرے۔۔۔ خدا جانے ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔"

"ویسے سر! یہ بات میں بھی سوچتا ہوں۔ مگر آپ اسے اتنا غور سے نہ دیکھا کریں۔ اسے اچھا نہیں لگتا۔ اور کلاس کے لڑکے بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔"

"وہ لوگ جاہل ہیں پنچھل! وہ تو میری بیٹی کی طرح ہے۔"

"ہاں اس دن آپ نے اسے بیٹا کہا تھا جب وہ کرسنٹ سے باہر جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا جیسے اس کے چہرے پر ایک دم سے اطمینان سا پھیل گیا ہو۔"

"ہاں یہ نیچرل ہے۔ جب تک ہم کسی رشتے کو نام نہیں دیتے' وہ بے شناخت ہوتا ہے۔ تعلق اور محسوسات بھی شناخت اور یقین چاہتے ہیں۔"

"میں تقریباً ہم جماعت ساتھیوں میں تمام لڑکیوں کو اسی طرح مخاطب کرتا ہوں سر! میری خود کی سوچ ہے۔"

"پروا کو تم ایسی کہا کرو بھئی' وہ بچی کنفیوژن کا شکار رہتی ہے۔"

"آپ اس سے پوچھیں میری بہن بننا پسند کرے گی؟" اس کے ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ در آئی۔

"تم خود پوچھو نا! اس سے؟" وہ اس کو کافی حد تک سمجھ رہے تھے۔ "میں اچھا لگوں گا پوچھتے ہوئے' ویسے سر! کوئی خوب صورت لڑکا کسی لڑکی کو بہن نہیں بنانا چاہتا!"

"پنچھل! ایک بات کہوں؟" وہ اصل بات پر آ گئے۔

"جی۔۔۔ کہیں۔"

"ہر کام اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے۔ مگر وقت کے بعد ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہتا۔۔۔ دیر مت کرنا تم۔۔۔ یاد رکھنا تقدیر بار بار موقع نہیں دیتی' جب محسوس کرو۔ اس سے نرمی اور آرام سے ایک دفعہ بات کر لو۔"

"جی سر۔ ابھی ذرا اور سا لگتا ہے کہ وہ۔۔۔"

"اس کا مت سوچو پنچھل! اپنی بات کرو۔ دیکھو اگر ایسی بات ہے بھی سہی تو وہ پہل ہر گز نہیں کرے گی۔"

"ہاں یہ بات تو ہے سر۔۔۔!" وہ ان کی بات پر سوچنے لگا تو دل کو لگی۔

تبھی اس کا موبائل فون بج اٹھا۔

"اوہ۔۔۔ آج کی کال ہے۔ وہ کھانے پر انتظار کر رہا ہو گا۔"

"یار! یہ واقعی بیویوں کی طرح بی ہیو کرتا ہے۔ چلو

"جاؤ تم عظیم ہے۔" وہ کہتے ہوئے اس کے ساتھ ہی اٹھے تھے۔

"وہ سب کا ہی اس طرح سے خیال رکھتا ہے' خوش نصیب ہوگی وہ لڑکی جسے آپ جیسی بیوی ملے گی۔" اس نے ہنستے ہوئے جان بوجھ کر جملے کو بگاڑا تھا۔

وہ دونوں ہنستے ہوئے دروازے تک آئے۔

☼ ☼ ☼

حسب معمول یونیورسٹی کے حالات اچانک ہی بگڑ گئے تھے۔ آج پوائنٹ بھی نہیں چلا تھا۔ باہر آ کر ہی کسی ہنگامے کا علم ہوا تھا۔

ماریہ کو کسی نے فون کر کے بتایا تھا کہ ان کے کلاس کے لڑکے بابر سعید کو کچھ لوگ پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اور آج کے چھڑانے پر اس کی بری طرح پٹائی ہوئی ہے۔ دونوں گروپ جھگڑ پڑے اور کسی نے پوائنٹ بھی رکوا دیا ہے۔

"پتا نہیں ان لڑکوں کو انقلابی بننے کا جنون کیوں رہتا ہے۔ فضول کے جھگڑوں میں اپنے آپ کو خود کو تباہ کر لیتے ہیں۔" حرا سے سب کچھ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

جبکہ اس نے کچھ دن پہلے ہی محسوس کیا تھا۔ بلاوجہ ہی بابر پر کمنٹ دے کر اسے جھگڑنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ اس نے جب بابر سے پوچھا تو اس نے بتایا وہ اسے مخالف پارٹی کے گروپ سے سمجھتے ہیں کہ میں ان کا حامی ہوں۔ وہ مجھ پر پریشر ڈالنا چاہتے ہیں۔" تب سے اس نے اسے احتیاط کرنے کو کہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی معصومیت اور خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ مگر ہوا پھر بھی یہی تھا۔ بنہل اچانک وہاں پہنچا تھا۔

"آپ سب یہاں کیوں کھڑی ہیں اس طرح؟" اسے ان سب کا یوں سڑک پر کھڑا ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔

"یہ کیسی خبریں سننے میں آ رہی ہیں۔ یہ ہنگامہ کیوں ہوا ہے؟" حرا نے بے چینی سے اس سے پوچھا تھا۔

"یہ پارٹی باز لڑکوں کی آوارہ گردی کا نتیجہ ہے۔ بیچارہ آج مفت میں خوار ہوا ہے۔ ابھی اس کی پٹی کرا کے چھوڑ کر آ رہا ہوں ہاسٹل۔ آپ لوگ جائیں میرا مشورہ ہے کل یونیورسٹی مت آئیے گا۔" وہ عجلت میں کہتے ہوئے آگے بڑھا۔

"مگر اغوا والی بات کہاں تک سچ ہے؟" ماریہ نے اسے جاتا دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

"بابر کو لے گئے ہیں وہ لوگ ابھی ٹھیک سے پتہ نہیں۔ چلیں میں ہاسٹل تک آپ لوگوں کے ساتھ جاتا ہوں۔"

"مگر بابر تو مسکین سا لڑکا ہے۔ وہ تو کسی نعرے بازی میں بھی حصہ نہیں لیتا پھر اس کو کیوں پکڑا ہے اور وہ لوگ ہیں کون؟ کچھ تو پتہ ہوگا نا؟"

"نامعلوم لوگ ہیں۔ ابھی کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔" وہ ان کے ساتھ نکلتے ہوئے جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

"کیا مطلب۔ یہ تو کوئی بات نہیں۔ وہ ہم لوگوں کا ساتھی ہے۔ کیا ہم اسے ایسے ہی تنہا چھوڑ دیں؟" حرا کو اس کے انداز پر ہی بھر کر غصہ آیا تھا۔

"اب ہم کیا کر سکتے ہیں خود ہی لوگ ایسے پھندوں میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ بڑا شوق ہوتا ہے آج کل کے لڑکوں کو ہیرو بننے کا۔" اس بار ماریہ بول پڑی۔

"اور ویسے بھی ہم لڑکیاں تو بندوقیں لے جا کر اس کا دفاع نہیں کریں گے۔" اس بار رائے آمنہ کی تھی۔

"ارے بابر بیچارہ تو معصوم سا بندہ تھا۔ وہ تو تیز ہواؤں سے بھی ڈرتا تھا۔ واہ بھئی واہ۔ اچھا انصاف ہے۔ اور تم لوگ بنے کٹے ہو کچھ بھی مت کرنا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہو۔ چاہے اس بے چارے کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔ غریب کا بچہ ہے ناچار ہے۔" حرا کو غصہ آ رہا تھا۔

"کیا اب کچھ کہیں کہنا ضروری ہے۔ چپ کر کے چلو۔" پرو جاتی دیر سے خاموش تھی اس کی بے صبری پر ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔

"حرا کچھ باتیں یوں سر راہ کرنے کی نہیں ہوتیں اور ویسے بھی ابھی ہم کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔ آپ لوگ آرام سے جائیں اور ہاسٹل میں ہی رہیے گا۔" وہ آخر کار بحث ختم کرنے کے لیے سمجھانے لگا تھا۔

"یہ اچھی کہی آپ نے۔ آپ بھی ہاسٹل سے مت نکلیے گا ہم تو ویسے بھی نہیں نکلیں گے۔ ہے نا!" حرا کو اس کا انداز اس بار بھی زہر لگا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ جان بوجھ کر لاتعلق رہنا چاہتا ہے۔ اسی بنا پر اس کا ردعمل اتنا سخت تھا۔

"حرا! یہ تمہارا مسئلہ تو نہیں کیوں سر کھپا رہی ہو؟" ماریہ نے اس بار اسے بیزاری سے ٹوکا۔

"بے فکر رہو کل کو تمہیں کوئی اٹھا کر لے گیا تو بالکل بھی سر نہیں کھپاؤں گی۔"

"وہ تو سچ ہی ہے کیونکہ تمہیں مجھ سے کیا ملے گا۔" اس نے بھی جلا کٹا جواب دیا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟ بابر کوئی ہر مہینے چاول اور آٹے کی بوری میرے گھر دے جاتا ہے جو میں اس کے لیے لڑ رہی ہوں۔" وہ رک کر باقاعدہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"اف خدایا! تم دونوں کو کسی جگہ بلی سے لڑنے کے لیے۔ چپ ہو جاؤ حرا!" پرو نے ان دونوں کو اس طرح الجھتے ہوئے دیکھ کر پریشانی سے کہا۔ باقی کا چند منٹ کا فاصلہ خاموشی سے گزرا تھا۔

"میں شاید ان لوگوں کو جانتی ہوں بنہل!" وہ ساری لڑکیاں گیٹ سے اندر چلی گئیں تب وہ گیٹ پر رک کر بولی۔

"کون ہیں وہ....؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی مگر اس دن جو مسئلہ ہوا تھا۔ تب کچھ لوگوں نے بابر کو دھمکی دی تھی مجھے خدشہ تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے مگر اس حد تک؟ آپ لوگوں کو واقعی فوری طور پر کچھ کرنا چاہیے۔"

"یعنی آپ سمجھتی ہیں کہ یہ ان کی خاندانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ یونین کے جھگڑے تو ایک بہانہ ہیں؟ ویسے میں پولیس میں رپورٹ درج کرا آیا ہوں اس کے باپ کے ساتھ۔ آگے دیکھتے ہیں اس کے فادر کا رابطہ تو ہے ہم سے مگر یہ بات فی الحال کسی کو بتائیے گا نہیں۔ میں جہاں تک ہو سکا اس کے لیے کرنے کی کوشش کروں گا" آگے دیکھتے ہیں۔" وہ کچھ پریشانی سے پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"او کے۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔ میرا مطلب ہے ان کا نزلہ آپ پر بھی گر سکتا ہے نا!" وہ اسے خدا حافظ کہتی گیٹ کے اندر چلی گئی۔

وہ خاموشی سے اس کی پشت تکتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"بابر کی چوٹ اب کیسی ہے؟ سنا ہے آپ سب لوگ کل اسے مل کر دیکھنے گئے تھے؟" وہ اسے کلاس سے باہر ہی ملی تھی۔

"اب بہت بہتر ہے شکر ہے جان بچ گئی اس کی۔ چوٹیں تو بھر جاتی ہیں ایک دن۔"

"مگر کچھ چوٹیں تو کبھی نہیں بھرتیں۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

"ہر چوٹ اور زخم کا علاج ہوتا ہے اگر کوئی چارہ گر ہو تو۔" وہ اس کی بڑبڑاہٹ واضح طور پر سن چکا تھا۔

"جانے دیں بنہل صاحب! چارہ گر تو نہیں ملتے، زخم دینے والے البتہ بہت ہیں۔ میں چلتی ہوں۔" اس نے محسوس کیا تھا وہ اس کے سامنے کمزور ہو رہی تھی۔ سو اس سے بہتر تھا کہ وہ اپنی راہ لیتی۔

"مجھے کچھ اور مسائل پر بھی آپ سے بات کرنی تھی۔" وہ گفتگو کو طول دے کر اسے روکنا چاہتا تھا۔

"ہم مسائل پر صرف بات ہی کر سکتے ہیں ہمارے اختیار میں ہے ہی کیا؟ فیصلے تو کہیں اور ہی ہوتے ہیں۔ معقول کے کام بھی رہ جاتے ہیں۔" وہ کسی صورت بھی یہاں مزید رکنا نہیں چاہتی تھی۔

"میں سمجھتا تھا آپ سنیا کو اپنا آئیڈیل سمجھتی ہیں تو ان ہی کی طرح سوچتی ہوں گی۔ اس دن تقریب میں تو آپ نے ان کے پوائنٹس کو بڑے اچھے طریقے سے ایکس پلین کیا تھا۔ ایک تعمیری سوچ کے ساتھ اور

ابھی ایسے لگتا ہے جیسے آپ اپنے آپ ہی سے بھاگنا چاہ رہی ہیں۔"

"کچھ کیسے ایسے آتے ہیں جب انسان اپنے سامنے جواب دہ ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اور اس طرح سرراہ تو بالکل بھی نہیں۔" وہ اتنا کہہ کر مزید نہیں رکی تھی۔

باہر نکلنے پر اسے یاد آیا کہ کوئی کام تھا اسے مگر کیا؟ وہ ذہن پر زور دینے لگا۔

مگر کام کے بجائے ابھی کچھ دیر پہلے وہ جملہ یاد آ گیا۔

"معمول کے کام بھی رہ جاتے ہیں۔" اور اس نے سوچا وہ کتنے دنوں سے معمول کے کام بھی نہیں کر پا رہا۔

☆ ☆ ☆

جب محبت کے بارے میں سوچتا تھا تو مسائل سامنے آ جاتے اور جب مسائل کو نمٹانے کی کوشش کرتا تو محبت اس کے خیال کی صورت ذہن سے لپٹ جاتی۔

ذہن میں وہ تھی اور سامنے لوگ تھے۔ مسائل تھے، حقیقتیں تھیں۔ وہ کتنا کچھ اور تھا اور سوچتا کچھ اور تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اندر آیا تو وہ کھانا ٹرے میں رکھے ایسے ہی بیٹھی تھی جانے کتنی دیر سے۔

"کیا آج بھی کھانا نہ کھانے کا ارادہ ہے؟" وہ آ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کھانا زندہ رہنے کے لیے کھایا جاتا ہے اور جب زندہ رہنے کی خواہش دم توڑ جائے تو کھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" بھیس کا لہجہ خشک تھا۔

"پرو! تم زندگی کو اپنے لیے آسان کیوں نہیں کر لیتیں؟" معصوم سا سوال تھا۔

"مجھے مشکلوں کو آسان کرنا نہیں آتا۔"

"محبت تو بڑی بڑی مشکلیں آسان کر دیتی ہے۔" وہ بے ساختہ ہی کہہ بیٹھا۔

"محبت کا نام بھی مت لو انزل مراد!" وہ جیسے ڈر سی گئی تھی۔

"تو پھر کس کا نام لوں؟" لہجے میں دبا دبا سا احتجاج تھا۔

"میرا نام تو کبھی مت لینا۔ تمہارے لیے منحوس ہی ثابت ہو گا۔" وہ ٹرے کو ہٹا کر اٹھی تھی۔

"تم نے مجھے بے وجہ ہی نامراد کر دیا۔ کیوں؟" احتجاج واضح تھا اب کہ۔

"بے وجہ تو نہیں انزل مراد! محبت راہ کھوٹی کرنے کا نام نہیں ہے اور پھر میرے دل میں ایسا کوئی احساس بھی نہیں ہے۔" وہ جواب دے کر رکی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

"وہ بہت جذباتی ہے۔" وہ شیشے پر جمی گرد سے دائرے بناتے ہوئے بولا۔

"وہ بالکل سنبھا کی طرح ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرائے تھے۔

"تو پھر اسے سمجھے کیوں؟" اس نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

"اسے خواب کہو۔" وہ خود جیسے کسی خواب میں گم تھے۔

"میں اسے حقیقت میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" پنھل کی امید زندہ تھی۔ اس نے دائرے کے اندر گرد ہٹاتے ہوئے امید لکھا تھا۔

"اسے تمہارے لیے لڑنا پڑے گا اور اپنے لیے بھی مگر تمہارا ساتھ مضبوط ہونا چاہیے۔"

"محبت سے زیادہ مضبوط کچھ نہیں ہو گا۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"محبت کو کبھی کمزور مت کرنا۔"

"آپ میرا ساتھ دیں گے؟"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا ان ہاتھوں میں ایک عہد بندھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"جب سے گاؤں سے لوٹی ہو۔ الجھی الجھی سی رہتی ہو۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔ سوچ رہی ہوں ساڑھے تین سال کیسے گزر گئے۔ یہ آخری سال ہے۔ کیا میں نے یہی چاہا تھا۔ پھر دل اتنا خالی خالی کیوں ہے؟"

"میں محسوس کر رہی ہوں تم کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہی ہو مگر کر نہیں پا رہیں۔ کیا مسئلہ ہے پرو؟"

"کچھ نہیں۔ بس یہ سوچ رہی ہوں جس حق کے لیے میں نے آواز اٹھائی تھی اس کا کیا ہوا۔ میں تو سنبھا کی محرومیوں کو مٹانا چاہتی تھی۔ وہ ملت کی عورت کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ یہ دفاع صرف میری ذات کا تو نہیں اور اب جب سوچ رہی ہوں تعلیم مکمل کر کے اپنے گاؤں کی عورت کے لیے کچھ کروں تو ایک اور زنجیر قدموں کی تلاش میں پیچھے آ رہی ہے۔ کیا پھر سے جا کر آواز اٹھاؤں اور مسائل بھول جاؤں؟ میں کہاں جا رہی ہوں اور منزل کہاں ہے کچھ پتہ نہیں۔" وہ مکمل طور پر الجھی ہوئی تھی۔

"تمہیں کون سی بات الجھا رہی ہے پرو؟ اپنے لیے سوچنا اپنی ذات کے لیے اپنا حق مانگنا کمزوری ہوتی ہے۔ شرم ہی جاتی ہے اور پھر تمہارے نانا اچھے ہیں۔ تمہیں سمجھیں گے۔ میں کہتی ہوں پنھل کو مایوس مت کرو۔ ایسا بندہ پھر تمہیں نہیں ملے گا۔ شادی کرو اور اس کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرو۔" وہ اسے آسان سا راستہ بتا رہی تھی زندگی کے لیے۔

"بس یہی کچھ چاہیے تھا مجھے؟ نہیں حرا! زندگی کا مقصد صرف شادی تو نہیں ہے۔" اسے اس سے اختلاف تھا۔

"تو پھر جا کر بیٹھ جاؤ کسی ایسے کے انتظار میں جیسا تمہاری ماں کے نصیب میں تھا اور پھر تمام عمر روتی رہو کیونکہ شادی تو ہونا ہی ہے۔" وہ اسے دوسرا آپشن بتا کر بڑا انس کی کمرے سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

ابھی کل سے میں ڈرتی تھی مگر نہیں میری کون

سنتا تھا اب خود ہی بھگتو۔"

"کچھ نہیں ہوتا اماں! ان گیدڑ بھبکیوں سے۔ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں ہیں۔" وہ چارپائی پر پاؤں رکھ کر بوٹ کے تسمے باندھتے ہوئے بولا تھا۔

"مگر تو کیوں اس کے چکر میں پڑتا ہے۔ آج اس کے باپ کے ساتھ ہاتھا پائی ہو گئی تیری۔ کل کلاں کو کچھ ہوا تو تجھ ہی کو گھسیٹیں گے وہ۔" نہیں اس پر بے طرح کر غصہ آیا تھا۔

"انزل! اندر آ جا!" باہر ان کا شور نانا سن چکے تھے۔

"جی نانا۔ کیسے زمینوں پر جا رہا تھا کوئی کام ہے کیا؟" وہ چارپائی سے اجرک اٹھا کر کندھے پر ڈالتا ہوا کمرے میں آیا۔

"ہاں مجھے تجھ سے بات کرنی ہے۔" وہ تکیے کے سہارے اٹھ بیٹھے۔

"جی۔ حکم کیجیے۔" وہ بڑی فرماں برداری سے ان کے پلنگ کی پائنتی پر آ بیٹھا۔

"انزل! دو بچیوں کی زندگی میرے سامنے ہے میں نہیں چاہتا کہ پرو بھی کیا ان جیسی زندگی گزارے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں نانا! مگر وہ اس کا باپ ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں بھلا۔ ہاں اگر پرو خود ان سے بات کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو تو۔"

"دیکھ انزل! اس کی بات وہاں سنی نہیں جائے گی پھر شاہ میر کو تو نے دیکھا ہے۔ اس کے پاس نہ علم ہے نہ ہی ہنر اور ماحول کیسا ہے ان لوگوں کا۔ پرو اس جگہ کیسے خوش رہے گی بھلا۔ سنبھا کا دکھ ہی میرے لیے پہاڑ ہے جو ابھی تک سینے سے ہٹا نہیں پھر اپنی جیتی میں ایسے لوگوں کو کیسے اس کی بچی کو جانے دوں؟"

"پھر ہم کیا کر سکتے ہیں نانا؟" اسے فی الحال کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔

"شاہ میر اور اس کے باپ سے میں بات کرتا ہوں کہ وہ اس رشتے سے ہاتھ اٹھا لیں۔"

"اور وہ آپ کی بات مان جائیں گے؟" اس کے پلے یہ تجویز نہ پڑی تھی۔

"دیکھو محمود نے اپنے بھتیجے شاہ میر کو اس لیے سنگ

رشتہ) چاہا ہے کہ گھر کی بات گھر میں ہو گی تو وہ لوگ پرہ کے حصے کی زمین میں ملا لیں گے۔ شاہ میر کا سنا ہے کہ وہ کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر باپ کی بات مان کر پہلے چچا کے ہاں کرنا چاہتا ہے۔ پھر دوسری شادی اپنی مرضی سے کرے گا۔"

"وہ تو ہے مگر ہم کیا کہہ کر انہیں راضی کریں گے آخر؟"

"شاہ میر' اسحاق کی بیٹی فاطمہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میرے کہنے پر اسحاق یہ رشتہ دے دے گا۔"

"مگر اسحاق بھائی آپ کی بات کیوں مانیں گے پھر آپ پرہ کو تو بچا لیں گے مگر کسی اور کی بچی اس عذاب میں چلی جائے گی۔"

"اسحاق بھی اپنی لڑکی کے رشتے کے لیے پریشان ہے۔ اس کی بیٹی کے لیے شاہ میر کے علاوہ فی الحال کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہے۔ اور شاہ میر اپنے حصے کی زمین آباد کرتا ہے تو گزارا اچھا ہو سکتا ہے۔"

"لیکن پرہ کے لیے بھی کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہے۔ اگر شاہ میر سے گھر جاتا ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ اس کے باپ کی خوشی کی بات ہے اور پھر شاہ میر اتنا برا بھی نہیں ہے نا۔ اس میں کوئی ایسی بری عادت نہیں ہے۔ شریف بچہ ہے پھر ہم بلاوجہ کیوں اس کے باپ سے دشمنی مول لیں۔" ازل کے نزدیک آسان حل یہی تھا۔

"دیکھو ازل بچے! بات صرف شاہ میر کی نہیں۔ بات یہ بھی ہے کہ اب بچپن کے رشتوں کی یہ روایت ٹوٹنی چاہیے۔ بچوں کے لیے فیصلہ کرتے وقت ان کی خوشی بھی شامل ہونی چاہیے۔ شاہ میر پرہ کے لیے اچھا ہو سکتا تھا مگر اس صورت حال میں ہرگز نہیں۔ سو وہ دوسری شادی ضرور کرے گا پھر میری بچی کی اس گھر میں کوئی حیثیت نہ ہو گی اور پرہ کی سوچ ان کے گھر کے ماحول سے میچ نہیں کرتی۔ عمر بھر میری بچی نے محرومیاں دیکھی ہیں۔ اب میں اسے قربان نہیں کر سکتا۔ میری بچی مجھے معاف نہیں کرے گی جو کچھ سنبھالنے سہا ہیں پرہ کو اس سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"پرہ کے لیے کوئی اور آپشن ہے آپ کے پاس؟" وہ کچھ ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

"فی الحال نہیں۔ مگر میں انتظار کروں گا جو پرہ کے لیے مناسب ہو گا۔ مجھے یقین ہے میرا خدا اسے بھیجے گا۔"

وہ حیرت اور خوشی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"فاطمہ مجھے بھائیوں کی طرح سمجھتی ہے میں پہلے اس سے بات کروں گا اگر وہ خوش ہے تو چچا اسحاق سے ہم بات کر لیں گے۔" وہ انہیں امید دلا کر اٹھا اور باہر نکل آیا۔

"میری شادی میں اس زبان دراز لڑکی سے ہرگز نہیں کروں گی۔ سن لے تو۔" وہ جو کھڑکی سے ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔ اس کے باہر نکلتے ہی بول پڑیں۔

"آہستہ اماں۔ وہ بےچاری سن لے گی۔ کیا سوچے گی۔ آپ سوچتی ہیں نہ سمجھتی ہیں جو منہ میں آئے بول دیتی ہیں۔"

"ہماری کیا ہوئی ہے تجھے تیری شادی صرف آمنہ سے ہو گی اپنے تایا کی بیٹی سے۔ تیرا باپ اپنی خیالی دنیا میں ہی رہتے کہہ گیا تھا تو بچ اور مت سوچنا۔"

"جانتا ہوں۔" وہ اتنا کہتے ہوئے بغیر کسی بھی بحث کے وہاں سے چل دیا۔

پرہ اپنی ماں کے کمرے میں تھی جو صحن کے کونے پر بنا ہوا تھا۔ اسی لیے اسے اطمینان تھا۔ اس نے یہ ساری گفتگو نہیں سنی ہو گی۔

آج بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے بار بار سوچا تھا کہ جو بات اس کی ماں نے خدشے کے طور پر کہی ہے۔ اس کا کوئی وجود ہے؟

کیا واقعی اسے پرہ سے ہمدردی ہی ہے۔ یا پھر کوئی اور احساس بھی جگہ رکھتا ہے؟

ابھی تک اسے خود سے سوائے الجھن کے کوئی جواب نہ ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے اس سے بات کرنے کی کوشش تو کی ہو گی کہ بات کہاں تک پہنچی؟"

"سر! وہ بات کو گھما پھرا کر اور طرف لے جاتی ہے۔" وہ ان کو اپنی الجھن بتانے لگا۔

"تو تم بھی بات کو گھما پھرا کر اپنی طرف لے آیا کرو۔" ان کے پاس تو ہر مسئلے کا جیسے حل تھا۔

"مجھے یہ فن نہیں آتا۔" اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ تھی اپنے لیے۔

"تو بات کو الجھاؤ مت۔ سیدھی طرح کہہ دو۔ سچائی سادہ لفظوں کو بھی پراثر بنا دیتی ہے۔"

"آپ اس سے بات کریں سر! میں نہیں کر پاتا ہار جاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

"میں تمہیں ہارنے نہیں دوں گا۔" انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں اس بار خود کو ہارنے نہیں دوں گا۔" وہ واقعی خود سے مخاطب تھے۔ بہت عرصے بعد وہ خود سے ملے تھے اور اب خود کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ بہت عرصے بعد کسی کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا تھا۔ انہیں لگا عشق کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا ہوا ان کا عکس ان کی تلاش میں ان سے آملا ہے۔

پہلی ان کی آنکھوں میں محبت کا عکس دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنے گم سم تھے۔ ان کی آنکھوں میں کمال کی روشنی تھی۔ اندر گویا وحشت ساری روشنی تھی۔ عشق کی گلیاں اندھیری نہیں ہوتیں۔ سانس میں روشنی ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"سر عارفین تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" وہ اندر آکر اسے سامان پیک کرتے ہوئے دیکھ کر بولی۔

"کیوں' انہیں مجھ سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔" اس کی تقریباً پیکنگ مکمل ہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کس لیے اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

"خود جا کر پوچھ لو۔ کسی کے ہاتھ میسج نہ ہوتا تو خود کیوں آتے چل کر۔"

"حرا! تم ان سے کہو کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ سوری ہوں' پلیز منع کر دو۔"

"میں انہیں بتا کر آئی ہوں کہ تم سامان پیک کر رہی ہو اپنا۔ اب جاؤ وہ بہت دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔"

"مگر میں ان سے ملنا نہیں چاہتی۔" وہ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے جھنجلائی۔

"تو جا کر کہہ دو تمہیں ملنا چاہتی میں' میں نہیں جا رہی جھوٹ بولنے کے لیے۔"

"تم میرا اتنا سا کام نہیں کر سکتیں؟"

"تم اپنے آپ سے بھاگ سکتی ہو۔ پوری دنیا سے نہیں۔ تم میں اتنی ہمت نہیں کہ تم دنیا کا سامنا کر سکو اور باتیں ایسی کرتی ہو جیسے۔۔۔" وہ جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

وہ بیگ نیچے پھینک کر جھنجلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔ حالانکہ اس کا ذہن ایک نئی بحث میں پڑنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔

"جی سر!" وہ بادل ناخواستہ وہاں بیٹھ گئی۔

"آپ جا رہے ہو کچھ دنوں میں پاس آؤٹ کر کے۔ میں بہت مس کروں گا آپ سب کو۔" وہ اس کی بیزاری دیکھتے مسکراتے ہوئے بولے۔

"او کے سر۔" وہ کہنا چاہتی تھی کہ "کیا صرف یہی کہنے آپ یہاں آئے ہیں۔" مگر چپ رہی۔ انہوں نے خود ہی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے۔

"پرہ۔۔۔! زندگی میں کچھ مواقع ایسے آتے ہیں جب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور سمت کا تعین ہم خود کرتے ہیں۔ اگر منزل کا انتخاب کرنے کا شعور اور حوصلہ ہم میں ہو تو زندگی سنور جاتی ہے۔ ورنہ زندگی کبھی بھی دوسرا موقع نہیں دیتی اور ہم زندگی کے مشکل راستوں کو طے کرنے کے لیے تنہا رہ جاتے ہیں۔"

"آپ یہ سب میرے مستقبل کی پیش گوئی کے طور پر کہہ رہے ہیں؟"

"نہیں' اپنی زندگی کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور اپنے ساتھ زیادتی کرے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئے۔

"تو وہ شخص آپ تھے منیجا کی زندگی تباہ کرنے والے؟" اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔

"میری زندگی کون سا آباد ہو گئی پرہ!" ان کے اندر کہرا ملال جاگا۔

"کس نے حق دیا تھا آپ کو محبت کے نام پر انہیں برباد کرنے کا؟"

"بربادی تو میرے حصے میں آئی تھی پرہ! میں تو اس کے کہنے پر اسے چھوڑ آیا تھا۔"

"جھوٹ مت بولیں۔ ان لوگوں کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر گئے تھے آپ۔ حالات سے لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا آپ میں تو پھر کیوں اپنی محبت کو ان کے قدموں کی زنجیر بنا دیا۔ کیا ملا اس سے۔ صرف ذلت رسوائی' بے عزتی' دھتکار ہی ان کے نصیب میں آئی۔"

"میں اسے ذلت' رسوائی' اور بے عزتی سے ہی تو بچانا چاہتا تھا۔ جب ہی ہتھیار پھینک کر چلا آیا۔ اسے گلی کوچوں میں بدنام کرنا مقصود ہوتا تو لے آتا اسے اپنے ساتھ۔"

"بزدل تھے آپ۔ ہمت نہیں تھی آپ میں ان لوگوں سے لڑنے کی۔" ان کی کوئی بھی وضاحت اسے قبول نہیں تھی۔

"ان لوگوں سے لڑتا جن کا نمک کھایا تھا۔ سروان صاحب نے مجھے لیا کی موت کے بعد سہارا دیا۔ اپنے گھر میں رکھا' مجھے پڑھایا۔ کیا ان سے لڑنے اٹھ کھڑا ہوتا۔ میرے ہاتھ نہ کٹ جاتے اگر ان کی طرف اٹھتے۔ میری زبان نہ کٹ جاتی اگر ان کے سامنے کھلتی۔ میں ان کے آگے سینہ تان کر کیسے کھڑا ہوتا۔ میں بے غیرت تو نہیں تھا۔ ہم جیسے لوگ کسی کا ایک معمولی سا احسان بھی عمر بھر کے لیے نہیں بھولتے۔ اور وہ تو میرے محسن تھے۔ انہوں نے مجھے وہاں سے جانے کا حکم دیا تو میں چلا آیا۔ میں کیسے سر اٹھا کر ان سے بات کرتا۔ روایت میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی' میرے لیے اہمیت تھی' تو سروان بابا کی تھی۔"

"اگر اتنا ہی پاس تھا ان کا تو وہ آنکھیں اس طرف کیسے اٹھیں؟"

"یہ آنکھیں اس طرف کبھی نہ اٹھیں پرہ۔ وہ تو میرے لیے مقدس تھی۔ ان آنکھوں نے ان قدموں کو ہی دیکھا اور اپنا دل انہیں قدموں پر وار دیا۔ محبت یک طرفہ نہیں تھی' عشق کبھی ایک دل کو اسیر نہیں کرتا۔ ہمارے درمیان کوئی اظہار نہ ہوا تھا۔ مگر لوگ شاید نگاہوں کے زاویے سمجھ جاتے ہیں۔ راہ پہلے ہی سے کھوٹی کر دی گئی۔"

"راہ کھوٹی کرنے والا کون تھا؟" اس کی سوچ کا رخ بدلا تھا۔

"سروان بابا کو اطلاع دی گئی کہ ہم ان کی عزت پر داغ لگا رہے ہیں۔ انہوں نے بلا لیا۔ ہم کیا کہتے۔ محبت اور دل کے احساس کی حد تک تو مجرم تھے۔ سو چپ رہے اور پھر کہیں اور سے بھی کوچ کرنے کا حکم آیا تو جو سر جھکا تھا' وہ مزید جھک گیا۔ وہ تو محبت کو سات پردوں میں چھپا کر رکھنے کی قائل تھی۔" اس نے کہا۔ "تم جانتے ہو لوگ مجھ پر باتیں کریں۔ پیچھے کہا سنتے ہیں۔ جب تک گاؤں کی عورتوں کو دین اور دنیا کی تعلیم کے لیے تیار کر رہی ہوں۔ جب میں ان کے اندر شعور کی شمع جلانا چاہتی ہوں تو لوگ آندھی کا سا کام کرتے ہیں۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ میرے بابا مجھ سے متنفر ہو جائیں۔ میں آزادی اظہار کو غلط معنی پہنانا نہیں چاہتی۔ میں اپنے لیے لڑنا نہیں چاہتی۔ ابھی مجھے بہت چیزوں کے لیے لڑنا ہے۔ میں نے اگر خود کو محبت تک محدود کر دیا تو میرے ارادے راہ میں ہی رک جائیں گے۔ مجھے راہ جانے دو' ابھی مجھے کچھ بہتر کرنا ہے۔"

اسے بہت کچھ کرنا تھا اور میں اس کے حکم پر سر جھکا کر اس کی راہ سے دشواریوں کی طرح ہٹ گیا۔ کیا میرا نقصان نہ ہوا تھا؟ میں نے تو ایک جہان کھو دیا تھا' منیجا تو زندگی تھی۔ اس کے بعد تو بس زندگی مجھے اپنے اشاروں پر نچاتی رہی ہے۔"

یہ شکوہ نجانے زندگی سے تھا یا پھر خود سے۔ مگر وہ ہر حالت میں جیسے ہارے ہوئے تھے۔

"مگر منیجا تو کچھ بھی نہ کر پائی نہ اپنے لیے نہ دوسروں کے لیے۔" منیجا نے زمین سے محبت کی' زمین کے باسیوں سے' جانوروں' درختوں' فصلوں سے محبت کی۔ مگر انہیں کچھ نہ ملا۔ ہاں وہ ختم ہو گئیں مگر آپ زندہ ہیں۔ آپ نے شادی کی۔ اپنی زندگی جی لی۔ آزاد فضا میں رہے کیا پریشانی تھی آپ کو؟ دکھ کا بوجھ تو انہوں نے اپنے کندھوں سے سرکنے ہی نہ دیا تھا۔"

"کاش کہ میں اس آزاد فضا میں خوش رہ پاتا۔ کاش! میں اسے بھلا پاتا۔"

وہ بیچے تھکے ہوئے اٹھے تھے۔ وہ یہاں کیوں آئے تھے انہیں کچھ یاد نہ رہا تھا۔ وہ یہاں کیوں آئے تھے؟ شاید دل کے تمام زخم تازہ کرنے کے لیے ان کے رنجیدہ دل سے آواز آئی تھی۔

پرہ نے ضروری سامان باندھ لیا۔ دو دن میں یہاں سے واپسی تھی۔ وہ ضروری چیزوں کی طرح اپنا دل بھی ڈھونڈتی رہی کہ کمرے کے کسی کونے میں پڑا ہے۔ مگر وہ بھول گئی۔ اس کا دل کمرے کے کونے میں نہیں ان گلیوں میں تھا۔

☆ ☆ ☆

آج سب ساتھ تھے۔ الوداعی پارٹی ارینج کی گئی تھی۔ آج لڑکوں نے سندھی لوک گیتوں پر رقص کیا تھا' لڑکیوں نے گیت گائے۔ محفل بھی ہوئی' سب اپنے اپنے طور پر کچھ لکھ کر لائے لطیفے' شعر کوئی اور خاکے پڑھے گئے۔ محفل کے اختتام پر وہ تمام گروپوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ وہ بابر' آچر اور حفیظ ساتھ تھے۔

پرہ' حرا اور ماریہ بھی ساتھ کھڑی تھیں اور گپ شپ ہو رہی تھی۔

"پرہ! تم گاؤں جا کر کیا کرو گی؟ مستقل طور پر یہیں سیٹ ہو جاؤ نا۔"

"وہیں تو میری ضرورت ہے۔ مجھے اپنی ماں کے سارے خواب پورے کرنا ہیں۔ تمہیں پتہ ہے میرے کمرے کی کھڑکی جس طرف کھلتی ہے۔ سامنے سے فصلوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ صبح صبح اٹھ کر جب تک کھڑکی سے باہر کا نظارہ نہ ہو تو لگتا ہی نہیں کہ میری صبح ہوئی ہے۔ تم لوگ آنا میرے گاؤں۔ میں تمہیں پورا گاؤں گھماؤں گی۔"

"ہمیں انوائٹ نہیں کرو گی پرہ؟" بابر نے شکوہ کیا تھا۔

"ہاں تم بھی آنا۔ میں اپنے کزن سے ملواؤں گی تمہیں۔ بہت اچھا ہے۔ تم لوگوں کو خوب گھمائے گا۔ بہت انجوائے کرو گے تم۔"

"سوچ لیں پرہ! ہم آئیں گے تو خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے' آپ کی چوکھٹ پر سوالی بن کر بیٹھ جائیں گے۔" اس بار حفیظ بیچ میں ٹپک پڑا۔

"سمجھ گئی تھی وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔"

"ہم بھی خالی ہاتھ نہیں بھیجیں گے۔ دعا دے کر روانہ کریں گے۔" وہ مسکراہٹ دبا کر اسے اسی کے انداز میں لاجواب کر گئی۔

"مگر ہمیں دعا کے ساتھ ساتھ دوا بھی چاہیے۔" اس نے پھول کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"دوا کی ضرورت ہے تو ڈاکٹر سے رجوع کریں۔" اس بار حرا نے جواب دیا تھا۔

"جو دوا ہمیں چاہیے وہ ڈاکٹر حکیموں کے پاس نہیں ہوتی۔"

"ہم آپ کو زہر دے دیں گے تاکہ قصہ ہی ختم ہو۔"

"وہ بھی قبول ہے بشرطیکہ آپ زہر کا پیالہ ساتھ بھیجیں۔" بابر نے کہتے ہوئے حرا کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی تو ان کا مشترکہ قہقہہ گونج اٹھا۔

کچھ دیر بعد جب آچر اور حفیظ کسی اور طرف متوجہ ہوئے تو وہ پرہ کو اکیلا پا کر سوئمنگ پول کے پاس بیٹھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟ ویسے آپ بولتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں۔" اس نے پانی میں کنکر پھینکا تو بھنور پیدا

ہوا۔

"بولنے سے کچھ نہیں ملتا انقلاب کوششوں سے آتا ہے۔"

"کس قسم کے انقلاب کی بات کر رہی ہو؟"

"شعور کا، خوشحالی کا، جنگ کے بعد امن کا، اسلام کا قانون کا، سچائی کے نفاذ کا۔"

"اور محبت کا؟" وہ ان سب چیزوں میں گنجائش نکال کر محبت کو لے آیا تھا۔

"عشق کا انجام قبر ہے کچھ نہیں ملتا محبت سے۔ نہ حقیقت میں اور نہ ہی کہانیوں میں۔" وہ نجانے کیوں اچانک ہی تلخ سی ہو گئی تھی۔

"یہ دنیا محبت کے دم سے ہی قائم ہے۔ ہم نجانے کیوں اپنی غلطیوں اور بربادیوں کا سبب محبت کو ٹھہراتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں پرو؟"

"تجربات ہمیں بدل دیتے ہیں ہنھل!" وہ بھی جیسے ہاری ہوئی تھی۔

"ہم نیا تجربہ کیوں نہیں کرتے؟"

"اس قدر حوصلہ کہاں سے لاؤں؟"

"ابھی سے ہار رہی ہو پھر سنجھا کے خواب کیسے پورے کرو گی؟"

"تم سنجھا کو کتنا جانتے ہو؟"

"میں سنجھا کے ہانجھی کو جانتا ہوں۔"

"میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔" اس نے دو ٹوک کہہ دیا۔

"تم غلط کرتی ہو پرو! ہانجھی تو بہت معصوم ہے۔"

"معصوم تو ہنھل بھی بن رہا ہے، سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔" وہ ان بھی۔

"ہنھل صرف پرو کو چاہتا ہے۔" وہ یقین دلانے لگا۔

"تم جیسے لوگ صرف باتیں کرنا جانتے ہیں۔ وقت آنے پر دامن بچا جاتے ہیں، ہانجھی کی طرح۔"

"تم ہانجھی کو جانتی ہو پرو! وہ کون ہے؟"

"میں تو تمہیں بھی جانتی ہوں ہنھل! کہ تم کون ہو۔" وہ اتنا کہہ کر رکی نہ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید بات کرتا اور اسے رکنا پڑتا۔ اس لیے سامنے سے آتی حرا کو دیکھ کر اس کی طرف چلی گئی۔ انہیں ہاسٹل جلدی پہنچنا تھا۔ اسے سامان پیک کرنا تھا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اس بار پرو نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ اپنے طور پر وہ اختتام کر کے گئی تھی۔

مگر وہ خود کو انقلاب کے لیے تیار کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم اس سے ملے بغیر اپنے گاؤں نہیں جا سکتے۔" ان کی آواز میں رعب تھا۔

"وہ مجھ سے ملے بغیر جا چکی ہے سر!" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"تم اس کے قدم گنتے اس کے پیچھے جاؤ ہنھل! میں نہیں چاہتا تم آرام سے ارمان لو۔ تمہیں پتہ ہے، تمہیں پتہ ہے جدائی کیا ہوتی ہے؟ موت ہوتی ہے جدائی..."

"اور میں مر چکا ہوں..." وہ چلا اٹھا۔

"مگر میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ تمہیں جانا ہو گا وہاں پر جانا ہو گا۔ لڑنا ہو گا اپنے حق کے لیے۔ میں تمہارے چہرے پر جیت کی خوشی دیکھنا چاہتا ہوں ہنھل! میں تمہیں اور اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ جاؤ ہنھل! اپنے لیے رستہ بناؤ، نجاؤ۔" وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔

وہ اپنے آپ کو چھڑا کر ان کے گھر سے نکل آیا۔ بجلی نہیں تھی۔ باہر اندھیرا تھا۔ اس نے اپنی آستین سے گیلی آنکھیں صاف کیں اور چاند کی روشنی میں قدم آگے بڑھا دیے "آگے پتھر تھے۔ مگر اس نے ہاتھ زخمی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

برآمدے میں لٹکی ہوئی لالٹین کی ٹمٹماتی لو کی جلتی بجھتی روشنی لکیر کی صورت اس کے کمرے میں کھلی کھڑکی سے آ رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے گرد اپنے بازو لپیٹے کسی گہری سوچ میں گم تھی کہ اچانک وہ اں

کھلنے کی آواز سے ہڑبڑا اٹھی۔

"تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔ اپنا نام بہلول بتاتا ہے۔"

"مجھے کسی سے نہیں ملنا۔" اس کے اندر گہرے سناٹے میں کسی نے پتھر پھینکا تھا۔ "اس سے کہیں کہ یہاں سے چلا جائے۔"

"تم اپنے ساتھ اس طرح کیوں کر رہی ہو پرو؟ پہلے تم نے مجھ سے کہا۔ آمنہ اچھی ہے اس سے شادی کر لو۔ میں نے کر لی۔ مگر میں خوش ہوں اور پُرسکون بھی، شاید میرے حصے کی محبت آمنہ کے پاس تھی۔ اب میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم خوش رہو اور پُرسکون بھی۔"

"میں خوش ہوں اور پُرسکون بھی۔ مجھے کچھ مل گیا ہے اور کچھ مل جائے گا۔"

"وہ بہت اچھا ہے پرو اسے خالی ہاتھ مت لوٹاؤ۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر اسے سمجھانے لگا۔

"میں اپنے نانا کے گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ کہیں بھی نہیں۔ اس گاؤں کو میری ضرورت ہے۔"

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ میں بات کر چکا ہوں اس سے۔"

"کیا بات کر چکے ہو تم اس سے؟"

"میں اسے تمہارے لیے زبان دے چکا ہوں۔"

"تمہیں کیا حق تھا اس طرح کرنے کا، مجھ سے پوچھے بغیر ہی۔" وہ چلائی۔

"یہ حق مجھے نانا دے کر گئے تھے اور تم اب کچھ دنوں کے لیے گھر سے باہر نکلنا بند کرو۔ بیٹھ کر اپنی شادی کی تیاریاں کرو۔ کیوں آمنہ! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا!" وہ اندر آتی آمنہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"بالکل ٹھیک۔ اور کام تو زندگی بھر چلتے رہیں گے۔"

"تم لوگوں کو کس طرح فیس کرو گے ازل؟ کیا بتاؤ گے انہیں اور لوگ کیا کہیں گے میرے بارے میں۔ کیسی باتیں کریں گے؟" اسے کچھ پریشانی تھی۔

"لوگوں کی پروا کب سے ... تمہیں

بھی؟" وہ ہنس دی۔

"میں اپنے نانا کا بھروسہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ آج زندہ ہوتے تو کیا سوچتے کہ میرے لیے انہوں نے اتنا کچھ کیا اور میں نے ان کی غیرت کا بھی نہ سوچا اپنے لیے باہر کہیں پسند کر لیا۔"

"یہ تمہارا حق ہے پرو! جس کی ہمارا مذہب اجازت دیتا ہے اور اب تم خود بھی اگر ایسی باتیں کرنے لگی ہو تو دوسروں کا تو کوئی افسوس نہیں۔"

"ازل! میں یہاں کے لوگوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ اگر آپ عورت کو اس کے حقوق دو تو اس کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں کہ وہ آپ کی مرضی یا خواہش سے ٹکرائے بس سب کچھ جائز ہونا چاہیے۔ اگر سب کی خوشی ایک چیز میں ہو تو بہتر ہے۔ دیکھو میری ماں نے بھی بغاوت نہ کی۔ میں کیسے کر سکتی ہوں۔"

"تم نے کوئی بغاوت نہیں کی ہے مگر وہ جو تمہارے لیے بہتر ہے اسے ہم کیوں نہ تمہارے لیے منتخب کریں اور پھر ہم سب خوش ہیں پرو! اب پچھلے بار طریقے سے ہی ہو گا۔ وہ نکاح کرنا چاہتا ہے۔ یہ فیروز نہیں! نانا اور پھر نانا کو بھی خوشی ملے گی۔ وہ تو تمہاری خوشی میں خوش تھے۔ چلو میں اب اسے ڈیٹ فائنل کر دوں۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہے اگر تم اس بار نہیں ملنا چاہتیں تو خیر ہے۔"

وہ مسکراتا ہوا وہاں سے اٹھا۔ اس نے ایک پل کو اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کتنا خوش تھا اس کی خوشی میں۔ کتنا اچھا دوست تھا وہ اس کا۔ کتنا سمجھتا تھا اسے۔ اس کے دل سے ازل کے لیے بہت ساری دعائیں ہی نکلتی رہیں۔ اسے اپنی دعاؤں پر یقین تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے عارفین!" اس نے ان کے بکھرے بال اور حلیہ دیکھا تو رحم سا آیا تھا۔ "عمر سے زیادہ بوڑھے لگ رہے ہو۔" وہ خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

"میں نے سوچا تھا میں تمہیں خوش رکھوں گی مگر میں ایسا نہ کر سکی۔"

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا پھر بھی تم نے مجھ سے اتنی امیدیں رکھیں۔" سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا گیا۔

"تو پھر میں کس سے امید رکھتی عارفین؟ مگر میں ہمیشہ تمہیں ہراتی رہی، کبھی تمہیں جیتنے کی کوشش نہ کی۔"

"اب کیا کرنے آئی ہو؟ مجھے ہرانے یا جیتنے؟"

"ہارنے آئی ہوں۔ اتنی کوشش ضرور کروں گی کہ سنیہا کے ماضی کو بھول کر اپنے عارفین کو خوش رکھوں۔"

"سنیہا کا ماضی تو کب کا مر چکا ہے اور عارفین مرنے کے لیے تیار۔"

"زندگی اتنی بری بھی نہیں ہوتی عارفین! اچھا ہم اسے سنوار سکتے ہیں۔"

"اب یہ نہیں ہو سکتا۔ زندگی گزر چکی ہے۔"

"زندگی باقی ہے عارفین! اچھی بھی سہی۔ مگر ہے تو سہی نا جینے کے لیے۔"

"ہم کیا کریں گے ان لمحوں کو؟" ان کا لہجہ ابھی تک خشک تھا۔

"مسکرانے کی کوشش کریں گے۔" وہ مسکرائی بھی۔

"کبھی مسکراہٹ بانٹنے کی بھی کوشش کیا کرو۔"

"مجھے مسکراہٹ بانٹنا سکھاؤ۔"

"میرے ساتھ میرے دیس چلو، میرے گاؤں، جہاں مٹی کی خوشبو مجھے بلاتی ہے۔ میں اپنی باقی زندگی وہاں گزارنا چاہتا ہوں۔ کھیتوں، درختوں، نہروں، پہاڑوں، ٹیلوں کے درمیان۔ میں خوش رہنا چاہتا ہوں بس۔ اگر تم چلو تو ورنہ میں یہاں اب نہیں رک سکتا۔"

"تمہارا گاؤں کوئی خوب صورت جزیرہ ہے؟" اس نے رازداری کے سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ تم سے بھی زیادہ۔" انہوں نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"پھر تو نہیں تم وہاں جا کر مجھے گھاس ہی نہیں ڈالو گے۔" اس نے منہ بنایا۔

"ہو سکتا ہے تمہیں ان گلیوں سے پرانا عارفین مل جائے۔"

"وہ ابھی تک وہاں ہے؟"

"نہیں۔ اس کا دل ان گلیوں میں ہے۔ سنجھا کے پاس۔"

"تم سنجھا کو بھول نہیں سکتے؟"

"تم سنجھا سے کیوں جلتی ہو؟ عارفین تو تمہارے پاس ہے نا!"

"مگر اس کا دل تو نہیں نا!"

"وہ ڈھونڈ لانا تمہارا کام ہے۔" انہوں نے دوسرا سگریٹ جلایا تھا۔

"اور دل جلانا جیسے تمہارا کام ہے۔ چھوڑو یہ سگریٹ منع کیا ہے ڈاکٹر نے پھر بھی سگریٹ پیتے ہو اتنے۔" اس نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے ان کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لیا۔

"پروفیسر سگریٹ نہیں چھوڑ سکتا۔" انہوں نے واپس لینا چاہا۔

"عارفین تو سگریٹ چھوڑ سکتا ہے نا۔۔۔ جب چاہے پروفیسر بن جاؤ کبھی عارفین تو کبھی کچھ اور۔ کتنے روپ اوڑھ رکھے ہیں تم نے۔ مجھ سے اب یہ سب برداشت نہیں ہو گا۔ بدلوائیے آپ کو۔"

"تم پھر اصلیت پر آ گئیں۔" وہ اسے آنکھیں دکھانے لگے۔

"تم اسی طرح سیدھے ہوتے ہو۔۔۔" وہ ڈپٹنے لگی بچوں کی طرح۔

"میں سیدھا ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ بابا!" وہ ہنستے ہوئے اس سے سگریٹ چھین کر باہر نکل آئے۔

"میں تمہیں سیدھا کر کے ہی دم لوں گی بڑے میاں!" وہ ان کے پیچھے لپکی۔ "دل جوان ہے۔"

"مگر گٹ نہیں گئے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئی۔ کل کے سفر کی تیاری باقی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں پتہ ہے میں تم لوگوں سے بہت جلتا ہوں۔۔۔ پوچھو کیوں؟"

"بتایئے کیوں؟" وہ سموسوں سے انصاف کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے حسد ہوتا ہے، تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہو تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ میں کل بلاوجہ ہی حمیرا کی طرف دیکھنے لگا اور سوچا کہ کسی کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا کر وہ بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی۔"

"تو اچھا ہے نا بھی تو ان کو بھی خوش کر لیا کریں نا!"

"مجھے کون سا کسی نے خوش کیا ہے کہ میں اسے خوش کروں۔ سنجھا تو میری طرف دیکھتی ہی نہ تھی۔" بے ساختہ ہی وہ نام ان کے منہ سے پھسل گیا۔

"ابھی تک وہ نہیں بھولیں آپ کو؟" اسے دکھ سا ہونے لگا۔

"وہ جادوگرنی ہے بھئی! اس کا سحر ہستی کے کونے کونے میں ہے۔ کھیتوں میں۔۔۔ درختوں کے نیچے شاخوں پر ہر جگہ اس کی یاد ہے۔ یہاں بھی، ابھی بھی وہ سجا کرتی تھی۔" ان کی نگاہیں بھی چند لمحوں پر تھیں۔

"اب یہاں حمیرا اور عارفین پھرا کرتے ہیں۔" ہمس نے ان کا موڈ بدلنا چاہا۔

"اور پروفیسر؟ پروفیسر کہاں گیا؟" وہ خود ہی سوچنے لگے۔

"ہو گا سندھ یونیورسٹی کے کسی کلاس میں فلسفے پر سوچتا۔ تھوڑی اور سر کھجاتا۔"

"ہاں یار۔۔۔ پروفیسر کو تو وہیں چھوڑ آیا ہوں جیسے۔۔۔!"

"میں بتاؤں آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ آپ کے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ جو چیز آپ کے پاس ہوتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔ ماضی میں رہتے ہیں۔ اگر پروفیسر وہاں ہوتا تو یہاں کھیتوں، مٹیلوں اور گاجروں میں اس کا دل اٹکا ہوتا۔"

"مولی گاجر؟ پروفیسر کا عشق کھانے کی چیزوں تک محدود نہیں۔۔۔ پروفیسر کا دل تو فلسفے میں اٹکا ہوا ہے۔ البتہ عارفین کا دل یہاں ہے۔۔۔ یہیں کہیں۔" ملحد نگاہ ہری بھری تھی۔ وہ لہلہاتے پودوں کو آنکھوں سے ٹٹولتے ہوئے دل ڈھونڈنے لگے۔

"اب آپ دونوں یہیں بیٹھے ہیں ابھی تک۔ اور ہم نے اسکول کی عمارت کے لیے زمین بھی دیکھ لی۔ اور یہی نہیں بلکہ میڈم حمیرا نے بچیوں کے لیے سلائی سینٹر اور کڑھائی وغیرہ کے لیے بھی حیدر آباد میں ایک اچھے بوتیک کے ساتھ کانٹریکٹ کر لیا ہے کہ یہاں سے رلیاں، دوپٹے، چادریں اور جوڑے وغیرہ جو گاؤں کی عورتیں بناتی ہیں۔ ان کے لیے مخصوص جگہ بھی بنائی ہے جہاں ابھی عمارت کا کچھ حصہ تیار کرانا ہے وہ یہاں آ کر رہ جائیں گی اور میڈم کی کوئی سکھی ہیں۔ وہ ان کی چیزیں وہاں تک پہنچا دیں گی۔ یوں اس طرح یہاں کی عورت کو اپنا جائز معاوضہ بھی مل جائے گا اور پھر فیصل کا اس طرف اسکول نہیں تھا۔ وہیں نے اسی جگہ سے نزدیک کرکٹ گراؤنڈ والی وہ جگہ دیکھ لی ہے جہاں بچے کرکٹ کھیلتے ہیں۔"

وہ بہت خوش تھی۔ وہ اسے اس طرح خوش ہوتا دیکھتے ہوئے مسکرا دیے۔

وہ دونوں ان کے ساتھ چلتے ہوئے زمین دیکھنے کے لیے کرکٹ کے میدان تک گئے۔ بعد میں فصلوں کی کٹائی ہوتی دیکھ کر وہ لوگ گنا چھیلتے اور کھاتے زمینوں کی سیر کرتے گھر کی طرف لوٹے تھے۔

کرم پور میں آج شام بہت سہانی تھی۔

اس نے اپنا کھویا ہوا دل پا لیا تھا۔ بھولا خواب تھا جو حقیقت کا روپ دھار کر اس کی زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے آ گیا تھا۔ وہ دونوں مل کر خوشحالی کے خواب دیکھتے تھے اور ان کے ساتھ محبت تھی اور یقین بھی۔

اس نے نہر کنارے ٹہلتے ہوئے ادھوری نظم آج مکمل کی۔ نہر کنارے ٹہلتے ہوئے وہ عکس پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

آ دور تلک اک ساتھ چلیں
جب تک یہ کشتی چلتی ہے
جب تک رستے لے جائیں ہمیں
جب تک راہیں ہموار ملیں
ہم دور تلک اک ساتھ چلیں
یہ راہیں تو کچھ دور سے
پھر نئے مسافر لائیں گی
اور ان کے دل بہلائیں گی
اے دوست مگر ہم تنہا تھے
کیا تنہا ہی رہ جائیں گے؟
ہاں یاد مگر آئے گی
تیرے ساتھ کہیں لے جائے گی
ان سندر سپنے رنگوں میں
ان کچے پکے رستوں پہ
جہاں خواب سنوارا کرتے تھے
ان کچے پکے رستوں پر
اب تیری یادیں رہتی ہیں
ان یادوں کی انگلی پکڑے
ہم عہد نکھارا کرتے ہیں
تیرے خواب سنوارا کرتے ہیں

جام جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

انسان مختلف ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی "مانگ" کو مد نظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" "ہر برتن" کے بدن پر رتبوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "منصب" اس کی قیمت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کر پاتے اور تڑخ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہی "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔

یہی میرے ناول کی تفہیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں۔ میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے کی طلب گار ہوں۔ آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔

یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

بشریٰ سعید

سفال گر

کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلمان ہونے کے باوجود احمد اسے شادی کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ احمد کو "ایشیائی" ہونے کی بنا پر طرح مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اسے ایک بار پھر ذلت آمیز نوکری کرنی پڑتی ہے۔ رائن کے گھر میں رہائش اس کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ایک حادثہ احمد کی ملاقات الپا سے کرواتا ہے۔ جو اس کے یک طرفہ عشق میں مبتلا ہے۔ ناپسندیدگی کے باوجود وہ الپا سے قطع تعلق نہیں کرتا۔ اسے الپا کی حرکتیں بعض مرتبہ مشکوک بھی لگتی ہیں۔ الپا احمد کی ایک نظر التفات کے لیے اپنی بھانجی صوفیہ کو گھر چھوڑ کر آتی ہے۔ ایک ہی کلاس فلم میں احمد کو ایک لائن کا کردار ملتا ہے تو وہ اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہے۔ وہ اس اطالوی جملے کی ریہرسل کے لیے پارک میں ہر لڑکی کو gloxinia کا پھول پیش کرتا ہے وہیں اس کی پریناں آزنگ سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کی خوب صورتی احمد کو متاثر کرتی ہے۔

رائن اپنے سامان سمیت بغیر بتائے اپارٹمنٹ سے غائب ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی احمد گرانٹ کی جمع کی گئی رقم بھی لے جاتا ہے۔ مالک مکان سے اسے پتا چلتا ہے کہ چھ مہینے سے اس نے کرایہ نہیں دیا۔ صورت حال اسے چکرا کر رکھ دیتی ہے۔ الپا اسے ایک غیر معروف میگزین کے فوٹو گرافر سے ملواتی ہے۔ جو اسے تھوڑا ماڈلنگ کی پیش کش کرتا ہے۔ وہ اس پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے الپا سے بھی شدید ناراض ہو جاتا ہے۔ لیکن پے در پے ناکامیوں اور بار بار نوکری ختم ہونے پر اسے نا چاہتے ہوئے بھی یہ پیش کش قبول کرنا پڑتی ہے۔ اسی دوران پریناں اس سے دوبارہ رابطہ کرتی ہے تو اس کے دل کی کلی کھل اٹھتی ہے۔ الپا کو کسی کا بھی گرانٹ کے قریب آنا پسند نہیں ہے۔ رائن اپنی گرل فرینڈ کی بے وفائی کے بعد دوبارہ اپارٹمنٹ لوٹ آتا ہے اور کہتا ہے کہ جلد ہی وہ سالومن موریل کی فلم میں ایکسٹرا کے کردار اسے اور الپا کو دلوا دے گا۔ فلم میں چھوٹا سا کردار ہی اسے بہت اہم محسوس ہوتا ہے۔ رائن سب کے سامنے یہ انکشاف کرتا ہے کہ الپا تیموز ملانی ہے جس پر اسے فلم سے نکال دیا جاتا ہے۔ موریل اپنی کاسٹ میں کسی بدنام اداکار کو رکھنا توہین سمجھتا ہے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی رائن کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے وہ کچھ مہینوں کے لیے اسپتال میں رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک چھوٹے سے واقعے سے احمد گرانٹ سالومن کی نظر میں آجاتا ہے اور اسے ایک ناول پر مبنی فلم میں اہم کردار مل جاتا ہے۔ احمد گرانٹ کو اپنی خوش بختی کا یقین نہیں آتا۔

پریناں اور احمد فوری طور پر شادی کر لیتے ہیں۔ پریناں اس وقت محبت کے علاوہ کچھ نہیں سوچنا چاہتی۔ اس کے لیے احمد کے ساتھ گزارے لمحات زندگی کا حاصل ہیں۔ وہ گرانٹ کو اپنا پاکستان کا مکمل پتہ اور فون نمبر دیتی ہے۔ پاکستان آکر اسے ابو کی خرابی صحت کا صحیح طور سے پتا چلتا ہے۔ وہ مرنے سے پہلے پریناں کو دلہن بنا دیکھنا چاہتے ہیں۔ پریناں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے اور وہ احمد گرانٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن ہر بار اسے ناکامی ہوتی ہے وہ آنسرنگ مشین پر اس کے نام پیغام بھی چھوڑتی ہے اور اسے رابطے کے لیے دو دن کی مہلت دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

٦
چھٹی قسط

✡ ✡ ✡

"ایڈم گرانٹ بول رہا ہوں۔"

کئی لمحے تو اسے اعتبار ہی نہ آیا کہ وہ مشفق آواز نہیں تھی۔

"تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ کوئی ایسے بھی کیا کرتا ہے؟ تمہارا دل پتھر کا کیسے بن گیا؟ تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تم نے مجھے اتنی تکلیف کیوں دی۔ ایک ٹیلی فون۔۔۔ صرف ایک فون کرنے کی بھی فرصت نہ نکال سکے تم میرے لیے‘ میں تو تمہاری دیوانی ہوں۔ میں تمہاری اچھی قسمت ہوں‘ مجھے کیسے بھول گئے تم؟" آنسوؤں کے ہیجان سے اس کی آواز غیر متوازن ہو رہی تھی۔

"تم نے بھی یہی کیا۔ ایک بار بھی رابطہ نہیں کیا۔" گرانٹ کی ناراض سی آواز سن کر اسے جھٹکا لگا تھا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے تمہیں اتنے فون کیے کہ مجھے گنتی بھی یاد نہیں۔ تم نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔"

"لیکن اگر میں اپارٹمنٹ میں نہیں تھا تو تم آنسرنگ مشین پر پیغام تو چھوڑ سکتی تھیں۔" اس نے بے بسی سے گرانٹ کا شکوہ سنا۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے کوئی پیغام نہیں چھوڑا۔ میں نے جب بھی فون کیا تم سے۔۔۔ تمہارے لیے بات کی‘ میں نے تمہیں اپنے ماموں کے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی دیا‘ کیونکہ ان دنوں ہم وہیں رہ رہے ہیں۔ میں نے اسپتال کا نمبر بھی چھوڑا۔ تم نے کسی بھی جگہ پر رابطہ نہیں کیا۔"

"حیرت ہے۔ میں تو پاگل ہو گیا ہوں آنسرنگ مشین کے پیغامات کی پڑتال کرتا رہا اور مجھے تمہارا ایک بھی پیغام نہیں ملا۔ یہ کیسے ممکن ہے ان دنوں تو رائن بھی اپارٹمنٹ میں نہیں ہے ورنہ میں سمجھتا کہ اس نے لاپروائی کی ہے۔"

"گرانٹ! تم پاکستان آجاؤ۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ میرے پاس بالکل مہلت نہیں بچی۔ شادی کی تیاریاں مکمل ہیں۔ چند روز میں ہم لوگ ابو کو لے کر گھر چلے جائیں گے۔ ابو اسپتال میں رہنے پر بالکل راضی نہیں ہیں۔ سب ان کو سمجھا کر عاجز آچکے ہیں لیکن ان کی بس ایک ہی ضد ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے میں اپنے گھر سے دلہن بن کر نکلوں۔ میرا یقین کرو میں نے بہت کوشش کی انہیں منانے کی مگر میری زبان کھلتی ہی نہیں ہے۔ امی پہلے ہی اتنی پریشان ہیں۔ میں انہیں اس نازک وقت میں یہ صدمہ کیسے دوں۔ دادو میرے ساتھ بات نہیں کرتیں لیکن انہوں نے کسی اور سے بھی کچھ نہیں کہا۔ تم کب تک آسکتے ہو‘ نہیں اب تو میں اور نہیں رک سکتی۔ تم کل ہی آجاؤ‘ آج۔۔۔ پہنچو۔ ابھی میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہیں چھونا چاہتی ہوں۔ ابھی آجاؤ گرانٹ ابھی۔"

"تم شادی شدہ ہو پریناں! تمہاری کہیں اور شادی ہو جائے گی‘ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے‘ ہم میاں بیوی ہیں۔ کسی کے چاہنے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی تم ہمت سے کام لو اور بالکل مت ڈرو۔ جن لوگوں کو دکھ پہنچانے سے تم ہچکچا رہی ہو‘ وہ تو تمہاری خوشیاں چھینتے ہوئے ذرا بھی نہیں سوچ رہے۔"

"یہ پاکستان ہے گرانٹ! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں یہاں ایسا نہیں ہوتا۔"

"دنیا کا کوئی بھی خطہ ہو محبت کے اصول ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اس میں سب جائز ہے۔ مرنا بھی اور مارنا بھی۔ اس سے بڑھ کر خود غرض جذبہ کوئی نہیں ہوتا۔ تم بھول جاؤ کہ تم خاندانی روایات کی اسیر کوئی پسماندہ اور مجبور لڑکی ہو۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ اب میں ہوں۔ میری محبت میں اتنی طاقت ہے کہ اس کے آگے تم کسی سے بھی ٹکرا سکتی ہو۔ کسی کی مخالفت اور ناراضی تمہیں اس محبت سے دست بردار ہونے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ میرے آنے سے قبل تمہیں ہر حال میں سب کو بتانا ہو گا کہ میرے اور تمہارے بیچ کیا رشتہ ہے۔ اگر تم نے کچھ بھی ظاہر نہ کیا اور میں اچانک تمہارے گھر پہنچ گیا تو ان لوگوں کا رد عمل بہت زیادہ شدید ہو گا۔ ان کے ذہنوں کو اس بات کے لیے تیار کرو اور دیر ہرگز نہ کرو۔ جتنی جلدی ممکن ہو‘ اس کام کو کر گزرو۔ تم ایک انٹلیکچول سلیبریٹی کی بیوی ہو۔ تمہاری سوچ اور ارادے تو خود بخود بلند ہو جانے چاہئیں۔" گرانٹ کا لہجہ اور انداز یکسر بدل گیا تھا۔ لائن میں اتنا شور تھا کہ اس کی آواز وضاحت سے سننے کے لیے پریناں سانس بھی آہستگی سے لے رہی تھی۔

"میری فلم کے ریلیز ہونے کے بعد تمہیں لاس اینجلس ٹائمز‘ نیو ٹائمز جیسے اخباروں کے نمائندوں کے

نک شوز میں شرکت کرتا ہوں گی۔ ایسے ہی گھبراتی رہو گی تو کام کیسے چلے گا۔ اچھا تمہاری واپسی پر میں تمہیں شادی کی شاپنگ Rodeo Drive سے کرواؤں گا۔ مجھے یاد ہے تم کو ایک Armani اسکارف کس قدر پسند آیا تھا۔ ہم اپنے ہنی مون کے لیے کہاں۔"

"تم نے ابھی کیا کہا تھا۔" اچانک پرنیاں نے اس کی بات کاٹ کر اونچی آواز میں پوچھا۔

"کیا آواز صاف نہیں سنائی دے رہی ہے؟ میں Rodeo Drive سے شاپنگ کی۔"

"تم آرہے ہو گرانٹ؟ تم نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے میں اپنے گھر والوں کو بتا دوں' کچھ دیر پہلے تم نے یہی کہا تھا' کب آرہے ہو؟"

"میں نے سالومن سے بات کی تھی۔ وہ یقیناً رضامند ہو جائے گا۔ پرنسپل فوٹوگرافی شروع ہونے سے قبل مجھے کچھ دنوں کے لیے پاکستان آنے کی اجازت مل جائے گی۔ تم انتظار کرو' میں اگلے فون پر تمہیں اپنی آمد کی تاریخ بتاؤں گا۔ اور ہاں۔ تمہارا دیا ہوا پاپ مجھ سے گم ہو گیا تھا' وہ لکھوا دو مجھے۔"

وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ اسے بتا رہی تھی۔ لاس اینجلس سے آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب مسکراہٹ نے پرنیاں کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔

☆ ☆ ☆

دھند کی مہین چادر کے پار مدھم لو والا سورج جلتا تھا اور اس کی لانبی زرد انگلیاں سفید چونے سے تازہ پتی ہوئی دیواروں کے کورے بدنوں پر سنہری تحریریں رقم کر رہی تھیں۔

وہ برآمدے میں اونچے پایوں والے پلنگ پر دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھی تھی۔

دیوار کی برودت اونی شال میں سے گزر کر اس کے کندھوں اور ریڑھ کی ہڈی میں اتر آئی تھی۔ اسے وہ کس قدر ناگوار لگ رہا تھا۔ مگر وہ اس قدر تھک چکی تھی کہ دیوار کا سہارا لیے بنا بیٹھنا اب محال تھا۔ نہ جانے کتنے گھنٹوں سے وہ اسی جگہ' اسی حالت میں خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی گردن اور کندھوں میں سخت اکڑن تھی اور آنکھوں کی رگیں دکھ رہی تھیں۔ کتنی ہی بار ونیس کسی کام کے سلسلے میں وہاں سے گزرتے ہوئے اسے اٹھ کر اندر جانے کو کہہ چکی تھی۔

"اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ بیمار ہو جاؤ گی۔ تمہارے ابو صبح سے تمہیں بلا رہے ہیں۔ کل پوری رات نہیں سوئے۔ داؤد نے چیک کیا تھا۔ انہیں تیز بخار ہے۔ بچوں والی ضد ہے۔ بھلا اسپتال جیسی اچھی جگہ یہاں گھر پہ کیسے ممکن ہے۔ تمہاری شادی کے بعد ایک منٹ انہیں گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔ چاہے وہ جتنا بھی شور مچالیں۔ اچھا تم ان کے پاس چل کر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا لائی ہوں۔ پتا نہیں صبح تم نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں۔ مجھے تو اپنا ہی ہوش نہیں ہے۔ گوفی نے ٹب میں ہاتھ مار مار کر پوری جرسی بھگو ڈالی تھی۔ صبح سے دوسری بار اس کے کپڑے بدلوا چکی ہوں۔ انگیٹھی نہیں جلا کر رکھی کہ کہیں لگ نہ جائے۔ ہر [illegible] اس کی نگرانی پر کون بیٹھے اور کھانا ابھی تو نہیں ہے کہیں۔ تم نے اگر نہیں اٹھنا تو کم از کم [illegible] ہی اوڑھ لو۔ آج ہوا میں غضب کی کاٹ ہے۔" ونیس نے ہاتھوں کو بغلوں میں دبا کر گرم کرنے کی کوشش کی۔

اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ پرنیاں اسے بتا نہیں پائی کہ وہ جس سکون میں گھری تھی اس کی حدود سے باہر جانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس سکون کا ایک سرا لکڑی کا پھاٹک تھا۔ جس کا ایک کواڑ نیم وا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے ہلتے ہوئے بے حد بھری آہنگی جگاتا تھا' دوسرا سرا برآمدے کے شرقی گوشے میں گی جافری کے پاس رکھا ٹیلی فون سیٹ تھا جو صبح سے بالکل چپ تھا۔ اور تیسرا سرا اس دیوار گیر گھڑی سے

جن نے دھرتی کو چھونے کی اجنبیت سکوت کو توڑ نہ پائی
تھی۔ سنگ فام ریلی رات اپنے مہا منظل سے اتر
آئی تھی اور اس کی قبا بارش کی بوندوں سے بھیگ کر
بوجھل ہو چلی تھی۔ اس بارش میں اکتا دینے والا تواتر
تھا۔

جاڑے کی بارش کسی بن بیاہی لڑکی جیسی ہوتی ہے '
جس کی بیاہ کی عمر نکلی جاتی ہو اور برستا ہو ' بن تم
آنکھوں والی اندر ہی اندر بس گھولتی ہوئی ' نہ کھل کر
برسے کہ جل تھل ہو جائے ' نہ تھمنے کا نام ہی لے۔

برآمدے کی دیوار پر سجے گل جاموں میں جلتے بجھتے
قمقموں کی روشنی میں پھوئیاں دم بھر کو جھلملاتیں
اور زمین کو چوم کر کیچڑ میں مل جاتیں۔

بادل سے کیچڑ بننے کا سفر بس ایک لمحے کا تھا۔

پرنیاں سے زیادہ بہتر یہ بات کون سمجھ سکتا تھا۔

اس نے گیلی سیلی شال سے خود کو ڈھانپ کر کپکپی
روکنے کی کوشش کی تھی۔ سردی اور بڑھ گئی تھی '
کپکپاہٹ میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔ ہوا برفانی قاشوں
سے بنی انگلیوں سے اس کا تن ٹٹولتی تھی۔

اندر بوڑھے گھر کے کھلے ہوئے دروازے سے
افغان مغنی کی پرسوز آواز اس کے کانوں میں اتر رہی
تھی۔ گراموفون سے ابھرتے فارسی غزل کے اشعار
کرت کے ساتھ پھوٹ رہے تھے۔ یقیناً وہ ریکارڈ کوئی
بجا رہا تھا۔ وہ فارسی شاعری تو کیا کوئی بھی آواز سننے کے
قابل نہیں تھا۔ وہ ماں کے پیٹ سے بہرا تھا اور جیسا
پیدائشی بہروں کے ساتھ ہوتا ہے ' وہ گونگا بھی تھا۔
اسے بس گراموفون کی چکراتی ہوئی سوئی بھلی لگتی تھی
اور سوئی کے چکروں کے ساتھ گھومتا ہوا خوش ہوتا
تھا۔ وہ پرنیاں سے دو برس چھوٹا تھا ' لیکن اس کا دماغ
کسی سات سالہ بچے کی شعوری منزل پر پہنچ کر تھم گیا
تھا۔

فارسی اور اردو غزلوں کے ونائل ریکارڈ پرنیاں اور
آذرک کی مشترکہ پسند کا شاخسانہ تھے۔

خرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد۔ (مژدہ سنا ہے
کہ آج رات تو آئے گا)

سر من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد۔ (سر اپنا
ان راہوں میں قربان ہو جن سے تیری سواری گزرے
گی۔)

کند حرب فراق کے درد میں ڈوبا ہوا گا رہا تھا۔

جافری کے پار برآمدے کے آخری کونے میں لگے
ہوئے دروازے کے پیچھے اس وقت کیا ہو رہا تھا؟ وہ
سوچنا نہیں چاہتی تھی ' پر اس کے چاہنے سے کیا فرق
پڑتا تھا۔ ونیس شاید داؤد کی منت کر رہی ہوگی۔ اس کے
سامنے گڑگڑا رہی ہوگی۔ اس کو راضی کرنے کے لیے
واسطے دے رہی ہوگی۔

جو کچھ اس نے تھوڑی دیر قبل ونیس کو بتایا تھا '
اسے سننے کے بعد کوئی بھی ماں یہی کر سکتی تھی۔ وہ خود
داؤد سمیت دنیا کے کسی بھی ایسے آدمی کے پیروں میں
گر کر ناک رگڑ سکتی تھی جو اس شادی کو روکنے پر اختیار
رکھتا ہو۔ ونیس بھی ناک ہی رگڑ رہی ہوگی۔ بس وہ کسی
بھی حال میں اس شادی کو کروانا چاہتی تھی۔

اس کے پیروں کی انگلیاں سردی اور تھکن سے اکڑ
کر درد کرنے لگی تھیں۔ برآمدے کے ستون کا سہارا
لے کر اس نے خود کو کھڑے رہنے پر مجبور کیا ہوا تھا۔
بیٹھنا اسے زیادہ ذلت آمیز لگ رہا تھا۔ قدموں کی چاپ
برآمدے کے فرش پر گونجنے لگی۔ ونیس داؤد کے
کمرے سے نکل کر اس کے پاس آ رہی تھی۔ اس کا
سامنا کیسے کرنا چاہیے تھا۔ سر اٹھا کر یا گردن جھکا کر؟
بعض باتوں کو سننے کے لیے کوئی بھی انداز اپنا یا جائے ' وہ
ایک جیسی ہی شرمناک رہتی ہیں۔ گراموفون بین
کر رہا تھا۔

بہ لب رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم (میری جان لبوں پر
آگئی ہے تو آ کہ میں زندہ ہو جاؤں۔)

پس ازاں کہ من نمانم بہ چہ کار خواہی آمد۔
(میرے مرنے کے بعد تو آیا تو تیرا آنا کس کام کا)

اسے اپنی پسلیوں میں قفس تھیلتی محسوس
ہوئی۔

برآمدے کی آخری سلوں پر گرتے قطرے اچھل
کر بکھر رہے تھے۔ خود کو گیلا ہونے سے بچانے کے
لیے وہ ستون کے ساتھ گھوم کر چھینٹوں کی دسترس سے
ذرا دور ہو گئی۔ قدموں کی آہٹ اس کے قریب آ کر
رک گئی تھی۔ اس نے فرش کی بادامی پتھریلی سلوں پر
کھلی چپلوں میں دو گدگدے گورے پیروں کو دیکھا۔
ونیس کبھی بھی جرابیں اور گرم جوتے نہیں پہنتی تھی۔
اس کے پاؤں جلنے لگتے تھے۔ دائیں پیر کے ٹخنے کے
نزدیک زخم کا موہوم سا نشان تھا۔ چپل کی تنی سے
ہلدی کے ذرات چپکے تھے جو شاید باورچی خانے میں کام
کرتے ہوئے گرے ہوں گے۔ گل جاموں کے کانچ
سے پھوٹنے والی روشنی تیز تھی اور ہر منظر کو وضاحت
سے دکھاتی تھی۔ وہ ان پیروں پر سر رکھ کر انہیں چومنا
چاہتی تھی۔ پر اس خواہش پر عمل کرنا ممکن نہ تھا۔

"پرنیاں! میں سمجھی تھی تم نے داؤد کو اپنی شادی کا
بتا دیا ہے۔ کیسی اس کے سامنے میرے منہ سے نکل
جاتا تو کیا ہوتا۔ اسے بس تمہارے اس مسلمان لڑکے
سے ملنے جلنے کی خبر ہے۔ وہ اس بات کو بھولنے پر آمادہ
ہے۔ وہ شادی کے بعد تمہیں طعنے نہیں دے گا۔ وہ
سمجھتا ہے تم بے وقوف ہو۔"

ونیس کی امید اب تک نہ ٹوٹی تھی۔ وہ اب بھی
راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"وہ بھول جائے گا میں نہیں بھول سکتی۔ میرا نکاح
ہوا ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں ' میرا شوہر آ رہا ہے ' وہ
آنے ہی والا ہے۔"

"یار من بیا۔ یار من بیا۔" (میرے یار آ۔ تو
آجا)

مغنی کے دل کی رگیں اور گلے کی رگیں باہم مل گئی
تھیں۔ اس کے الحان میں اس کا دل دھڑکتا تھا۔

"تم مسیحی ہو۔ وہ یسوع کا دشمن ہے۔ تمہارا اس
سے نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔ اس بات کی کوئی اہمیت
نہیں۔"

"اس بات سے زیادہ کوئی بات اہم نہیں۔"

"تمہاری شادی میں دو دن رہ گئے ہیں پرنیاں! مجھے
چوراہے میں بٹھا کر میرے سر میں جوتے مار لو ' پر
میرے ساتھ یہ نہ کرو۔ میں نے کون سی برائی کی
تمہارے ساتھ جس کا تم بدلہ لے رہی ہو۔"

ونیس کا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بولنے میں دقت
ہو رہی تھی۔ اگر اس میں مزید رونے کی ہمت ہوتی تو وہ
اب بھی اس کے سامنے روتی ' مگر شاید وہ تھک چکی
تھی۔

پرنیاں خاموش رہی اور اسی طرح سر جھکائے
ہوئے مڑ کر چلنے لگی۔ قدم اٹھانے پر اسے احساس ہوا
کہ پیروں کے ساتھ اس کی پنڈلیاں بھی اکڑ چکی
تھیں۔

ونیس اس کے پیچھے آتے ہوئے منت بھرے لہجے
میں اسے سمجھا رہی تھی۔ جب بھی لوگ فقیروں کا
دست سوال جھٹک دیتے ہیں تو فقیر اسی طرح پیچھا
کر کے فریادیں دہراتے ہیں۔ کسی کے سن لینے کے
خوف سے وہ سرگوشیوں میں گھگھیا رہی تھی۔

"یار من بیا۔ یار من بیا۔"

گراموفون کی آواز ونیس کی آواز پر غالب تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے الماری کھولی اور نچلے
خانے میں رکھے بیگ کی زپ کھول کر کچھ چیزیں
نکالیں۔

شدت گریہ سے سرخ آنکھوں والی بھکارن ونیس
دروازے کے ساتھ جلتی انگیٹھی کے قریب کھڑی
اسے بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔

"میری بات کیوں نہیں سنتی ہو؟ مجھ سے بولا نہیں
جا رہا۔ شاید مجھے بخار ہو رہا ہے ' میرے گلے میں درد
ہے۔"

بھکارن نے کشکول پھیلا کر التجا کی۔

اس نے بیگ سے نکالے ہوئے کاغذ کے پرزے
لا کر ونیس کے ہاتھ میں دے دیے۔ کچھ دیر اس کی
چندھیائی ہوئی نظریں ان پر گڑی رہیں اور پھر اس نے
ان سب کو جلتی ہوئی انگیٹھی میں پھینک دیا۔

وہ پولرائیڈ کیمرے سے کھینچی ہوئی ان کی شادی کی
تصاویر تھیں۔ ایک لمحے میں کاغذ نے آگ پکڑ لی
تھی۔ پرنیاں کو امید نہیں تھی وہ ایسا کرے گی۔ وہ اپنی
جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے

جلتی تصویروں کو دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں میں ذرا سی جنبش ہوئی۔

"آپ نے انہیں جلا دیا؟ یہ کیا کر دیا؟"

"انہیں جلا دینا ہی بہتر تھا۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ کوئی نہیں جانتا کہ تم نے کیا کیا ہے۔ میں کسی کو پتا نہیں لگنے دوں گی۔ ہر ثبوت کو نیست کر دوں گی۔ اس کی جو بھی نشانی ہے' وہ مجھے دو' میں اسے جلا کر ختم کر دیتی ہوں۔ اس کی ہر شے جلا دو۔"

"یہ آنکھیں بھی اس کی ہیں۔ انہیں بھی جلا دوں۔ یہ ہونٹ اس کے ہیں۔ انہیں بھی جلا دوں۔ یہ پورا جسم اس کا ہے۔ اسے بھی۔ سب کچھ جلا دوں۔" وہ ہذیان بکنے لگی تھی۔

ونس نے دروازے کے کواڑ بھیڑ کر اس کی آواز کو باہر جانے سے روکا۔

"جب آرٹرک تمہیں یسوع کی بھیڑ کہتا تھا تم کیسے خوش ہوتی تھیں۔ میں ڈرتی تھی۔ مجھے خوف تھا تم کہیں نن نہ بن جاؤ۔ اور آج تم یسوع کے نام سے ہی پھر گئی ہو۔ تم اگر نن بن جاتیں تو مجھے ایسی تکلیف کبھی نہ ہوتی۔"

ونس آگے بڑھی اور اس کی گردن میں لٹکتا صلیب والا لاکٹ کھینچ کر [illegible] اتارنا چاہا۔ پرنیاں بدک کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"تم دھوکے باز ہو۔ اس مقدس صلیب پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ اسے اتار دو تاکہ تمہارا کھوٹ سب کو نظر آ سکے۔ اسے پہن کر سب کی آنکھوں میں دھول نہ جھونکو۔"

شاید ہی کسی گالی میں اس سے بڑھ کر چوٹ پہنچانے کی صلاحیت ہو گی۔ پرنیاں کے دل کو کسی نے پاؤں تلے کچل دیا تھا۔

"میں نے تم پر کبھی سختی نہیں کی۔ کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کوئی کی شکل میں خدا نے مجھے جو محرومی دی میں اس کا بدلہ تمہاری ذات سے کرتی رہی۔ مجھے نہیں یاد پڑتا میں نے کبھی تمہاری کوئی خواہش رد کی ہو۔ میں کوئی احسان نہیں جتا رہی۔ صرف تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ اب میں تم پر سختی کروں گی۔ ساتھ [illegible] بھی اٹھاؤں گی۔ تمہاری جان لینا پڑی تو وہ بھی کروں گی۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں دروازے کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

پرنیاں کی نظریں انگیٹھی کی راکھ پر جمی تھیں۔

بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد ونس بولی "اچھا سنو' تمہیں اپنے باپ پر ذرا ترس نہیں آیا۔ تم نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ وہ مر رہا ہے۔ بس ایسے ہی پوچھ رہی ہوں تم جواب نہیں دینا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔"

پرنیاں کی ٹانگیں تھکن سے شل تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کھڑے رہنا چاہیے یا کرسی پر بیٹھ جائے۔ شاید کرسی پر بیٹھنا عجیب لگے گا۔ اسے بھی ونس کی طرح فرش پر بیٹھ جانا چاہیے پر وہ کھڑی رہی۔ اسی طرح سر گرائے ہوئے اسی طرح نظریں نیچی کیے ہوئے۔

"مرتے ہوئے لوگوں پر بیگانے بھی رحم کھاتے ہیں۔ وہ تو تمہارا اپنا باپ ہے۔ تمہیں رحم نہیں آیا پرنیاں! ہاں نہیں آیا ہو گا۔" ونس نے آہستگی سے سر ہلایا۔ "اولاد کا دل اور طرح کا ہوتا ہے۔ کوئی جب بھی غصے میں آتا ہے تو مجھ پر تھوک دیتا ہے یا میرے منہ پر طمانچے مارتا ہے۔ میں سمجھتی تھی وہ نا سمجھ ہے لیکن نا سمجھ تو میں ہوں۔ وہ تو بس اولاد ہے۔ اچھا تم سو جاؤ۔ صبح بہت سارے کام ہیں۔ وقت جانے کیا ہو گیا ہے۔ انگیٹھی جل رہی ہے تو کھڑکی کھلی رہنے دینا۔"

وہ دیوار کا آسرا لے کر اٹھی اور اس کے پاس آتے ہوئے کندھوں سے پکڑ کر اسے بستر کی طرف لے گئی۔ اسے لٹا کر کمبل اوڑھاتے ہوئے ونس نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تھا۔

"تمہارے ابو کئی راتوں سے کہہ رہے کہ میں سوؤں گا نہیں۔ میں سو گیا تو میری موت آ کر مجھے دبوچ لے گی۔ وہ بہت ڈرا ہوا ہے۔ آنکھیں بند کرتے ہی

مجھے نظر آنے لگتی ہے۔ سن کر میرا دل بیٹھ جاتا تھا۔ میں سوچتی تھی موت کے بھیانک جبڑے ہوں گے انگارہ آنکھیں ہوں گی۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے نیچے ہوں گے۔ عجیب عجیب صورتیں مجھے رات بھر ڈراتی رہتی تھیں۔ مجھے آج پتا چلا ہے کہ میں بے جا ڈرتی رہی۔ تم تو بہت خوب صورت ہو۔ آرٹرک کی موت اتنی خوب صورت ہو گی۔ میرے گمان میں نہیں تھا۔"

اس نے اپنے ماتھے پر ایک قطرہ گرتے ہوئے محسوس کیا۔

کمبل اس کے کندھوں تک لپیٹ کر ونس بستر سے دور ہو گئی۔

وہ ونس کو پورا سچ نہیں بتا سکی تھی۔ ایک بات کئی بار اس کی زبان پر آ کر دم توڑ گئی تھی۔ وہ حاملہ تھی۔

رات کے آخری پہر اس نے گھر چھوڑا تو بارش تب بھی برس رہی تھی۔ چند قدم چلنے پر ہی اس کے پاؤں کیچڑ میں دھنسنے لگے تھے۔ اس کی بغل میں دبے مختصر سفری بیگ میں سب سے قیمتی متاع سنو وائٹ کا تابوت تھا۔ اب اسے اپنی کہانی میں اس تابوت کا مقام سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے محبت کا زہریلا سیب چکھ لیا تھا اور اسے شہزادے کا انتظار تھا جو اپنے لمس سے اسے زندہ کر دیتا۔

یار من بیا۔ یار من بیا۔ یار من بیا۔ گراموفون کی سوئی جیسے ایک ہی نکتے پر اٹک گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

گیارہ کا موڑ مڑتے ہی وہ رکا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس ڈالر کا نوٹ نکال لیا۔ ٹکٹکی لگائے ہوئے کھچڑی داڑھی والے امریکی صدر کی تصویر کو چومتے ہوئے اس نے نوٹ کو تہہ لگائی اور احتیاط سے langdon (بے آستین کا اونی لبادہ) تلے جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑا ہو کر اپنے دل کو کنپٹیوں میں بجتے ہوئے سنتا رہا۔ اسے یقین ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کی قسمت اتنی اچھی ہو سکتی تھی۔ کیا کوئی مانے گا کہ یہ grant (پچاس ڈالر کا bill) اسے پکڑا کر دیتے ہوئے ملا تھا۔ لیکن اسے کسی کو بتانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ اس کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ وہ اپنے دماغ میں ان اشیاء کی فہرست مرتب کرنے لگا جو اس رقم سے خریدی جا سکتی تھیں۔ اسے اپنی ترجیحات طے کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بہت ساری چیزیں تھیں جنہیں پانے کے لیے وہ مچلتا تھا لیکن ان میں سے اسے زیادہ مرغوب کون سی تھیں۔ اس پر اچانک ملنے والی خوشی کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ کچھ بھی سوچ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر جیب سے نوٹ نکال کر اسے غور سے دیکھا اور اسے اپنی انگلیوں میں مسل کر پرکھنے لگا۔ وہ اصلی تھا۔ یہ بات شبے سے بالاتر تھی۔ وہ گنگنانے لگا۔

cucu canta ba la rana

(ٹرٹر مینڈک گاتا تھا)

cucu debajo de agua

(آب تلے چلاتا تھا)

cucu paso un caballero

(ٹرٹر آیا [illegible] ایک)

cucu con capa y sombrero

(کہ انگرکھا پہنے ہیٹ)

نوٹ کو سونگھ کر اس نے پھر سے جیب میں منتقل کیا۔

cucu paso un marninero

(ٹرٹر گزرا ایک ملاح)

cucu vendiendo romero

(بیچے پتی پاس بھری)

cucu le pidic una ramito

(ٹرٹر' ننھا مینڈک گایا' مانگی اس سے ایک پھلنگ۔"

"ایک پھلنگ۔"

puerto ricana بچہ شالم تھا۔ اس کی عمر دس سال مگر یوں (نم) بیس سال والا تھا وہ طراز اور کھوج لگانے کا شائق تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت گلیوں میں آوارہ گھومتے ہوئے گزارتا تھا اور گلیوں نے ہی اس کی

سوجھ بوجھ کو اس کی جسمانی عمر سے دگنا بنا دیا تھا۔ اس کا محبوب مشغلہ dumpster divong (کوڑا دان میں گھس کر قابل استعمال چیزیں اکٹھی کرنا) تھا۔ دن کا سب سے اچھا وقت وہ تھا' جو شام کوڑے دان میں گزارتا تھا۔ کتنی ہی کار آمد اشیاء ہاتھ آتی تھیں۔ بس ذرا جستجو کرنی پڑتی تھی۔ سپر اسٹورز اور گروسری والے خوراک جو ابھی باسی بھی نہ ہوئی ہوتی تھی' کچرے دانوں میں پھینک دیتے تھے۔ کئی بیچنے کے لائق چیزیں بھی کوڑے میں مل جاتی تھیں جیسے دھات کے ٹکڑے' کانچ کی خالی بوتلیں' استعمال شدہ کپڑے' ناکارہ گھڑیاں اور پرانے کمپیوٹرز کے حصے پرزے۔ کسی دن وہ زیادہ محنت کرتا تو اسی طرح کی بیسیوں چیزوں کو فروخت کر کے دس ڈالر تک کما لیتا تھا۔ اس نے جو ہری اور کالی دھاریوں والا langdon پہن رکھا تھا۔ وہ بھی اس نے ایک ایسی ہی مہم کے دوران پایا تھا۔ وہ langdon شام کو اتنا پسند تھا کہ کبھی کبھار سخت دھوپ میں بھی اسے پہن لیا کرتا تھا۔

اس کی ماں سلویا۔ اس کی اس عادت سے سخت نالاں تھی اور کئی بار اسے پیٹ چکی تھی۔ اس کے کپڑوں سے پھوٹتی بو سے کراہت ہو جاتی تھی کہ اس کا دماغ پھٹنے لگتا تھا۔ لہٰذا اس شخص سے شام کا جی بھی متلاتا تھا مگر دھیرے دھیرے وہ ایسے غائب ہوتی جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو۔ سلویا کی سختی سے گھبرا کر کچھ عرصے کے لیے اس نے اپنا شوق تیاگ دیا تھا اور کچھ ہم عمر لڑکوں کے ساتھ شہر سے باہر گالف گراؤنڈز میں جانے لگا تھا۔ وہ لوگ کھوئی ہوئی گیندیں ڈھونڈتے اور انعامی رقم پاتے۔ مگر ایک تو گالف کورس بہت دور تھا۔ آنے جانے میں بڑا وقت خرچ ہوتا تھا۔ دوسرے گیندیں تلاش کرنے کا کام مشقت طلب اور اکتاہٹ بھرا تھا۔ بدلے میں ملنے والی رقم بھی نہایت قلیل تھی۔ وہ جلد ہی اوب گیا اور دوبارہ سابقہ روش کو لوٹ گیا تھا۔ لیکن اب وہ محتاط ہو گیا تھا۔ کسی dumpster میں گھسنے سے پہلے وہ ایک بوسیدہ برساتی' جو اسے کوڑے میں سے ہی ملی تھی۔ پہن لیتا۔ اس طرح اس کے کپڑے اور جوتے چپکنے والی اور بدبو چھوڑتی چیزوں سے بچ جاتے تھے۔ سلویا دیر سے گھر جانے پر جتنی بھی بلاؤں برس لیتی۔ وہ پلٹ کر بھی نہ دیتا۔ بالآخر تنگ آ کر اس نے چپ سادھ لی تھی۔

اس کا باپ پیدرو بھی ایک 'جنک مین' (کوڑے میں سے قابل کار چیزیں نکال کر بیچنے والا تھا۔) ایک سال پہلے جب یہ لوگ 'san Juan' میں رہا کرتے تھے تو پیدرو عمارتوں کی کھڑکیاں صاف کیا کرتا تھا۔ پھر پتہ نہیں اس نے کیا کیا کہ پولیس والے اسے پکڑنے کے لیے ان کے گھر آ گئے۔ پیدرو ان کی گاڑی رکتے دیکھ کر کھڑکی سے باہر کود گیا تھا اور پھر کئی ہفتوں تک اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ بعد میں اس نے سلویا کو پیغام بھجوایا اور وہ ان سب بہن بھائیوں کو لے کر اس نئی جگہ پر آ گئی۔ یہاں آنے کے بعد اس نے پیدرو کو کچرے کا بیوپار کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بدمزاج ہو گیا تھا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان سب کو گالیاں دینے لگا تھا۔ سلویا بھی چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ ان سب بہن بھائیوں کو مارنا اور برا بھلا کہنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ ان دنوں سلویا اور پیدرو کا جب بھی سامنا ہوتا تو جھگڑنے لگتے۔ ان کی لڑائی کی وجہ شام کو معلوم تھی۔ اس کا نیا بھائی یا بہن آنے والی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ لوٹ کر گھر ہی نہ جاتا۔ چیخنے اور کوسنے کی آوازیں سن سن کر اس کے کان پک گئے تھے۔

کچرے سے وابستگی نے اسے کئی پرلطف واقعات سے روشناس کروایا تھا مگر کچھ دیر قبل جو بات ہوئی تھی۔ وہ اپنی نوعیت کی ایک ہی تھی۔

وہ گلی کے نکڑ پر گروسری اسٹور کے عقب میں رکھے ہوئے بڑے dumpster میں گھسا کوڑا کھدیڑ رہا تھا اور کوئی بھی کام کی چیز ہاتھ نہ لگنے پر تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ ایک نوجوان لڑکے نے اسے چونکا دیا۔ پہلے تو وہ اسے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ گلی بالکل ویران تھی اور اس میں غیر معمولی دلچسپی ظاہر کرنے والا وہ شخص خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ شام نے برنج کی نوکیلی پتری

مٹھی میں لے کر ہاتھ کمر کے پیچھے چھپا لیا تھا تاکہ کسی خطرے کی صورت میں اپنا دفاع کر سکے۔ وہ لڑکا کسی ایشیائی ملک کا باسی تھا۔ اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے شالم کو احساس ہوا کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ خاصا بے وقوف اور عجیب سا نوجوان تھا۔ شالم نے اپنی ٹوٹی ہوئی انگلش میں پیرا گراف کے حوالے سے ایک جھوٹی کہانی سنائی جسے سن کر خدا جانے اس اجنبی کو کیا ہوا کہ اس نے پچاس ڈالر کا bill (نوٹ) اسے دے ڈالا تھا۔ یہ ششدر رہ گیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں ہوا کہ اس رقم کے عوض وہ کچھ بھی نہیں چاہتا تھا۔

شالم نے آہٹ سن کر ایک قدم پیچھے لیا اور گلی میں جھانک کر دیکھا۔ وہ نوجوان dumpster سے گلی تک گلی کے درمیان میں خاموش کھڑا تھا۔ شالم کو عجیب محسوس ہوا۔ وہ اب تک کیوں موجود تھا۔ چلا کیوں نہیں گیا تھا۔ نوجوان نے شاید دیوار سے لگا ہوا اس کا سر دیکھ لیا تھا اور وہ چلنے لگا تھا۔ اسی سمت میں جس میں شالم جا رہا تھا۔ وہ مڑا اور تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ کیا وہ لڑکا اس کے پیچھے آ رہا تھا لیکن کوئی انہونی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے اس کو اسی گلی سے گزر کر کہیں جانا ہو تو پھر وہ خود پہلے کیوں نہیں گیا تھا۔ اب تک کس لیے منتظر تھا؟ قدموں کی رفتار بڑھاتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ لڑکا لمبے ڈگ بھرتا اس کے تعاقب میں آ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اس کا جی چاہا کہ بھاگنے لگے مگر وہ خود کو ڈرا ہوا ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"شالم! رکو۔" اس لڑکے کی پکار سن کر شالم کے بدترین شکوک کی تصدیق ہو گئی۔

کیا وہ کوئی بیمار ذہن والا آدمی تھا اور اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا تھا۔ لیکن دن کی روشنی میں وہ اسے کوئی نقصان پہنچانے کی جرات نہیں کرے گا۔ گھبرانے والی کوئی بات نہیں تھی۔

"Si mano" (ہاں بھائی) اس نے رکے بغیر جواب دیا۔

"وہ نوٹ مجھے واپس دے دو۔ میری بات سنو۔"

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے شالم بھاگ پڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر جیب والی جگہ سختی سے جما تھا۔ وہ لڑکا اسے آوازیں دے رہا تھا لیکن ان سنی کر کے وہ ناک کی سیدھ میں دوڑتا رہا۔ وہ خود کلامی کرتا جا رہا تھا۔ جب وہ بہت گھبرایا ہوا ہوتا تھا تو خود سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

Te tumbaste es (کیا تم نے چرا لیا ہے؟) اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور دائیں بائیں سر ہلانے لگا۔

"No te Panikoes (بولنے کی ضرورت نہیں)"

اس لڑکے کے دوڑتے قدموں کی گونج اسے عقب میں سنائی دے رہی تھی۔

que bruto (کیسا چغد ہے)" اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ وہ ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔ اور آخری حد تک قوت لگا کر رفتار بڑھائی۔ وہ نوٹ لوٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ احمق آدمی اسے کوئی بے ہودہ ترکیب لگانے کی کوشش کر رہا تھا تو اسے مایوسی ہونے والی تھی۔ شالم کے بارے میں اندازہ لگانے میں اسے غلطی ہوئی تھی۔ وہ کوئی تر نوالہ نہیں تھا۔

اس لڑکے نے اب تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور وہ زور زور سے کچھ بول رہا تھا۔ لیکن شالم اس کی آواز پر کان ہی نہ دھر رہا تھا۔ موڑ کاٹ کر وہ باہر آیا تو سامنے دو گلیاں تھیں۔ یوں تو وہ علاقہ اس کا بھالا بھالا تھا لیکن رہائشی علاقوں کی ان گلیوں کے بارے میں اس کی معلومات ناقص تھیں۔ وہ ایک پل کے لیے ہچکچاہٹ کا شکار ہوا اور پھر نزدیک نظر آنے والی گلی میں گھس گیا۔ گردن گھما کر دیکھنے پر وہ ذلیل آدمی گلی کے قریب دکھائی دیا۔ وہ اسے بھگا بھگا کر تھکا دے گا۔ اسے دوڑنے کی خاصی مشق تھی۔ وہ لڑکا دراز قد تھا اور اس کے قدم بھی بڑے تھے لیکن رفتار میں شالم کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ گلی دائیں رخ گھوم رہی تھی اور اس

کے بعد شاید شاہراہ آنے والی تھی۔ لوگوں کی بھیڑ میں وہ لڑکا اس کا تعاقب چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس امید نے شالم کے پیروں میں بجلی سی بھر دی۔ لیکن گلی کے ختم کے بعد اس نے جو دیکھا وہ حواس گم کرنے والا منظر تھا۔

گلی کا آخری سرا بند تھا۔

وہ ایک ویران بند گلی میں گھر گیا تھا۔ مزید بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ لڑکا اس کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ ایک دم طیش نے شالم کا خون کھولانا شروع کر دیا۔ اسے اپنی خوشی کا دم گھونٹنے والے اس آدمی سے نفرت محسوس ہوئی۔ اس نے جھٹکے سے جیب میں انگلیاں گھسا کر وہ نوٹ باہر کھینچا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نوٹ کو درمیان سے پھاڑ ڈالا۔

"جہنم میں جاؤ Sanamagan"

نوٹ کے ٹکڑوں کو ہوا میں اچھالتے ہوئے اس نے غصے سے چلا کر کہا۔

وہ لڑکا رک کر اپنی سانسیں بحال کر رہا تھا۔ گلی سے باہر نکلنے کے لیے شالم کو اس کے قریب سے گزر جانا تھا۔ اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ وہ شخص اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا؟ وہ بالکل نہتا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے وہ اپنا بچاؤ کر سکے۔ شور مچانے پر شاید کوئی اس کی مدد کو آ جاتا لیکن یہ ایک قیاس تھا۔

بے قابو تنفس کے دوران وہ ہکلایا۔

peldon s[illegible] (مجھے افسوس ہے۔)

✿ ✿ ✿

حکیم بیگم نے گندھی ہوئی مٹی کا لوتھڑا چاک پر رکھا اور مرزل کو بھاگ کر بھیڑ کے قریب جاتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ادھ جلی موٹی چھڑی تھی جو اس نے بجھے ہوئے چولہے میں سے نکالی تھی۔ اس کی ماں ساتھ والے گاؤں میں ہونے والی ایک شادی کی تقریب میں شریک ہونے گئی تھی اور مرزل اپنی عمر کے بچوں کے مطابق کمروں اور صحن میں ننگے پاؤں بھاگتا پھر رہا تھا۔

اس نے چھڑی اپنے سر سے اوپر اٹھائی اور پوری قوت سے بیٹھ کر جگالی کرتی ہوئی بھیڑ کی پیٹھ پر ماری۔ بھیڑ بدک کر اٹھی اور کھونٹے سے دور جانے کے لیے بے چین ہو گئی۔

پیچھے بیٹھی حکیم بیگم نے دہائی دی۔

"نا وے پترا! بھیڑ نوں نا مار۔ تیری میری طرح اس وچ وی جان اے۔ تیری مار نال اس نوں پیڑ ہوندی اے۔ بھیڑ چھڈ دے۔ نا ستا وچاری نوں۔ میرے کول آ کے بیٹھ میں تجھے مٹی دے دیوے بنا کے دواں۔ شامی ان میں سروں (سرسوں) دا تیل پا کے بتی دی کنے پر بال کے (جلا کے) رکھیں گے۔ بالکل کوڈی تارے (جگنو) ور گے جگمگ کریں گے۔ اے سوٹی چھڈ دے۔"

(نہیں پتر نہیں۔ بھیڑ کو نہ مار تیری میری طرح یہ بھی جان دار ہے تیرے مارنے سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ کیوں بے چاری کو ستاتا ہے؟ میرے پاس آ کے بیٹھ میں تجھے مٹی کے دیے بنا کر دوں گی۔ شام کو ان میں سرسوں کا تیل ڈال کر [illegible] رکھیں گے تو بالکل جگنوؤں کی جگمگ کریں گے یہ چھڑی چھوڑ دے۔)

مرزل اس کے سمجھاوے میں نہ آیا اور چھڑی کو پہلے سے زیادہ بلند اٹھا کر بھیڑ کی پچھلی ٹانگوں پر ضرب لگائی۔

"ہائے پترا ایسا نہ کیا کر۔ بھیڑ دردے کرلا اٹھی ہے۔ ٹھہر میں تجھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم دی گل سناتی ہوں۔ جو اک اٹھ (اونٹ) دے بارے ہے۔ اس دا مالک ظالم تھا۔"

مرزل نے ذرا دیر کو اپنا مشغلہ ترک کیا۔

"ہمارے گھر میں اٹھ کیوں نہیں ہے۔ وہ کوٹھے جتنا اونچا ہوتا ہے۔ وہ حریک کے سارے بچے کہا جائے گا۔" وہ پھر سے کھونٹے کے گرد چکر کاٹتی ہوئی بھیڑ کے پیچھے چھڑی لہرانے لگا۔

حکیم بیگم نے تھالوں کے پانی میں ہاتھ ڈبو کر چادر سے پونچھے اور اٹھ کر مرزل کے ہاتھ سے چھڑی لے

لی۔ وہ رونے لگا تھا۔ بیچ بیچ کر حکیم بیگم کو دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے بدن کا سارا زور لگا رہا تھا۔ وہ بہت غصہ ور اور ضدی تھا۔ حکیم بیگم نے چھری کو دور اچھالتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"مجھ پر غصہ نہ ہو بھیڑ بھی روتی ہے جب تو اس کو مارتا ہے۔"

"جھوٹ نہ مار۔" مزمل نے خود کو چھڑا کر اپنے ننھے ہاتھوں سے اسے ایک اور دھکا دیا۔ "وہ کوئی نہیں روتی، اس کے آنسو کدھر ہیں۔"

حکیم بیگم نے لمبا ہوکا بھرا۔ "تجھے کس نے کہا کہ کوئی روئے تو آنسو بھی بہانے کی ضرورت ہوتی ہے؟ کئی رونے ایسے ہیں جو آنسوؤں کے محتاج نہیں۔"

مزمل کو اس پر اعتبار نہ آیا۔ وہ اپنے رخساروں کو چھو کر بولا۔

"جھوٹی جھوٹی میرے آنسو نکل رہے ہیں۔ رو تا تو میں ہوں۔" اس نے اپنی انگلیاں حکیم بیگم کی کلائی سے لگاتے ہوئے ثبوت پیش کیا۔ "بھیڑ نہیں روتی اس کی آنکھیں خشک ہیں۔"

حکیم بیگم اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولی۔

"آنکھیں تو میری بھی سوکھی ہیں۔"

مزمل کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ دانت پیستا ہوا بھیڑ کی طرف بھاگا۔ بھیڑ کا کان مٹھی میں جکڑ کر اس نے سر جھکایا اور منہ کھولا۔ شاید وہ اس کے کان میں دانت گاڑنا چاہتا تھا۔ حکیم بیگم نے عجلت میں آگے بڑھ کر بمشکل اسے قابو کیا تھا۔ اب وہ حکیم بیگم کی کلائی پر کاٹنے کے لیے مچلنے لگا۔

"کھنڈرے سویرے۔ نائیلون کی جوتیوں اور باسی روٹیوں کے عوض میٹھی سوغاتیں میٹھے میٹھے کھا لو۔"

پھیری والے کی صدا کانوں میں پڑتے ہی مزمل نے جدوجہد موقوف کر دی اور حکیم بیگم سے پیسے مانگنے لگا۔ اسے لچھا خرید کر دینے کے بعد وہ چاک کے سامنے آ بیٹھی۔ کچھ دیر تو امن رہا پھر مزمل نے کبوتروں کی دھالی پر دھاوا بول دیا۔ سفید کھیار نے کبوتر کو دونوں ہاتھوں میں سختی سے دبوچے وہ ایک پاؤں پر اچھلتے ہوئے منہ سے بے معنی آوازیں نکالنے لگا۔ حکیم بیگم کی التجاؤں کو جب اس نے قابل غور نہ جانا تو اسے دوبارہ اٹھ کر آنا پڑا تھا۔

"میرا لکڑا سونا پتر ہے۔ کبوتر دی ساہ (سانس) نہ بند ہو جائے۔ ملوکڑی جند ہے (نازک جان ہے) کمر ماندی (پنکھ) ٹٹ جائے گی۔ سخت ہاتھ نہ لا بیبا!"

حکیم بیگم چند گھڑی کے تعاقب سے ہانپنے لگی تھی۔ اسے آمنہ کی نومولود بچی کا خیال آیا۔ آمنہ کے ہاں بچی کی پیدائش قبل از وقت ہوئی تھی اور بچی سخت بیمار تھی۔ اس کے پیدا ہوتے ہی ڈاکٹروں نے اسے شیشے کے ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ تو اس کبوتر سے بھی زیادہ نازک تھی۔

"میرے اللہ اس نوں سختی ٹال دے۔ اس نوں حیاتی دے۔ میرے مالک اتے فضل چاہی والے۔" وہ زیر لب دعائیں مانگنے لگی۔

مزمل کو دروازے کی طرف بھاگتے دیکھ کر وہ اتنی تیزی سے اس کے تعاقب میں گئی۔ جب تک وہ کبوتر کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو سکی، اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ مزمل کا دھیان بٹانے کو وہ کہنے لگی۔

"چل میں تیرے نال کھیلتی ہوں۔ میں تیری گردن پہ گل چنڈو باندھ کے، تیرے پیروں میں پاسی پہنا کے تجھے بابو بنا دیتی ہوں۔ فیر تو انگریزی بولنا اور مجھ پہ رعب ڈال کے کہنا۔ ان پڑھ بڈھی عورت تجھے شہر والا کوئی سلیقہ نہیں۔ میں لاہور سے آیا ہوں، میں ہوں بابو جنٹل مین (جنٹل مین) اے بڑا مزے وار کھیل ہے۔"

مزمل کو یہ تجویز دلچسپ لگی تھی۔ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

حکیم بیگم نے گھنگرو کناری والا بڑا سفید رومال مزمل کے گلے میں لپیٹ کر مخصوص ڈھب کی گانٹھ دی اور کالے بوٹ اس کے پیروں میں پہناتے ہوئے بولی۔

"رومال گلے میں ڈال کے پورا شہری بابو لگ رہا ہے۔ میرا عمر وی ایسا ہی سوہنا لگتا تھا۔ جب وہ نکا تھا تو یہ کھیل اس نوں بڑا ہی پسند تھا۔ پر اب وہ بچہ نہیں رہا۔ کوئی بھی کھیل اس کو جہاز پر چڑھنے سے نہیں روک سکا۔"

اس کے دل کو کسی نے کھاری پانی والے کنوئیں میں ڈبو دیا۔ اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اسے خبر تھی کہ عمر دل سے امریکہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بس یہاں سے دور بھاگ رہا تھا۔ وہ لوٹ کر کب آئے گا؟ اس کے جانے سے پہلے ہی حکیم بیگم نے اس کے واپس آنے کا انتظار شروع کر دیا تھا۔

"اگر وہ مڑ کر نہ آیا؟ جس طرح آمنہ اور یوسف وہیں بس گئے ہیں۔ اگر میرا عمر بھی اس بے گانے ملک کا ہو گیا تو میں۔۔۔ رب! مجھے حوصلہ دے۔ میں بڑی کمزور ہوں۔ کمزور ہوں۔ میرے دل نوں طاقت دے۔"

چاک گھوم رہا تھا۔ حکیم بیگم عمدولا بنانے کے ارادے سے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے لگی۔ مزمل چھپری کی اولتی کے نیچے شغل کر کے کسی اسکول ماسٹر کی طرح اسے بے مفہوم باتیں سمجھا رہا تھا اور جواباً وہ یوں سر ہلائے جا رہی تھی کہ جیسے سب سمجھ رہی ہو۔ وہ شماتت کی انگلی اور انگوٹھے کے بیچ مٹی کی تنگ دیوار کو اوپر اور باہر کی سمت پھیلا رہی تھی۔ پھر اس نے مزمل کو رومال گردن سے نکال کر پھینکتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ اکتا گیا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا انار کے بوٹے کے نیچے پہنچا اور اچک کر ایک ڈالی تھام لی۔ وہ اس کے ساتھ لٹک کر جھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وے مزمل! سودائی نا بن۔ کچی ڈنڈی ہے ٹٹ جائے گی۔ تجھے چوٹ لگ جائے گی۔ نہ میرا سوہنا شہری بابو! آجا مجھ سے وہ سبق سن لے جو تو نے پڑھا ہے۔"

مزمل کو پچکارتے ہوئے اس کی توجہ تقسیم ہو گئی تو اسے پتا بھی نہ چلا کب اس نے برتن کی گمر پر انگوٹھے رکھے اور دونوں ہاتھوں کی چاروں انگلیوں کو ملا کر اندر کی جانب دبا دیا۔ جب اس کا دھیان چاک پر لوٹا تو ایک ٹیڑھے کناروں والا بدوضع کلسیا اس کے سامنے تھی۔ وہ بے یقینی سے اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

وہ تو عمدولا بنا رہی تھی۔ پھر یہ بینا کیسے بن گئی۔ اس کی نیت تو کچھ اور تھی۔ جو اس نے بنانا چاہا تھا، وہ کیوں نہیں بنا تھا۔ وہ بے ہنر تو نہیں تھی مگر بے دھیان تو نہ تھی۔ اس نے سوچا کہ مزمل کی بھاگ دوڑ سے اس کا ذہن بٹا تھا اسی لیے یہ چوک ہوئی تھی۔ لیکن پھر اس نے یہ خیال جھٹک دیا۔ کسی اور کو الزام دینے سے اس کا قصور کم نہیں ہوتا تھا۔

"میرے اللہ! میری ہر تقصیر نوں معاف کر دے۔ مجھ پہ پکڑ نہ کرنا۔ میرے سب قصوراں تے در گزر کر۔"

☆ ☆ ☆

آپا جی کو گزری رات عمر نے یہ ہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ کہیں جا رہی ہے۔ اس کی بے چینی اور دبا دبا جوش کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی وقت ضائع کیے بنا کہیں روانہ ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اور شاید یہ ارادہ اچانک ہی باندھا گیا تھا۔ رات کے کھانے پر اور صبح ناشتے کے دوران بھی آپا نے اس قسم کا کوئی اشارہ نہ دیا تھا۔ دس منٹ قبل اسے ایک فون موصول ہوا تھا جسے سن کر اس کے اندر ایک توانائی سی بھر گئی تھی اور وہ عجلت میں اپنے کام نمٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

عمر نے ناشتے میں استعمال ہونے والے برتن دھوئے، صحن میں جھاڑو دی اور اپنے ان دھلے کپڑے سرف کے محلول میں بھگو کر رکھنے کے بعد کمرے کے دروازے کے قریب کرسی بچھا کر اخبار پڑھنے لگا۔ وہ منتظر تھا کہ آپا اسے اپنی منزل کے بارے میں بتائے گی۔ اچانک جانے کی وجہ بیان کرے گی اور شاید اسے بھی ساتھ چلنے کو کہے گی۔ لیکن یہ آخری بات قرین از قیاس نہ لگتی تھی۔ اگر وہ اسے ساتھ لے جانے کا

ارادہ رکھتی تو اب تک اسے تیار ہونے کی ہدایت کر چکی ہوتی۔ اس کی عجلت زدہ حرکات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

عمر نے دو، چار بار اسے مخاطب کرنے کی کوشش بھی کر دیکھی۔ مگر وہ اتنی مگن تھی کہ ہاں 'اچھا' نہیں جیسے یک لفظی جوابوں سے زیادہ کچھ نہ بولی اور شاید وہ کہیں دور جارہی تھی۔ اسے پرانے سفری بیگ پر سے گرد جھاڑتے اور گیلے کپڑے سے صاف کرتے دیکھ کر ایسا ہی تاثر ملتا تھا۔

عمر نے اخبار تہہ کر کے قریب پڑی تپائی پر پھینکا اور پیروں کو چپلوں سے نکالتے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر انگڑائی لی۔ اسے بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ آپا سے اپنے امریکہ جانے کے بارے میں بات چھیڑ دے، حالانکہ اس موضوع پر بات کرنے کا یہ کوئی موزوں وقت نہیں تھا، لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ کوئی دوسرا وقت بھی موزوں نہیں تھا۔

اس نے کئی بار بھی اس سلسلے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ آپا کسی اور بات یا کسی اچانک یاد آجانے والے کام کا آسرا لے کر اس موضوع سے کنی کترا جاتی تھی۔

اس نے اتنا بھی نہ پوچھا تھا کہ عمر کا ویزہ کتنی مدت کا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ آپا کو اس معاملے سے کوئی دلچسپی تھی، مگر جانے کیوں وہ اس کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ چاہے وہ مخالفت ہی کرتی یا ناراضی اظہار کرتی کہ اسے یہ فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔

اتنے اہم معاملات کیا اپنی مرضی سے ہی طے کر لیے جاتے ہیں۔ بھلے وہ اتنا ہی کہہ دیتی کہ "میں تمہارے واپس آنے کا انتظار کروں گی۔" لیکن وہ تو یوں خاموش تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور یہ وہ خاموشی نہیں تھی جو لوگ ناراض ہونے پر اپنایا کرتے ہیں۔

کئی بار عمر کو لگا کہ آپا اس کے جانے کے خیال سے مطمئن تھی۔ شاید وہ بے جی کے گھر سے اسے لے کر آنے کے فیصلے پر پچھتاوے کا شکار تھی اور اپنی زبان سے اسے واپس جانے کا کہہ نہیں پاتی تھی۔ اگر ایسا تھا تو قسمت نے یاوری کی تھی۔ اس کی متوقع امریکہ یاترا نے یہ مسئلہ خود ہی حل کر دیا تھا۔ بھلے آپا کی رائے اور محسوسات عمر کے ارادوں پر کوئی اثر نہ رکھتے ہوں' لیکن وہ حیران تھا کہ وہ آپا کی زبان سے اظہار سننے کا اس قدر خواہش مند کیوں تھا؟

"آپا!" اس نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔ "میرے امریکہ جانے کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔"

"اچھا۔ تو؟"

کیسا لاتعلق انداز تھا۔ اگر اس نے بازار میں کسی شے کے نرخ بڑھنے کا تذکرہ کیا ہوتا تو بھی یقیناً "اچھا۔ تو؟" سے زیادہ کچھ سننے کو نہ ملتا۔

آپا بستر پر چند ملبوس پھیلائے شاید ان میں سے انتخاب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

عمر کو کچھ اور نہ سوجھا' جب کوئی اپنی ماں پر دنیا کے دوسرے کونے میں جانے کا ارادہ ظاہر کرے اور جواب میں "اچھا۔ تو؟" سے آگے کیا کہا جاتا ہے۔

"چند دنوں میں ٹکٹ بھی کنفرم ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" آپا نے ایک سوٹ اٹھا کر ہینگر میں ڈالا اور دائیں رخ پر بیٹھ کر عمر کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس نے لوہے کی الماری کے پٹ کھلنے اور چند لمحوں بعد بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے آپا کے کمرے کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ آپا کے الماری سے پلٹ کر دوبارہ بستر کے پاس آنے کے وقفے میں وہ خاموش رہا۔ اب وہ باقی بچے ہوئے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر جانچ رہی تھی۔ اس کے انداز میں عدم اطمینان اور ناپسندیدگی تھی۔

"یوسف بھائی اور آمنہ باجی آپ کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ اگر ہو سکے تو آپ ان سے بات کر لیجیے گا۔ میں نے بتایا تھا کہ ان کی بیٹی پری میچور پیدا ہوئی ہے۔ اس کی حالت بہت تشویش ناک ہے۔ شادی کے بیس سال بعد اولاد ہوئی ہے۔"

"میں کر لوں گی بات۔" آپا نے ایک اور سوٹ کا گولا بنا کر اسے بستر کی پائنتی کی جانب اچھال دیا۔ وہ جھنجلائی ہوئی لگتی تھی۔

عمر کوئی اور فقرہ کہنے کی سر توڑ جدوجہد کر رہا تھا۔ خاموشی اس کی بے چینی میں اضافہ کر رہی تھی۔

"میں سوچ رہا تھا کہ مجھے وہاں جانے کے لیے کپڑے' جوتے اور جو دوسری چیزیں درکار ہیں' وہ ایک دو دن میں خرید لاؤں۔ مجھے خود سے خریداری کرنے میں ہمیشہ دشواری ہوتی ہے۔ آپ کے پاس جب وقت ہو مجھے بتا دیجیے گا۔ میں آپ کو ساتھ لے کر بازار جاؤں گا۔"

آپا نے آخری لباس کو بھی ہاتھ سے پرے ہٹایا اور گویا خود کلامی کی۔

"معلوم نہیں اسلام آباد کا موسم کیسا ہو گا۔ میں تو کبھی وہاں گئی نہیں۔ مری' نتھیا گلی وغیرہ وہاں سے بالکل قریب ہیں اور ان علاقوں میں برف باری کا آغاز ہو چکا ہے۔ عین ممکن ہے اسلام آباد میں بھی سردی بڑھ گئی ہو۔ مجھ سے سردی بالکل برداشت نہیں کی جا سکتی۔ میرے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں سن ہو جاتی ہیں۔ پچھلے موسم کے گرم کپڑوں میں سے کوئی ایک بھی اس قابل نہیں کہ اسے پہن کر گھر سے نکلا جائے۔ عمر! تم اس طرح کرو کہ عائشہ درزن کے گھر جا کر میرے سوٹ کا پتا کرو۔ اس نے آج دوپہر کا وعدہ کیا تھا لیکن شاید ہی سیا ہو۔ اسے کہنا کہ ایک گھنٹے تک تیار کر سکتی ہے تو بڑی مہربانی ہو گی۔ تم نے اس کا گھر تو دیکھ رکھا ہے نا! ساتھ والی گلی میں ہے۔ دروازے کے سامنے بجلی کا کھمبا لگا ہے۔ اگر نہ ملے تو کسی سے پوچھ لینا' جلدی پہنچ جاؤ۔"

عمر کرسی سے اٹھ گیا' لیکن اس کے قدم وہیں جمے رہے۔ "آپ اسلام آباد جا رہی ہیں؟"

"ہاں۔ بس کل رات یا زیادہ سے زیادہ پرسوں صبح تک واپس آجاؤں گی۔"

"لیکن آپ اکیلی کیوں جا رہی ہیں۔ میں فارغ

ہوں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"
"میں نے کب کہا میں اکیلی جا رہی ہوں؟"
"تو؟"
"شوکت صاحب کے ساتھ جاؤں گی۔"
عمر کی پیٹھ پر کسی نے خاردار کوڑا کھینچا تھا۔ جسم کو کاٹتی ہوئی جلن اس کے روم روم میں بھر گئی۔
"کس سلسلے میں؟" اس نے اتنی اونچی آواز میں پوچھنے کا ارادہ ہرگز نہیں کیا تھا۔
آپا نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔
"کیا اسکول کا کوئی کام ہے؟ کوئی تفریحی ٹرپ وغیرہ۔" اپنے لہجے کا اثر زائل کرنے کے لیے اس نے اضافہ کیا تھا۔
"نہیں۔ ایک خالصتاً نجی نوعیت کا کام ہے۔ میں اگر تمہیں تفصیل بتاؤں گی۔" اسے لگا کہ ایسا کہتے ہوئے آپا مسکرائی تھی۔
"ابھی بالکل وقت نہیں ہے۔ شوکت صاحب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ تم عائشہ کی طرف چلے جاؤ۔ سیلنے چھوڑنے والا مکان ہے اور دروازے پر بجلی کی گھنٹی ہے۔ موسم اچھی طرح ہے کام کی اور وہ سلائی مشین کے پیچھے بھی رکھ دی ہے جاؤ۔"
عمر اپنی جگہ سے ایک قدم نہیں سرکا۔ "آپ اور شوکت صاحب اکیلے جا رہے ہیں؟"
اس بار آپا کی مسکراہٹ واضح تھی۔ "جب ہم دونوں اکٹھے جا رہے ہیں تو اکیلے کیسے ہوئے؟" وہ مذاق بھی کر سکتی تھی۔ عمر کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا۔
"میں یہاں اکیلا کیا کروں گا؟ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"
"نہیں۔ تم ساتھ نہیں جاؤ گے۔ میں کب لمبی مدت کے لیے جا رہی ہوں۔ صرف ایک رات کی ہی تو بات ہے۔" آپا کا انداز قطعیت بھرا تھا۔
"تم اب چلے بھی جاؤ۔ وہ عائشہ کہیں گھر سے نہ نکل جائے اور تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا مجھے سوئٹر اور دستانے ساتھ لے جانے چاہئیں؟ کیا خبر وہاں ٹھنڈ زیادہ ہو مجھے سردی سے نفرت ہے۔"

☼ ☼ ☼

بھیگے پنکھوں والے راج ہنس جیسا دن تھا۔ اجلا سفید اور سیلا سیلا۔ رات بھر مینہ کا جھکڑ لگا رہا تھا۔ صبح کے قریب آسمان پر سے بادلوں کے آخری ٹکڑے تک غائب ہو گئے تھے اور نکھرا نیلا آسمان کسی تازہ دھلے ہوئے پارچے کی مانند پھیلا تھا۔ یہ بارش جاڑے کے آغاز کا پیغام ثابت ہوئی تھی۔ ایک رات میں ہی موسم کے تیور بدل گئے تھے۔
خنک ہوا کا جھونکا عمر کے تن سے لپٹ کر گزرا تو اسے احساس ہوا کہ وہ آدھی آستینوں والی قمیص موسم کے نئے چلن کے لیے موزوں نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے ماتھے اور ہونٹوں پر انگلیاں پھرائیں۔ اسے اپنی جلد غیر معمولی حد تک گرم لگی تھی۔ اسے بخار ہو رہا تھا۔ حلق کی کڑواہٹ اور سردی کا بڑھتا ہوا احساس اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے۔
وہ کسلمندی سے اٹھ کر آپا کے کمرے میں آیا اور ان کی درازوں میں رکھی ہوئی چھوٹی ڈائری نکال کر وہ نمبر ڈھونڈنے لگا جو آپا جاتے ہوئے کسی ورق پر لکھ گئی تھیں۔
نصرت چوہدری نام کے نیچے اسلام آباد کے ڈاکخانہ کوڈ کے ساتھ لکھا ہوا نمبر اسے تھوڑی سی تلاش کے بعد مل گیا تھا۔ وہ شوکت صاحب کے بھائی کی رہائش گاہ کا ہی فون نمبر تھا جو آبپارہ ٹاؤن میں واقع تھی۔ اگر آپا ایک اور رات وہاں رہنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں تو اب تک اسے لوٹ آنا چاہیے تھا یا کم از کم واپسی کے لیے روانہ ہو چکی ہوگی۔ عمر وہاں ٹیلی فون نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مزید انتظار اس کے بس کی بات نہ تھی۔ فون کسی لڑکی نے اٹھایا تھا۔
"یہ نصرت چوہدری صاحب کا گھر ہے؟" عمر نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔
"جی۔ آپ کون؟"
"شوکت صاحب اور میری آپی آپ کے گھر آئی ہوئی ہیں۔ کیا وہ ابھی ادھر ہی موجود ہیں۔"
"نہیں۔ شوکت چاچو اور ان کے ساتھ آنے والی آنٹی تو کل شام کو ہی چلے گئے تھے۔"
"کل شام کو؟" عمر نے تھوک نگل کر کہا۔ "کیا وہ واپس لاہور چلے گئے ہیں؟"
"نہیں۔ وہ مری گئے ہیں۔"
"مری کیوں گئے ہیں۔ وہاں تو بہت سردی ہوتی ہے؟" عمر کو پتا بھی نہ چلا اور اس کی زبان سے پھسل گیا۔
"کیا مطلب؟" لڑکی کے انداز میں الجھن تھی۔ "وہ کس لیے مری گئے ہیں؟"
"اگر آپ میرے ابو سے بات کرنا چاہتے ہیں تو میں انہیں بلا دیتی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟"
عمر نے کچھ کہے بنا فون بند کر دیا تھا۔ اس کے بدن میں ہونے والا خفیف درد اچانک شدت پکڑ گیا تھا۔ اس کے حلق میں ایسا کڑوا پن تھا جیسے کسی نے دھتورے کی پھانک نگل لی ہو۔ کنپٹیوں میں دھڑکتی ہوئی رگیں اسے کراہنے پر مجبور کر رہی تھیں۔
شام ڈھلنے تک اس کا بخار اتنا تیز ہو چکا تھا کہ نتھنوں میں سے گزرتی ہوئی سانس کھولتی بھاپ ایسی گرم ہو گئی۔ شدید پیاس کے باوجود اس نے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیا۔ اس لیے نہیں کہ بخار کی دی ہوئی نقاہت نے اس سے اٹھنے چلنے کی سکت چھین لی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ پانی پینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ جب کبھی وہ حکیم بیگم سے روٹھ جاتا تھا تو کھانا پینا چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اب تو وہ زندگی سے ہی روٹھا ہوا تھا۔
رات جانے کتنی بجی تھی اور وہ سوتی کیفیت میں ٹھہر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ وہ بمشکل خود کو گھسیٹتا ہوا آپا کے کمرے تک گیا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ ریسیور اتنا ٹھنڈا تھا کہ اسے چھوتے ہوئے عمر کو جھرجھری آ گئی۔
"عمر! میں کل شام تک آ جاؤں گی۔ میں اس وقت نتھیا گلی میں ہوں۔ یہاں مسلسل برف باری ہو رہی ہے۔ میں نے نو بجے والے خبرنامے میں سنا ہے کہ لاہور میں بھی بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ کیا وہاں بھی ٹھنڈ ہو گئی ہے؟"
"ہاں ہو گئی ہے۔" عمر نے بدقت خود کو جواب دینے پر مائل کیا۔ "آپ کو تو ٹھنڈ سے نفرت ہے۔"
اگر آپا نے سنا تھا تو بھی اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔
"مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ سردیوں کا کوئی بھی بستر ابھی تک نہیں نکلا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ایک ہی دن میں موسم یکدم تبدیل ہو جائے گا۔ اچھا تم ایسا کرو کہ اسٹور میں پیٹی کے اوپر جو بڑا ٹرنک رکھا ہے اس میں ایک گرم چادر رکھی ہے۔ تم وہ نکال لو۔ ٹرنک کے تالے کی چابی سلائی مشین کے خانے میں ہوگی۔"
اور آپا نے کوئی بھی جواب لیے بنا رابطہ منقطع کر دیا تھا۔
"میں سردی بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں سن ہو جاتی ہیں۔" آپا کی آواز جیسے اندھیرے میں کسی بھٹکے ہوئے پرندے کی مانند پھڑپھڑا رہی تھی۔ جب اسے سردی سے نفرت تھی تو وہ برف باری کے دوران مری کیسے چلی گئی؟ وہ تو سوئٹر اور دستانے بھی ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ پھر ایسی ٹھنڈ کو برداشت کرنے کی ہمت اس کے اندر کہاں سے آ گئی؟
کھلے دروازے سے آتی سرد ہوا نے عمر کے نقاہت زدہ جھلستے ہوئے بدن میں جھرجھری دوڑا دی۔ وہ اتنی بری طرح کانپ رہا تھا کہ اسے سیدھا کھڑا ہونے میں دشواری ہو رہی تھی۔
اس کی پسلیوں میں ہونے والے درد کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ سردی اور پیاس سے مزید مزاحم ہونا اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ وہ باورچی خانے میں آیا اور نل کھول کر پانی کا گھونٹ بھرا۔ اسے لگا کسی نے اس کی چھاتی میں لوہے کی سلاخ سے ضرب لگائی ہو۔ اس نے نل کے نیچے سے منہ ہٹا کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ پگھلی ہوئی برف جیسے پانی نے اس کی سانس الٹا دی۔

تھی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی کھڑا ہاتھ سے سینے کو مسلتا رہا پھر جی کڑا کر کے بہتے ہوئے پانی پر چہرہ جھکایا۔

"تمہاری ماں جب ادھر آئی تو وہ پیٹ گرانا چاہتی تھی۔"

ماسی پھوماں کے ہونٹوں سے اڑنے والے تمباکو ملے تھوک کے چھینٹے عمر کے منہ پر گرے۔

اس کے کھلے ہونٹوں اور دانتوں سے ٹکرا ٹکرا کر اچھلتی ہوئی پانی کی بوندیں کنکروں کی مانند اس کے چہرے پر گر رہی تھیں۔ پانی پینے کے بعد اس کی کپکپی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ باہر آسمان سے پھر پھوار برسنے لگی تھی۔

"کیا مری میں اس وقت بھی برف باری ہو رہی ہوگی؟"

"خالصتاً" نجی نوعیت کا کام ہے۔ جب ہم دونوں جا رہے ہیں تو اکیلے کیسے ہوئے۔" آپا کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

اس نے کبھی آپا کو کھل کر ہنستے نہیں دیکھا تھا لیکن تصور میں اس کی گونجتی ہوئی ہنسی ایسی وضاحت سے در آئی تھی جیسے وہ سینکڑوں بار اس منظر کو دیکھ چکا ہو۔ خود کو بارش سے بچاتے ہوئے حتی المقدور تیزی کے ساتھ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اسٹور بالائی منزل پر تھا اور چھت پر لے جانے والی سیڑھی کے آٹھ قدمچے تھے۔ سیڑھیاں چھت سے ڈھکی ہوئی نہیں تھیں اور یہاں بھی وہ بارش کی دسترس سے محفوظ نہیں تھا۔

"آپا کسی کمرے کی کھڑکی سے برف باری کو دیکھتی ہوگی یا کھلے آسمان تلے گھومتے ہوئے اس تجربے سے گزر رہی ہوگی۔ برف گرتی کیسے ہے؟" اس نے خود سے پوچھا۔

"دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی صورت یا بھر بھرے سنوف کی طرح؟ کیا آپا کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں سن ہو گئی ہوں گی؟"

اس نے برف باری کے مناظر صرف ٹیلی ویژن پر دیکھ رکھے تھے۔ عمر نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔

"شوکت کی تو اسے دیکھ کر رال ٹپکتی ہے۔ گندا بنا کردار ہے۔"

کچھ عرصہ پہلے آپا کے اسکول کے فی میل اسٹاف روم میں دو عورتوں کے درمیان ہونے والی گفتگو جو اس نے کمرے کے کھلے دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے سنی تھی' اسے یاد آنے لگی' وہ اسے بھولا ہی کب تھا۔ وہ تو بس بھرے زنبور تھے' جو ہر دم اس کے کانوں میں بھنکتے تھے۔ بوندوں سے بچنے کے لیے اس نے تیزی سے اگلا قدم اٹھایا۔ شاید بارش سے بچنا اتنا ضروری نہیں تھا' جتنا ان آوازوں سے بھاگنا۔

"دونوں آفس میں گھسے کھڑکیاں دروازے بند کر کے گھنٹوں کیا کرتے رہتے ہیں۔"

بھڑوں کے زہریلے پروں کی تھرتھراہٹ اس کے کانوں میں گھسی جاتی تھی۔ اس نے تیسرے زینے پر پاؤں دھرا۔

"مجھ سے جب ماسی حنیفاں پوچھتی ہے باجی جی! صفائی ٹھیک ہوئی ہے تو میں کہتی ہوں کیا خاک ٹھیک ہوئی ہے گند سے تو اسکول بھرا پڑا ہے۔"

چوتھا زینہ اس کے پاؤں تلے آ گیا۔

"ایک بار وہ شوکت سے ملنے اسکول آئی اور بغیر دستک دیے آفس کا دروازہ کھول دیا۔ جانے اندر کیا دیکھا کہ الٹے قدموں لوٹ گئی۔ یہ موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے بہتے تھے۔"

اس کا پیر پانچویں سیڑھی کو چھو رہا تھا۔

"میں قسم کھا کر کہتی ہوں' شگفتہ نے اسی وجہ سے زہر پھانک لیا۔"

عمر اتنے ہی مشقت سے بدحال ہو گیا تھا۔ اس نے منوں وزنی قدم گھسیٹ کر چھٹے زینے پر رکھا۔

"یہ ناجائز ہے۔ اس کی ماں نے منہ کالا کیا' پر اس کا منہ تو گورا ہے۔"

اس کا اسکول ماسٹر نسوار کا بیڑا گال میں دبائے گھٹی ہوئی ہنسی کے ساتھ جماعت کے سب لڑکوں کو بتا رہا تھا۔

ساتویں زینے پر پاؤں دھرے بنا اس نے آخری قدمچے پر چڑھنے کی کوشش کی۔ اسے زوردار ٹھوکر لگی

تھی۔ بمشکل اس نے خود کو گرنے سے بچایا۔
"ایسی کوٹھیوں کے پیچھے کون آتا ہے۔ عاشق چار دن دل خوش کر کے چھوڑ جاتے ہیں اور وارث ڈھونڈ لیں تو گلا اتار دیتے ہیں۔"

ماسی پھوماں کے حقے کی چلم الٹ گئی تھی اور سارے کوئلے اس پر آن گرے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

اسٹور میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے اندازے سے دیوار کو ٹٹولتے ہوئے سوئچ تلاش کر کے بلب جلایا۔ سلائی مشین پیٹی کے اوپر ٹرنک کے ساتھ ہی رکھی تھی۔ کچھ تردد کے بعد ٹرنک کی چابی دستیاب ہو گئی تھی۔ تالا کھول کر وہ گرم چادر تلاش کرنے لگا۔ وہ نئے پرانے کپڑوں کے ساتھ ایک کونے میں ٹھنسی ہوئی مل گئی تھی۔

چادر نکالتے پر اس کی نظر ان ویڈیو کیسٹس پر پڑی جو چادر کے نیچے ہونے کے باعث پہلے پوشیدہ تھے۔ اس نے ایک کیسٹ کے ٹائٹل پر نظر دوڑائی۔ وہ ایک انگلش فلم تھی اور عنوان سے ہی ظاہر تھا کہ وہ کس نوعیت کی ہوگی۔ اس نے ایک ایک کر کے سب کیسٹس کے نام دیکھے تھے۔ ان میں سے اکثریت ایکس ریٹڈ (کم سنوں کے دیکھنے کے لیے نا موزوں) فلموں کی تھی۔

اسے وہ دوپہر یاد آئی جب ایسی ہی ایک فلم ڈھونڈنے کی خاطر آپا شام تک لاہور کی سڑکوں پر خوار ہوتی پھری تھی۔ آنکھوں میں ہوتی جلن نمی بن کر اس کی بینائی کو دھندلا رہی تھی۔ پلکیں جھپک کر اس نے آنکھوں میں جمع ہونے والے پانی کو بہہ جانے دیا۔

ویڈیو کیسٹس ہٹاتے ہوئے اس کا ہاتھ کسی سرد اور ٹھوس دھات سے ٹکرایا تھا۔ انگلیوں سے محسوس کرتے ہوئے عمر نے اس شے کو باہر نکال لیا۔ وہ کانچ سے بنی ہوئی ایک شش پہلو صندوقچی تھی جس میں کچھ سامان تھا۔ صندوقچی کے اوپر ایک خط کا لفافہ رکھا تھا جو صندوقچی کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ اس نے وہ لفافہ صندوقچی کی چھت سے علیحدہ کیا تو کانچ پر لکھے ہوئے حروف اس کی نظروں کی گرفت میں آ گئے۔

"اسنو وائٹ جو ایک بادشاہ کی بیٹی تھی۔"

عمر نے بلوریں ڈبہ ایک طرف رکھ دی اور لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لفافے پر ایک پتہ درج تھا اور اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے اندر ہاتھ ڈال کر تہ شدہ کاغذ باہر کھینچ لیا۔ کاغذ کی تہیں کھول کر وہ تحریر پر نظر دوڑانے لگا۔ وہ آپا کا تحریر کردہ خط تھا لیکن عمر کو جو امید دکھائی دی تھی کہ وہ اس کے باپ کے نام لکھا گیا ہوگا، باطل ثابت ہوئی تھی۔ خط کا مخاطب کوئی اور شخص تھا اور آپا کا اس سے گہرا ربط تھا۔ خط کا مضمون اس بات کا گواہ تھا۔

"مجھے بات کس طرح شروع کرنی چاہیے۔ میں نہیں جانتی۔ اپنے مکروہ جرموں کا احوال بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ کے چناؤ میں تھوڑی بہت دقت ہو تو قدرتی سی بات ہے۔

میں تم سے یا کسی اور سے معافی نہیں مانگوں گی۔ معافی میرا علاج ہرگز نہیں ہے۔ میرا مرض جس نوعیت کا ہے، اس میں دھتکار، گالیوں اور بد دعاؤں سے ہی راحت ملتی ہے۔ اگر تمہارے پاس تھوڑا وقت ہو تو میرے لیے بد دعا کرنا۔ مجھے ہر اس برے نام سے پکارنا جو تمہارے علم میں ہو اور میری ماں سے کہنا وہ بھی ایسا ہی کرے۔

اگر تمہیں یہ جان کر کچھ تسکین محسوس ہو تو میں بتا دیتی ہوں کہ جس شخص کے لیے میں نے تم لوگوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا اس نے میرے منہ پر تھوک دیا، نہیں تھوکا نہیں تھا، مجھے ایسا لگا تھا کہ میرے منہ پر تھوکا گیا ہے۔ مجھے لمحہ بھر بھی اس کا ساتھ نہیں ملا۔ مجھے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ میرا باپ مر چکا ہے۔ ظاہر ہے میں ہی تو اس کی موت ہوں۔ مجھے کیوں معلوم نہیں ہوگا۔

جس رات میں نے گھر چھوڑا، شاید مجھے لکھنا چاہیے کہ گھر سے بھاگی، لیکن میں ابھی تک اپنے لیے ہمدردی رکھتی ہوں۔ کیا کروں برے لفظ خود سے جوڑتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تم میری اس ریاکاری کو برداشت کرنے کی کوشش کرنا۔ یہاں تو اس رات میں اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کا گلا گھونٹ کر نکلی تھی پھر بھی تصدیق کی خاطر میں کچھ عرصہ بعد اپنے محلے میں گئی تھی اور منہ چھپا کر آ گئی تھی۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ میری شکل اب بھی اس لائق ہے کہ وہ کسی کو دکھائی جا سکے؟ تم ہمیشہ کہتے تھے کہ میں بڑی خوب صورت ہوں۔ میری آنکھیں ایسی ہیں، میرے ہونٹ ویسے ہیں، میری رنگت، میری ناک، میرے بال، میری گردن، تم تعریف کرنے لگتے تو تمہیں رکنا ہی بھول جاتا تھا۔

تمہیں سن کر مجھے لگتا کہ تم مبالغہ کر رہے ہو لیکن مجھے اچھا لگتا تھا۔ میرا دل چاہتا تم بولتے ہی جاؤ، مجھے سراہتے ہی رہو۔

میں قسم کھا کر کہتی ہوں اب آئینہ دیکھتی ہوں تو گھن آتی ہے، میں نے اتنا بھیانک چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ میں بتا رہی تھی کہ میں چہرہ ڈھانپ کر اپنے محلے میں گئی تھی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ میرا باپ سچ مچ مر گیا ہے اور میری ماں وہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔

وہ شاید دانیال بھائی کے گھر گئی ہوں گی یا پھر تایا ابو کے گاؤں، وہ جہاں بھی ہیں، میں بھی ان کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔ اگر ہو سکے تو مجھے اتنا بتا دینا کہ کیا وہ زندہ ہیں اور مجھے ڈھونڈنے کی غلطی کبھی نہ کریں۔ گندگی دبی رہے تو اچھا ہے، اسے کرید کر نکالیں تو تعفن کے سوا کیا ملے گا؟

میں یہ خط تمہیں کسی دوسرے شہر سے پوسٹ کروں گی۔ اور جانے پوسٹ کروں گی بھی یا نہیں۔ اگر میں یہ خط تمہیں بھیج بھی دوں تو بعد میں کبھی فون کروں گی۔ پہلے خط اس لیے لکھ رہی ہوں کہ فون پر ان میں سے کوئی بھی بات میری زبان سے ادا نہ ہو سکے گی۔ میں کچھ اور بھی لکھنا چاہتی ہوں لیکن کیا؟ مجھے سمجھ نہیں آتا۔"

ان چند سطروں کے بعد باقی ورق خالی تھا۔ ایک کونے میں لکھی ہوئی تاریخ دس سال پہلے کی تھی۔ عمر نے کاغذ کو دوبارہ تہہ لگائی اور کچھ سوچ کر لفافے سمیت اس خط کو ٹراؤزر کی جیب میں ڈال لیا۔

پھر وہ اس کانچ کے ڈبے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا ڈھکن کھولنے پر ایک مانوس بو ناک سے ٹکرائی۔ ایسی بو جیسی مزاروں پر یا قبرستانوں میں آیا کرتی ہے۔ باسی پھولوں کی بو جس میں مرنے والوں کی موت کا غم اور یاسیت رچی ہوتی ہے۔ ایک پھولا ہوا زرد لفافہ جس کی لمبائی ڈبے کی بالشت بھر طوالت سے زیادہ تھی، توڑ موڑ کر اندر ٹھونسا گیا تھا۔ عمر نے وہ پلندہ کھینچتے ہوئے ڈبے سے جدا کیا تو اسے زرد لفافے کے پیچھے ایک ریشمی پارچے میں لپٹی کچھ پتیاں اور تنکے دکھائی دیے جو چھونے پر راکھ کی طرح بکھر گئے تھے۔ یقیناً ان ہی کی موجودگی نے بند ڈبے کو اس باس سے معمور کر رکھا تھا۔

اس نے زرد لفافے کے اندر بھرے ہوئے کاغذات باہر نکال لیے۔ کچھ لمحوں کے لیے اسے اعتبار ہی نہ آیا کہ وہ کیا دیکھ رہا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر کسی بت کی مانند ساکت کھڑا تھا۔ جانے اور کتنی دیر وہ اس جگہ سے [illegible] کی تیز غراہٹ اسے چونکا نہ دیتی۔ شاید وہ بلیاں آپس میں لڑ رہی تھیں اور ان کے اچانک غرانے کی آواز نے عمر کو ڈرا دیا تھا۔ جسم کو لگنے والے خفیف جھٹکے کو وہ روک نہیں پایا تھا۔ دیواروں پر سرسراتی نم آلود ہوا کے ساتھ اسے اپنے سانس لینے کی اونچی آواز سنائی دیتی تھی۔

اس نے وہ پورا کر اک رسالہ واپس لفافے میں ڈالا اور لفافے کو شیشے کی صندوقچی میں بند کرنے کے بعد ٹرنک میں اس کی سابقہ جگہ پر رکھ دیا۔ اس کی پسلیوں کو جیسے کسی رسی سے کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ درد کی ٹیس اٹھتی تھی۔ مزید کھڑے رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ سوکھے پتے کی طرح کانپتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔

کیا یہی وہ قیامت تھی جس کا اللہ نے وعدہ کیا تھا۔ کسی کی اپنی اپنی قیامت ہوتی ہے۔ جب گھاس کے تنکے پر بارش کی ایک بوند گرتی ہے تو تنکے پر بیٹھی ہوئی

چیونٹی کا یہی سمجھتی ہوگی کہ کائنات فنا ہونے لگی ہے۔ وہ ایک بوند اس چیونٹی کی قیامت ہوتی ہے۔

نتھنوں سے پھیپھڑوں میں کھینچے والی ہوا اسے ناکافی لگ رہی تھی۔ وہ منہ کھول کر لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔

"تو نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا۔ جب میرے ہونے سے اس دنیا میں کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تو میرے نہ ہونے سے کیا فرق پڑ جاتا۔ جب میری ماں۔۔۔"

اس عورت کے لیے وہ لفظ استعمال کرتے ہوئے عمر کے دل میں ایسی کراہیت پیدا ہوئی کہ وہ خود بھی اس کی شدت پر حیران رہ گیا۔

"جب وہ میری پیدائش سے پہلے مجھے مار دینا چاہتی تھی تو تو نے بے حسی کے دل میں یہ بات کیوں نہ ڈالی کہ وہ اس کی مرضی مان جاتی۔ تو نے میرے لیے اتنی تکلیف بھری زندگی کیوں منتخب کی؟ میں نے کیا خطا کی جس پر تو اتنا ناراض ہے۔ میں نے تیری رضا کے لیے تیری خوشی کی خاطر وہ سب کیا جو میرے بس میں تھا۔ تیری ناراضی سے بچنے کی حتی المقدور کوشش کرتا رہا۔ پھر میری کس غلطی پر تو روٹھ گیا ہے؟ تو نے میرے لیے ایسی ذلت کو کیوں چنا؟ تو نے اس عورت کو میری ماں کا درجہ دیا جو اپنے منہ زور نفس کے ہاتھوں پاگل ہو رہی ہے اور اپنے پاگل پن میں مجھے اتنی چوٹ پہنچا رہی ہے جو میری برداشت سے باہر ہے۔ تو نے مجھے یتیم پیدا کر دیا ہوتا پر دنیا میں بے عزت نہ کرتا۔ تو نے مجھے کوڑے کا ڈھیر بنا دیا، جس پر غلاظت پھینکنا سب کا حق ہوتا ہے۔"

سانس لینے میں دقت کے باعث اس کے تالو اور زبان میں اکڑن پیدا ہو گئی تھی۔

"تیری رضا کیا ہے؟ تیری چاہت مجھے سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میرے اللہ! یہ حواس چھین لینے والا درد ہے۔ یہ مجھے یوں کاٹتا ہے جیسے کسی رستے ہوئے زخم میں کیڑے پڑ گئے ہوں۔ اس کو سہہ جانے کی ہمت میں کہاں سے لاؤں؟ مجھ پر رحم کر۔ میں اس درد سے عاجز ہوں، مجھے نجات دے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے بہنے لگے۔ اس نے بازو لمبا کر کے پیٹی کے کنارے سے لٹکی ہوئی اونی چادر گھسیٹ کر خود کو اس سے ڈھانپ لیا اور وہیں فرش پر بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کر کے گھٹنوں پر سر گرا دیا۔

کسی کے قدموں کی چاپ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ شاید تایا واپس آئی تھی۔ اس نے چہرے پر سے چادر ہٹا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ دن کی روشنی در و دیوار پر قابض ہو چکی تھی۔ اتنا وقت اس نے نیم بے ہوشی کی حالت میں گزارا تھا۔ آنے والی مسز سوزین تھی اور دروازے کے بیچ کھڑی آنکھوں میں حیرانی سموئے اسے دیکھ رہی تھی۔

"عمر! تم کب سے یہاں ہو؟ کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تم یہاں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟"

وہ خاموش رہا اور فرش پر ہتھیلیاں جمائے ہوئے اٹھ کر اپنے کپڑوں اور چادر پر لگی گرد جھاڑنے لگا۔ اس کا جسم اب بھی دھیرے دھیرے لرز رہا تھا اور شاید مسز سوزین نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ تیزی سے آگے آتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

"تمہاری آنٹی کہاں ہیں؟ میں ان ہی سے ملنے آئی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور دستک کا کوئی جواب بھی نہیں ملا تھا۔ اس لیے میں پریشان ہو کر خود ہی اندر آ گئی۔ سارا گھر خالی اور سب دروازے چوپٹ دیکھ کر میرا تو سر چکرانے لگا تھا۔ مایوس ہو کر میں لوٹنے ہی والی تھی کہ مجھے سیڑھیوں کے اوپر اسٹور کا دروازہ کھلا ہوا نظر آ گیا۔ تم نے دروازہ کیوں کھلا چھوڑا بیٹا! یہ خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"میرے پاس ایسا کیا ہے، جس کے کھو جانے کا ڈر ہو۔"

اس کی تلخ بڑبڑاہٹ پر مسز سوزین نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔ کیسا اترا ہوا چہرہ ہے۔" نزدیک آ کر اس نے عمر کی پیشانی چھوئی اور پریشان ہو گئی۔ "کتنا تیز بخار ہے، تمہارا تو جسم جل رہا ہے۔ تم کیوں اس طرح فرش پر بیٹھے تھے، کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"کوئی جاننے کے لائق بات نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" مسز سوزین اسے سہارا دیتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب لے جانے لگی۔

"بس رات کو مجھے ٹھنڈ لگی تو میں گرم بستر ڈھونڈنے کی خاطر اسٹور میں آیا اور یہاں مجھے چکر آ گیا یا شاید پاؤں پھسل گیا تھا، ٹھیک سے یاد نہیں۔"

"اور تمہاری آنٹی کہاں ہیں؟"

عمر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"جاتے ہوئے یہ دروازہ بند کر کے جائیے گا۔ مجھے روشنی اچھی نہیں لگ رہی۔"

"اگر تم خود چل کر کلینک تک نہیں جا سکتے تو میں ڈاکٹر کو یہاں بلا لیتی ہوں۔ اور ناشتے میں کیا لو گے جو بھی چاہو مجھے بتا دو، میں بنا دوں گی۔"

عمر نے آنکھیں نہیں کھولیں اور کروٹ بدل لی۔

"مجھے ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بخار میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ چلی جائیں میں ٹھیک ہوں۔"

اور وہ سچ کہہ رہا تھا، وہ بخار نہیں تھا جو اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔

اس کے لاکھ انکار کرنے پر بھی مسز سوزین ڈاکٹر کو بلا لائی تھی اور اس کے لیے ناشتہ تیار کرنے کے بعد گئی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد عمر آہستگی سے اٹھا اور چارپائی سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھا خلا میں گھورتا رہا اور پھر وہ سب باتیں اسے پوری شدت سے یاد آنے لگیں جنہیں بھول جانے سے بڑی راحت دنیا میں کوئی نہیں تھی۔ وہ کون سا منتر تھا جسے پھونک کر ان سب یادوں کو مٹایا جا سکتا تھا۔ کاش سنگسار ہونے والے کو معلوم ہوتا کہ کس اسم کو پڑھنے سے پتھر مارنے والے ہاتھ رک جاتے۔ مگر سنگسار ہونے والے کی زبان میں ہلنے کی طاقت ہی کہاں ہوتی ہے۔

کچھ جذبے اس کے دل میں سیندھ لگا کر در آئے تھے اور سیندھ لگا کر آنے والے کی نیت کبھی اچھی نہیں ہوتی۔ وہ دکھتے ہوئے سر کے ساتھ بیٹھا سوچتا رہا، پھر اٹھ کر گھر میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

باورچی خانے سے اسے ایک استعمال شدہ پلاسٹک کا گیلن مل گیا تھا۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے چل کر بازار گیا اور گیلن میں پیٹرول بھروا کر واپس آیا۔ اب اسے تایا کے لوٹنے کا انتظار تھا۔

(باقی آئندہ)

عنیقہ محمد بیگ

دل کے آئینہ

"فرحت! جب مجھے عمر کی پہلی شادی کا معلوم ہوا ۔۔۔ اور پتا چلا اس کی پہلی بیوی سے ایک بیٹی بھی ہے ۔۔۔ تو میں گھبرا گئی تھی ۔۔۔ کہ تم اپنی زندگی کا کیا فیصلہ کرتی ہو ۔۔۔ کیونکہ ایک بیٹی کی ماں تم بھی تھیں ۔۔۔ مگر تم نے سمجھداری سے فیصلہ کیا ۔۔۔ بن ماں کی بچی کو اپنی بیٹی مان لیا ۔۔۔ اور اپنی بیٹی کی زندگی میں بھی باپ کی کمی نہ ہونے دی۔"

ناولٹ

فرحت کی دوست مومنہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

مومنہ کی ازدواجی زندگی ناکام رہی تھی ۔۔۔ وہ رحیم کی دوسری بیوی تھی ۔۔۔ اس کے شوہر کے ہاں اپنی پہلی بیوی سدرہ سے اولاد نہ ہوئی ۔۔۔ تو رحیم کے والدین نے بچے کی خواہش میں رحیم کی دوسری شادی کر دی۔ مومنہ کو یہ بات ہی ہضم نہیں ہو رہی تھی لیکن قدرت کے کام نرالے ہوتے ہیں کہاں تو رحیم بچے کو ترس رہا تھا۔ اب اسے یہ خوشی اپنی دونوں بیویوں سے ملی۔ مومنہ حسد سے پاگل ہو گئی اور اس نے علیحدہ گھر کا مطالبہ کر دیا۔ رحیم کا کاروبار مندا تھا ۔۔۔ اس نے مومنہ سے وعدہ کیا کہ وہ جلد اس کی خواہش پوری کر دے گا لیکن اس نے ایک نہ سنی ۔۔۔ اور اس سے جھگڑا کر کے میکے آگئی ۔۔۔ رحیم اسے لینے آیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ایک دو بار کے بعد رحیم نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ مومنہ کو احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر چکی ہے اس نے جاب کر لی تھی مگر اس کی بیٹی جب اس سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی تو اس سے جواب نہ بن پڑتا۔

مومنہ تھکی ہاری آفس سے گھر پہنچی تو وہ رو رہی تھی۔

"مجھے پاپا کے پاس جانا ہے۔" وہ مومنہ کو دیکھتے ہی بولی۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا۔" وہ مزید بولی۔

"کیا ہوا؟ ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟" مومنہ کے لیے مریم کا یہ رد عمل نیا تھا۔

"نایاب کہہ رہی تھی ۔۔۔ کہ یہ گھر اس کا ہے اس کے پاپا کا ہے۔" اس نے روتے ہوئے بتایا تو اس نے

مریم کو بہلانے کی کوشش کی۔۔۔ مگر اس نے ایک ہی ضد پکڑی تھی۔۔۔ مجبوراً وہ مریم کو فرحت کے گھر لے آئی تھی کہ سونیا، سامیہ کے ساتھ کھیلے گی تو دل بہل جائے گا۔

فرحت کے فیصلے کو وہ غلط سمجھتی تھی مگر آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ فرحت نے صحیح فیصلہ کیا تھا، غلطی پر وہ خود تھی۔

"میرے لیے سامیہ اور سونیا ہی میری کل کائنات ہیں۔۔۔ بس کبھی کبھی سامیہ پر زیادہ توجہ دوں تو سونیا چڑ جاتی ہے۔" فرحت نے آہ بھر کر کہا تھا۔

ابھی فرحت نے بات ختم کر کے تھرموس سے چائے کپ میں انڈیلی ہی تھی کہ سامیہ اور سونیا کی لڑنے کی آوازیں ڈرائنگ روم سے باہر آنے لگیں۔

"اوہو۔۔۔ یہ لڑکیاں بھی ناں۔۔۔ چین نہیں لینے دیتیں۔" فرحت نے مسکرا کر اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

موحد ہنس کر بولی۔۔۔ "جاؤ جلدی جاؤ کہیں کسی کو چوٹ نہ لگ جائے۔" موحد بھی چائے کا کپ پکڑتے ہوئے مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مما۔۔۔ ناراض ہو گئی ہیں۔۔۔ چلو مما کو سوری کر کے آتے ہیں۔" سامیہ نے پیار سے سونیا سے کہا تھا۔

سونیا بے زاری سے بولی۔ "تم جاؤ۔۔۔ تمہاری مما ہیں میری تھوڑی ہیں۔"

"مما نے تمہیں اس لیے مارا ہے کہ تم چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ صرف میری مما نہیں تمہاری بھی مما ہیں۔" وہ سونیا کو سمجھاتے ہوئے بولی تھی۔

"اگر میں باتیں سن رہی تھی تو تم سے کس نے کہا تھا کہ مما سے میری شکایت لگاؤ۔" وہ آنکھیں دکھا کر پوچھنے لگی۔

"یہ تم نے بیڈ کو الگ کیوں کر دیا۔" سامیہ نے حیرت سے بیڈ کو الگ دیکھا۔۔۔ اکثر سونیا اس کے بیڈ کے ساتھ بیڈ جوڑ دیا کرتی تھی۔

"سونیا۔۔۔! مجھے معاف کر دو۔" اس نے سونیا سے دوستی کرنے کے لیے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

سونیا نے غصّے سے اس کو طمانچہ دے مارا۔۔۔ فرحت جو سونیا کا کھانا کمرے میں لے کر آ رہی تھی۔۔۔ اس نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔۔۔ سامیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فرحت نے ٹیبل پر کھانا پٹخا۔

"کیوں مارا ہے بہن کو؟" وہ غصّے سے پوچھنے لگی۔

سونیا نے فرحت کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا تو فرحت گھبرا سی گئی۔۔۔ ابھی وہ سونیا کی اس ردِعمل پر کچھ کہنے ہی والی تھی۔۔۔ کہ عمر کی کار کا ہارن بجنے لگا۔۔۔ سونیا روتے روتے کمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔ اور فرحت سامیہ کو چپ کروانے لگی۔۔۔ مگر اس کو سونیا کی نفرت بھری نگاہوں میں عجیب سا احساس ہوا تھا۔۔۔ اس کی وجہ سے وہ سو نہیں پا رہی تھی۔۔۔ عمر لیپ ٹاپ پر اپنے آفس کی فائلوں کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ حیرت سے بولا۔

"کیا بات ہے۔۔۔ کوئی پریشانی ہے؟" اس نے لیپ ٹاپ کو بند کر کے پوچھا۔

فرحت نے ٹیبل لیمپ جلایا اور افسردگی سے بولی۔ "سونیا کا رویہ عجیب تر ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ آج تو اس نے جس طرح مجھے غصّے سے دیکھا تھا۔۔۔ میں خود ڈر گئی تھی۔"

"اوہو تم سمجھ رہی ہو اسے اتنا سنجیدہ مت لو۔۔۔ ویسے تمہیں اس پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا وہ بڑی ہو رہی ہے۔" عمر نے فرحت کا ہاتھ تھام کر رسان سے کہا۔

"بڑی ہو رہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے آنکھیں دکھائے گی۔۔۔ اور آپ نے بھی اس کو ڈانٹنے کے بجائے اس کی سائیڈ لی۔ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

"اچھا اب سو جاؤ۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔" پھر عمر تو سو گیا مگر وہ ساری رات بے چین رہی۔

☼ ☼ ☼

"سامیہ کدھر ہے۔۔۔؟" سونیا کو اکیلے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو فرحت نے گھبرا کر پوچھا۔

"مجھے نہیں پتہ۔۔۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

"کیا مطلب۔۔۔ وہ تمہارے ساتھ اسکول سے نکلی نہیں تھی؟"

"مجھے نہیں پتہ۔۔۔" اس نے پھر بے زاری سے کہا۔

"سونیا! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" فرحت نے اس کو دونوں بازوؤں سے تھام کر بے بسی سے کہا تھا۔ وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی کہ آخر اس سے ایسی کیا غلطی سرزد ہو گئی ہے۔۔۔ جس سے سونیا کا رویہ یکدم ایسا ہو گیا۔

"مما۔۔۔ مما!" یکدم سامیہ دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور سونیا کے گلے لگ گئی۔

"سونیا! تم کدھر رہ گئی تھیں۔۔۔ میں نے اسکول کا ایک کونہ نہیں چھوڑا تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بچی نہیں ہوں۔۔۔ اکیلی آ سکتی ہوں۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" فرحت نے حیرت سے پوچھا۔

"میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔

"آواز نیچی رکھو۔" فرحت نے ڈپٹا تو سونیا اپنے کمرے میں جا گھسی۔

"مما! سونیا ہر وقت خفا کیوں رہتی ہے؟" سامیہ نے پُر نم آنکھوں سے پوچھا۔ فرحت کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ سونیا کا بدلتا رویہ اسے بھی پریشان کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سامیہ! سونیا تمہاری بہن نہیں ہے کیا؟" مریم نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" سامیہ بری طرح چونکی۔

"بھئی حیرانی تمہیں اس بات پر ہوئی ہے۔۔۔ اتنی مجھے بھی ہوئی تھی۔ جب اس نے مجھے بتایا تھا۔"

"سونیا نے تم سے کیا کہا ہے؟" سامیہ نے پوچھا۔

"سونیا کینٹین میں مجھے ملی تو اس سے میں نے پوچھا۔۔۔ کہ آج اکیلے اکیلے لنچ کر رہی ہو تمہاری بہن سامیہ کدھر ہے تو وہ خفگی سے بولی کہ سامیہ میری بہن نہیں ہے۔"

"اوہو۔۔۔ وہ مجھ سے خفا ہے۔۔۔ اس لیے اس نے کہہ دیا ہو گا۔۔۔ لو وہ بھی آ گئی ہے۔۔۔ سونیا تم نے مریم سے یہ غصّے میں کہہ دیا کہ میں تمہاری بہن نہیں ہوں۔۔۔ پلیز اب اس بات کو بھول جاؤ۔ میں مما سے اب کبھی تمہاری شکایت نہیں کروں گی۔" سامیہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا تھا۔

سونیا نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا۔۔۔ اور پھر یک دم اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔۔۔ اور اس نے سامیہ کو گلے سے لگا لیا۔

سامیہ خوش ہو گئی۔۔۔ جبکہ سونیا کے چہرے پر خوشی کے بجائے ایک عجیب سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مما۔۔۔ ہم سے ناراض ہیں کیا۔۔۔ ہم سب کے غصّے میں جاتے ہیں۔۔۔ اسی نوکری سے برگر لے کر آئیں گی۔" اس نے گھر کے پاس والی بیکری کو دیکھ کر کہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ مجھے سب سے باہر کا کھانا ہے۔۔۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔۔۔ میں اس دن ماموں امجد کے ساتھ پیدل لینے گئی تھی۔" سونیا نے چھٹی کے بعد کہا تھا۔

"تم میرا بیگ گھر لے جاؤ۔۔۔ میں برگر لے آتی ہوں۔" اس نے بیگ اتار کر سامیہ کو دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں سونیا! مما ناراض ہوں گی۔" سامیہ نے فکرمندی سے کہا تھا۔ "ہمارا اتنی دور اکیلے جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"مجھے برگر کھانا ہے تو بس دے کا ہی کھانا ہے۔ تم نے میرے ساتھ نہیں چلنا تو مت چلو۔" اس نے غصّے سے جواب دیا۔۔۔ اور مڑ گئی۔ مجبوراً سامیہ کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔

"تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے؟" اچانک سامیہ کو یاد آیا تھا۔

"الماری سے نکالے تھے۔" سونیا اکڑ کر بولی۔

"مما کو پتہ ہے؟" سامیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"تم نے چوری کی ہے؟" سامیہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔

"میں نے چوری نہیں کی۔ یہ میرے بابا کے پیسے ہیں۔ اس لیے میں نے الماری سے نکالے ہیں۔" اس نے فخریہ انداز سے کہا تھا۔

"سونیا! یہ مما کے پیسے تھے... اور یہ پیسے انہوں نے کمیٹی دینے کے لیے رکھے تھے۔"

"بابا آفس میں سارا دن جاب کرتے ہیں۔ پھر پیسے ان کے کیسے ہوئے؟" وہ منہ بسور کر بولی۔

"سونیا! میں تمہیں یہ پیسے خرچ کرنے نہیں دوں گی۔" سامیہ نے اس سے پیسے چھیننے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

تو سونیا نے بھاگنا شروع کر دیا۔ سامیہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ پھر سونیا تو ایک گلی میں جا چھپی اور سامیہ اسے ڈھونڈتے آگے نکل گئی۔

"اب مزہ آئے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑی۔ راستے میں اس کو مریم نے جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ سونیا اس روڈ پر اکیلی کہاں سے واپس آ رہی ہے۔ پھر اس نے ذہن پر زیادہ زور نہ دیا۔ کیونکہ اس کی کام والی ماسی زینت کو گھر جانے کی جلدی تھی اور وہ مریم کو تیز قدم بڑھانے کو کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"عمر! سامیہ... سامیہ کھو گئی ہے۔" فرحت نے روتے روتے عمر کو آفس فون کیا۔ جب سونیا نے گھر آ کر اطلاع دی کہ سامیہ اسکول میں اسے کہیں بھی نہیں ملی تو یہ سن کر فرحت کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

"کیا...؟" عمر گھبرا گیا پھر اس نے فرحت کو تسلی دی... اور جلدی گھر پہنچنے کا کہہ کر فون بند کیا۔

فرحت رو رہی تھی اور سونیا خوش تھی۔ فرحت نے سونیا کے چہرے پر عجیب سا سکون دیکھا تو اسے شک ہوا۔ "سامیہ کدھر ہے؟" اس نے سختی سے پوچھا۔

وہ اکڑ کر بولی...

"مجھے نہیں پتہ۔"

"سونیا! تمہاری بہن ایک گھنٹے سے لاپتہ ہے... اور تمہیں احساس تک نہیں۔" اس نے جب ٹی وی آن کیا تو فرحت نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔

"اوہو... مجھے تو چھوڑیے۔" وہ غصے سے بولی۔

"بابا... بابا! دیکھو تو مما مجھے مار رہی ہیں... مجھے نہیں پتہ کہ سامیہ کدھر ہے۔" وہ عمر کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔

"تم اسکول سے ہو کر آئی ہو؟" عمر نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں... اسکول سے چیک کر آئی ہوں... مما اگر سامیہ نہ ملی تو... تو میں مر جاؤں گی۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔" عمر پریشانی کے عالم میں پولیس اسٹیشن نمبر ملانے لگا۔ تب ہی سامیہ کی آواز آئی۔

"سامیہ... میری بچی!" فرحت اس پر جھپٹی... اور بے ساختہ اسے چومنے لگی۔

عمر فون رکھ کر پلٹا۔

"سامیہ ہمارے گھر کی سائیڈ پر آ پہنچی تھی... اگر ہم نہ گزر رہے ہوتے تو شاید بچی کھو جاتی۔" زینت نے اپنی گلابی اردو میں بتایا تھا۔

"سامیہ تم کیوں وہاں چلی گئی تھیں؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"وہ... وہ..." سامیہ اس قدر ڈر گئی تھی کہ اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا... البتہ عمر نے خفگی سے کہا۔

"کیا کر رہی ہو بچی... ہے۔ دیکھ نہیں رہی ہو وہ کتنی ڈری ہوئی ہے۔" عمر نے سامیہ کو دلاسا دے کر گلے سے لگایا... جس پر سونیا کی آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا اور وہ اپنے کمرے میں جا گھسی... فرحت نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تھینک یو... تم نے مجھے چڑیل سے بچا لیا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"چڑیل... کون چڑیل... تم مما کو چڑیل بول رہی ہو سونیا؟ پاگل ہو گئی ہو کیا؟" سامیہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"چڑیل کو چڑیل نہ بولوں تو اور کیا بولوں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"سونیا... مما کو چڑیل مت بولو... ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔" سامیہ نے غصے سے ہاتھ اٹھا کر کہا تھا۔

"مارو مجھے تم جتنا مرضی جھگڑا کر لو... تمہیں کچھ نہیں کہوں گی... کیونکہ تم نے مجھے آج مار سے بچا لیا... میں نے سوچا بھی نہیں تھا وہ چڑیل بابا کو فون کر دے گی۔ کاش ہم گھر ہی نہ جاتیں... تم بھی اس طرح گم ہو جاتیں اور ساتھ وہ چڑیل بھی۔"

"سامیہ! سونیا! چلو کھانا تیار ہو گیا ہے... جلدی آ جاؤ۔" فرحت نے مسکرا کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

پھر سامیہ کا افسردہ اور حیرت زدہ چہرہ دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔

"کیا ہوا...؟" فرحت نے پیار سے پوچھا۔ سونیا پریشان ہو گئی کہ کہیں سامیہ اس کو یہ نہ بتا دے کہ اس نے فرحت کو چڑیل بولا ہے... کیونکہ عمر گھر پر تھا... وہ اپنے باپ کی نظروں میں بری نہیں بننا چاہتی تھی۔

"کچھ نہیں مما... آپ چلیے... میں آتی ہوں۔" سامیہ نے فرحت سے چھپا لیا۔

"سونیا! آج تمہاری پسند کی ڈش بنی ہے... تمہیں کوفتے پسند ہیں نا تو آج میں نے کوفتے اور لال چاول پکائے ہیں اب مما کو معاف کر دو اور یہ غصہ چھوڑ دو..." اس نے پیار سے سونیا سے کہا تھا۔

سونیا خاموشی سے باہر نکل گئی۔ جس پر فرحت ہکا بکا رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کبھی سامیہ کی پسند بھی پکا لیا کرو۔" عمر نے سامیہ کو افسردہ دیکھ کر یہی وجہ سمجھی سو وہ فوراً بولا۔ سامیہ کو چکن بریانی بہت پسند تھی۔

"ہاں... ہاں... کیوں نہیں... سامیہ تو میری چاند سی بیٹی ہے۔ کل چکن بریانی تیار کی جائے گی۔" فرحت نے سامیہ کے ماتھے پر بوسہ دے کر کہا تھا۔

"بابا مجھے پینٹنگ بک لینی ہے... پرانی والی ختم ہو گئی ہے۔" سونیا نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! کھانے میں ہم باتیں نہیں کرتے۔" فرحت نے سونیا کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے علم ہے... لیکن آپ... میں بابا سے بات کر رہی ہوں۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"فرحت! تم کیوں ہر وقت میری بچی کے پیچھے پڑی رہتی ہو... کبھی تو اس کی جان بخش دو۔" عمر نے جھنجلا کر کہا تھا۔

"لاڈ پیار میں آپ بچیوں کو بگاڑ دیں گے۔" فرحت نے خفگی سے جواب دیا۔

"بابا! مجھے نئے شوز بھی خرید دیں۔" سونیا نے دوسری فرمائش کر دی۔

"سونیا! خاموشی سے کھانا کھاؤ... سامیہ کے شوز تم سے زیادہ پرانے ہیں۔ اس دفعہ وہ نئے شوز خریدے گی۔" فرحت نے غصے سے کہا تھا۔

"سامیہ کو تم نے نئے شوز کیوں نہیں لے کر دیے؟" عمر نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ... سامیہ نے شوز کی جگہ بستہ خریدا تھا۔" اس نے وضاحت کی... عمر کی سوالیہ نظروں سے وہ خود کو گنہگار محسوس کرنے لگی۔

خاموشی سے فرحت کا دل افسردہ ہو گیا تھا۔۔۔ وہ عمر کی کم آمدنی میں جس طرح گھر چلا رہی تھی۔۔۔ وہی جانتی تھی اور عمر جس نے کافی عرصے کے بعد آج رات کا کھانا گھر پر کھایا تھا۔۔۔ اس کے ذہن میں ایک بات گھوم رہی تھی۔ کہ کیا فرحت دونوں بچیوں میں فرق کر رہی ہے؟ مگر پھر آفس کی تھکن نے اس کو مزید سوچنے نہ دیا۔۔۔ اور وہ سو گیا۔

فرحت برتن دھو کر کمرے میں آئی تو عمر سو چکا تھا۔۔۔ سونیا کے رویے سے وہ کافی اپ سیٹ سی ہو گئی تھی۔۔۔ بستر پر کافی دیر لیٹنے کے بعد جب اس کو نیند نہ آئی تو ڈرائنگ روم میں آ کر مومنہ کو فون کرنے لگی۔

✡ ✡ ✡

"آپ اتنی جلدی آ گئے۔۔۔؟" وہ بیل بجنے پر دروازہ کھولنے آئی تھی تو سامنے کھڑے عمر سے حیرت سے بولی۔

"کیوں۔۔۔ میں جلدی نہیں آ سکتا۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"او ہو۔۔۔ یہ گھر آپ کا ہے۔۔۔ ہم بھلا کون ہوتے ہیں آپ سے پوچھنے والے؟" وہ مسکرا کر بولی۔

"پیاری لگ رہی ہو۔۔۔" عمر نے ایک گہری نظر فرحت پر ڈال کر کہا تھا۔

"ایک بچی ہونے کے بعد آج آپ کو میری خوب صورتی کا احساس ہو رہا ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔

عمر کے چہرے پر چھائی خوشی افسردگی میں تبدیل ہو گئی۔۔۔ فرحت کو بھی احساس ہوا کہ اسے ایک بچی نہیں کہنا چاہیے تھا۔

کھانے کی ٹیبل پر عمر نے خفگی سے پوچھا۔

"آج سامیہ نے چکن بریانی کی فرمائش کی تھی۔ پھر یہ حلیم کیوں تیار کی؟" سامیہ کا منہ لٹکا ہوا تھا جبکہ سونیا خوش ہو کر کھا رہی تھی۔ "آج پھر اس کی پسند کی حلیم بنائی گئی ہے۔"

"جی۔۔۔! وہ سونیا کا موڈ آف تھا۔۔۔ اس لیے۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔" فرحت نے گھبرا کر جواب دیا۔۔۔ جو عمر کے اس رویے پر خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔۔۔ کہ کہیں وہ دونوں بچیوں کے سامنے کچھ الٹا سیدھا نہ بول دے۔

"تمہیں صرف سونیا ہی نظر آتی ہے۔ سامیہ تمہیں۔۔۔" وہ غصے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"عمر۔۔۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔ صرف دو دن میں نے سونیا کی پسند کی ڈشیز تیار کی ہیں۔۔۔ کیونکہ اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں سامیہ کو زیادہ پیار کرتی ہوں۔۔۔ اس وجہ سے میں نے سونیا کے لیے حلیم تیار کی تھی۔۔۔ آپ بے شک سامیہ سے پوچھ لیں۔"

"دیکھو فرحت! میں بچیوں میں کوئی تفریق برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔ تمہارے لیے ان دونوں میں فرق ہو گا۔۔۔ مگر میرے لیے وہ دونوں میرا خون ہیں۔"

عمر نے ڈریسنگ ٹیبل سے موٹر بائیک کی چابی اٹھائی اور غصے سے باہر نکل گیا۔

"عمر۔۔۔! میری بات تو سنیے" وہ لرزتی آواز میں بولی تھی مگر وہ سامیہ اور سونیا کو پیزا کھلانے لے جا چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس نے کبھی دونوں میں فرق نہیں کیا تھا۔۔۔ کیسے یقین دلاتی عمر کو جو کہ اس کو غلط سمجھ رہا تھا۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔۔۔ عمر کو آتے دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں جانتا ہوں کہ تم سو نہیں رہی ہو۔" عمر نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا تھا۔

فرحت نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔ البتہ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں نہیں چاہتا کہ دونوں بچیوں میں کسی قسم کا بھی کوئی جھگڑا ہو۔۔۔ تم دونوں سے ایک جیسا سلوک کرو گی۔۔۔ یہ گھر تمہارا ہے اور اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم کیا چاہتی ہو۔"

عمر نے اطمینان سے کہا اور کروٹ لے کر سو گیا۔ مگر فرحت سو نہ سکی۔ سوچ رہی تھی جو سچے دل سے دونوں کو ہی پیار دے رہی تھی۔۔۔ اس کی ممتا پر شک کیا جا رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

"مجھے آملیٹ کھانا ہے۔" سونیا کچن میں آ کھڑی ہوئی۔۔۔ جبکہ سامیہ پہلے سے کھڑی تھی۔

"انڈا ایک ہی تھا جو میں نے سامیہ کے لیے بنایا ہے۔ تم شامی کباب لے لو۔" اس نے پیار سے جواب دیا۔

"نہیں مجھے آملیٹ کھانا ہے۔" سامیہ سے اس نے پلیٹ چھین کر جواب دیا تھا۔

"چھوڑو۔۔۔ یہ مما نے میرے لیے بنایا ہے۔" سامیہ نے غصے سے کہا تھا اور سونیا سے پلیٹ چھیننے لگی۔

"سونیا۔۔۔! اس کو واپس پلیٹ دو۔" فرحت نے غصے سے کہا تھا۔

"نہیں، نہیں، مجھے انڈا کھانا ہے۔" اس نے غصے سے جواب دیا۔

اس سے پہلے سونیا آملیٹ کا پیس منہ میں ڈالتی۔۔۔ سامیہ نے پلیٹ پر زور سے ہاتھ مار دیا۔۔۔ سلائس اور آملیٹ فرش پر جا پڑا۔

"بدتمیز۔۔۔" فرحت نے سامیہ کو تھپڑ رسید کر دیا۔۔۔ "رزق کا تم لوگوں نے تماشا بنا دیا ہے۔"

اسی وقت عمر شور سن کر کچن میں آ کھڑا ہوا۔۔۔ سامیہ بری طرح رو رہی تھی۔

"سامیہ کو کیوں مارا؟" اس نے سامیہ کے سرخ گال کو دیکھ کر غصے سے فرحت سے پوچھا۔

"عمر! انڈا ایک تھا۔۔!" اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کرتی۔۔۔ عمر نے بات کاٹ کر کہا۔

"میں صرف یہ پوچھ رہا ہوں۔۔۔ کہ تم نے سامیہ کو تھپڑ کیوں مارا ہے؟"

"عمر۔۔۔! سامیہ نے خود انڈا زمین پر پھینکا ہے۔۔۔ بری بات تھی۔ اس لیے میں نے مارا۔۔۔" وہ عمر کو وضاحت دینا چاہتی تھی۔

سامیہ روتے روتے بولی۔ "بابا! سونیا نے مجھ سے میرا ناشتہ چھین لیا تھا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"کیا سونیا نے بدتمیزی نہیں کی ہے؟" عمر نے غصے سے پوچھا۔

"عمر! میں سونیا سے ناشتہ لے کر سامیہ کو دینے والی تھی۔۔۔ مگر سونیا پلیٹ چھوڑ نہیں رہی تھی۔" سونیا اور سامیہ روتے ہوئے کچن سے چلی گئی تھیں۔

"اگر تم سامیہ کو ناشتہ دے دیتیں تو شاید وہ ایسا نہ کرتی۔" وہ خفگی سے بولا۔

"عمر۔۔۔ پلیز خدا کے لیے۔" فرحت روہانسی ہو گئی۔

"سوتیلی ماں۔۔۔ سوتیلی ہی ہوتی ہے۔" وہ تو غصے سے کہہ کر چلا گیا مگر فرحت ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"مما۔۔۔! میرے بابا کہاں ہیں؟" وہ آفس سے جب گھر پہنچی تو مریم نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

مومنہ خاموش رہی۔۔۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جب بھی مریم کو سمجھاتی۔۔۔ الٹا مریم اس سے خفا ہو جاتی تھی۔

"مما۔۔۔ پلیز مجھے بابا سے ملنا ہے۔۔۔ سب کے بابا اسکول آتے ہیں۔۔۔ میرے بابا کیوں نہیں آتے۔"

"تمہارے بابا دوسرے شہر میں ہیں۔ وہ نہیں آ سکتے۔" اس نے اپنی بیٹی کا ماتھا چوم کر کہا جو بہت افسردہ نظر آ رہی تھی۔

"ماما! ہم تو بابا کے پاس جا سکتے ہیں نا!" وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟ میں تمہیں ساری چیزیں لا کر دیتی ہوں نا!" مومنہ نے خفگی سے کہا۔

"مما۔۔۔ بات چیزوں کی نہیں ہے۔۔۔ مجھے بابا سے ملنا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ میں کل ان کے دوست سے بات کرتی ہوں۔۔۔ اگر وہ تم سے ملنا چاہتے ہوں گے۔۔۔ تو ملاقات ہو سکے گی۔"

وہ پر جوش انداز سے بولی۔ "مما! مجھے یقین ہے۔۔۔ بابا مجھے لینے آ جائیں گے۔" اس نے خوش ہو کر کہا تھا

"ہائے۔۔۔ ہائے تم رحیم سے بات کرو گی؟ ہم لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے؟"
صدف نے مریم اور مومنہ کی بات سن لی تھی۔

"بھابھی۔۔۔ اس میں بری بات کیا ہے۔۔۔ مریم اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہے۔۔۔ اس میں منہ نہ دکھانے والی کون سی بات ہے۔" اس نے خفا ہو کر جواب دیا تھا وہ صدف کی عادت سے واقف تھی ذرا سی بات پر وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھی۔

دوسرے دن جب آفس سے وہ گھر پہنچی تو اپنے کمرے میں رخسانہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی رخسانہ منجھلے بھائی کی بیوی تھی۔

"مومنہ۔۔۔ کیا تم رحیم سے صلح کرنا چاہتی ہو؟"
"بھابھی! اب اس کا کیا سوال ہے؟ آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"مومنہ! تم رحیم سے صلح کرنا چاہتی ہو تو اس میں برائی کیا ہے؟ تمہارے بھائی خفا ہیں کہ پچھلے تیرہ سال سے انہوں نے تمہیں سنبھالا۔۔۔ اور تمہاری بچی کو بھی۔۔۔ اور آج تم نے ان کے بغیر ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا ہے۔"

رخسانہ کی بات سن کر وہ سکتے میں آ گئی۔ صدف نے حسب عادت بڑھا چڑھا کر سب کو بتایا تھا۔

"اگر تم رحیم کے پاس جانا چاہتی ہو تو یہ تمہارے اور مریم کے حق میں بہتر ہی ہے۔" رخسانہ نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔

"بھابھی۔۔۔ میری بات تو سنیے!" مومنہ نے رخسانہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"بھابی۔۔۔ میں نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔۔۔ صرف صدف بھابی خود سے یہ بول رہی ہیں۔۔۔ وہ نہیں چاہتیں کہ میں اس گھر میں رہوں۔۔۔ ان کو صرف یہ کمرہ چاہیے۔۔۔" اس نے دکھ سے کہا۔
رخسانہ چونک پڑی۔

"صدف بھابھی مجھے نکالنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے تو انہوں نے مریم کے دل میں یہ بات ڈالی ہے۔۔۔ کہ جس لڑکی کا باپ اس سے نہیں ملتا اس لڑکی کی کوئی عزت نہیں۔"

"صدف بھابھی نے کمرے کے لیے ایک معصوم بچی کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔۔۔ تم سارا دن آفس میں ہوتی ہو۔ صدف بھابھی ہر وقت بلاوجہ روک ٹوک کرتی رہتی ہیں۔ بات بات پر کہتی ہیں یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ ماموں کی کمائی پر عیش کر رہی ہو۔" رخسانہ نے بھی ساری بات بتا دی۔

"کیا۔۔۔؟" وہ رخسانہ کی بات پر چونک پڑی۔ کیونکہ وہ اپنی آدھی تنخواہ صرف بھابی کے ہاتھ میں رکھتی تھی۔۔۔ تاکہ وہ اس کی بچی کا خیال رکھیں۔۔۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔۔۔ کہ صدف بھابی مریم کے ساتھ اس طرح کا رویہ رکھے ہوئے تھیں۔

رخسانہ نے آہ بھر کر کہا۔

"مومنہ! اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔۔۔ فراز اور میرے درمیان کتنے جھگڑے ہوتے ہیں۔۔۔ مگر میں گھر نہیں چھوڑتی۔۔۔ اس گھر کو چھوڑ کر جاؤں گی تو میرے لیے بھی ایک دن برے ہو جائیں گے۔۔۔ شادی کے بعد عورت کا گھر صرف اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔۔۔ چاہے اس گھر میں کتنے دکھ کیوں نہ ملیں۔"

رخسانہ بے اولاد تھی۔۔۔ اور فراز کے ساتھ اس کے آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔

رخسانہ چلی گئی مگر مومنہ کو سوچ میں ڈال گئی۔

☆ ☆ ☆

"ممّا۔۔۔ ممّا! سونیا اسکول جانے کے لیے نہیں اٹھ رہی ہے۔" سامیہ نے کچن میں اس کو اطلاع دی۔

"کیوں نہیں اٹھ رہی جاؤ اس کو بول کر آؤ کہ ممّا کے آنے تک ہاتھ منہ دھو لے۔۔۔ ورنہ پٹائی کر دوں گی۔"

فرحت نے سلائس تیار کرتے کہا تھا۔ وہ دونوں کا ٹفن بھی ساتھ پیک کر رہی تھی۔

"ممّا! مجھے شامی کباب نہیں کھانا۔ کل بھی آپ نے ٹفن میں رکھ دیا تھا۔" سامیہ فرحت کو شامی

کباب ٹفن میں ڈالتے دیکھ کر خفگی سے بولی۔
"اوکے آئی ایم سوری میں بھول گئی تھی۔۔۔ آپ کے لیے انڈا بنا دیتی ہوں۔" اس نے انڈا اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔
"نہیں مما مجھے سلائس پر جیم لگا کر دے دیں۔ مجھے انڈا نہیں کھانا۔" وہ بیزاری سے بولی۔
"اچھا بابا۔۔۔! آپ کے نخروں میں میرا کام ادھورا رہ جائے گا۔" اس نے سلائس پہ جیم لگایا اور ٹفن پیک کر دیا۔
سونیا کے ٹفن میں اس نے سامیہ کا شاہی کباب بھی رکھ دیا۔۔۔ اور پھر وہ سونیا کو اٹھانے کے لیے کمرے میں آئی۔۔۔ سونیا تیار کھڑی تھی۔
"سونیا۔۔۔! تم تیار ہو۔۔۔ سامیہ تو کہہ رہی تھی کہ تم اسکول سے چھٹی کرنا چاہتی ہو؟"
"وہ جھوٹ بول رہی ہو گی۔۔۔ مما اس نے جھوٹ بولا ہے۔۔۔ اب اس کی بھی پٹائی کریں۔۔۔" وہ منہ بسور کر بولی۔
"سامیہ۔۔۔!" فرحت نے سامیہ کو پکارا۔۔۔ سامیہ عمر کے کمرے میں تھی۔۔۔ وہ فرحت کی آواز پر دوڑی چلی آئی۔
"جی مما۔۔۔!" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔
"بیٹا۔۔۔! آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا کہ سونیا اسکول چھٹی کرنا چاہتی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"مما۔۔۔! میں سچ بول رہی ہوں۔ سونیا نے مجھ سے کہا تھا۔" اس نے معصومیت سے اپنی سچائی پیش کی۔
سونیا نے فوراً رونی صورت بنالی۔ "مما! یہ بس یہی چاہتی ہے۔۔۔ کہ آپ ہمیشہ مجھے مارتی رہیں۔۔۔ میری پٹائی سے یہ بہت خوش ہوتی ہے۔۔۔ اس نے کلاس میں بھی وہ بات بتا دی ہے کہ میں نے بغیر پوچھے پیسے الماری سے نکالے تھے۔۔۔ اس لیے اب میری سب دوستیں مجھے چورنی کہتی ہیں۔"
"کیا۔۔۔؟" فرحت نے غصے سے سامیہ کی طرف دیکھا۔
"تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟" فرحت نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر پوچھا تبھی عمر کی آواز آئی۔
"جلدی کرو۔ آفس سے دیر ہو جائے گی۔۔۔ ابھی تم لوگوں کو اسکول بھی چھوڑنا ہے۔" فرحت نے جلدی سے دونوں کو ٹفن تھمایا مگر سونیا کو غصہ تھا کہ فرحت نے سامیہ کی پٹائی نہیں کی تھی۔۔۔ وہ فرحت سے ضد کرنے لگی کہ اس کو ٹفن میں انڈا بھی لے کر جانا ہے۔
فرحت نے پیار سے کہا۔۔۔ "بیٹا! بابا کو دیر ہو رہی ہے۔۔۔ کل لے جانا۔ آج شاہی کباب لے جاؤ۔۔۔" اس نے سونیا کا ماتھا چوم کر کہا تھا۔۔۔ مگر سونیا کی نظر میں فرحت کا پیار جھوٹا تھا۔۔۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔
آخر کار فرحت نے عمر کو آواز دی کہ پانچ منٹ مزید رک جائیں۔
پھر عمر اور سامیہ صحن میں کھڑے رہے۔۔۔ فرحت نے جلدی سے انڈا فرائی کر کے ٹفن میں رکھا تو سامنے عمر کو کھڑا پایا۔۔۔ جس کے ہاتھ میں سامیہ کا ٹفن تھا۔
فرحت نے عمر کا خفا چہرہ دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔
"کیا ہوا ہے؟"
عمر نے سونیا کا ٹفن لے کر کھولا۔۔۔ تو سلائس اور شاہی کباب کے ساتھ انڈا دیکھ کر خاموشی سے بند کر دیا اور پھر غصے سے فرحت کو گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔۔۔ فرحت سمجھ نہیں پائی تھی کہ عمر کو کس بات پر غصہ آ رہا ہے۔۔۔
ان تینوں کے جانے کے بعد وہ گھر کے کام سمیٹنے لگی۔
آج اس نے سامیہ کی پسندیدہ مسالے والی چکن بریانی تیار کی تھی۔ جو اس دن وہ پکا نہیں پائی تھی۔
پھر رات کو سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آئی تو عمر کو اس نے افسردہ پایا۔
فرحت نے عمر کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔
"عمر! کیا بات ہے۔۔۔ آپ اتنے چپ چپ کیوں ہیں؟" اس نے پیار سے پوچھا۔
"فرحت۔۔۔ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔۔۔" اس نے سختی سے کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔
"کیا ہوا ہے۔۔۔؟ میں کیا اچھا نہیں کر رہی ہوں۔" وہ عمر کے اس ردعمل پر تلملا اٹھی۔
"سونیا کو تم نے انڈا اور شاہی کباب دیا۔۔۔ اور سامیہ کو صرف سلائس دیے۔۔۔ کیوں ایسا کر رہی ہو؟" عمر نے فرحت کو گھورتے کہا تھا۔ "اب تم نے اچھا بننے کے لیے سامیہ کو پسندیدہ ڈش تیار کر دی۔" اس نے غصے سے کہا تھا۔
فرحت نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ "خدارا! آہستہ بولیے کہیں سامیہ نے سن لیا کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں۔۔۔ تو اس پر کیا گزرے گی۔"
"فرحت۔۔۔ خدا کے لیے یہ اچھا بننے کا ڈرامہ بند کرو۔۔۔ مجھے یقین ہو گیا ہے۔ کہ تم نے دل سے اس کو قبول نہیں کیا۔"
"نہیں عمر۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔۔۔ میرے لیے سامیہ اور سونیا میں کوئی فرق نہیں ہے۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا تھا۔
"ایسا ایک بار نہیں ہوا۔ میں نے بہت دفعہ محسوس کیا ہے کہ تم ان دونوں میں فرق کرتی ہو۔" عمر نے آہ بھر کر کہا۔
"عمر! آپ کو میں کیسے یقین دلاؤں۔۔۔ آپ سامیہ کو بلا کر پوچھ لیں۔" اس نے بستر سے اٹھ کر کہا تھا۔
"میں سامیہ سے کیا پوچھوں۔۔۔ میں خود سمجھ اور دیکھ چکا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر کمرے کے باہر نکل گیا۔۔۔ فرحت آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کل سعد چاچو آپ کو لینے آ رہے ہیں۔۔۔" مومنہ نے افسردگی سے رات کو مریم سے کہا تھا۔۔۔ جب وہ ہوم ورک کر رہی تھی۔۔۔ وہ اچھل پڑی۔
"میرے چاچو بھی ہیں۔۔۔ مما! میرے کتنے چاچو ہیں۔۔۔ کتنی پھوپھو ہیں۔ کیا میری نانی اماں ہیں۔۔۔ دادی۔۔۔ دادا ابو ہیں؟" وہ خوشی سے پوچھ رہی تھی۔
"ہاں ہاں سب ہیں۔۔۔ کل جاؤ گی تو سب کے ساتھ پیار سے ملنا۔۔۔ اور وہاں بابا سے یہاں کی کوئی بات نہ کرنا۔"
مومنہ نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ رحیم کو اندازہ ہو کہ ان لوگوں کے لیے مریم صرف ایک بوجھ ہے۔۔۔ صدف اسے بار بار جتاتی تھی کہ مریم کی شادی کی ذمہ داری کون اٹھائے گا۔۔۔ اس کے سسرال والے پوچھیں گے کہ تم دونوں میں علیحدگی کیوں ہوئی۔۔۔ تو کیا جواب دو گی؟
یہی سوچ کر اس نے مریم کو رحیم سے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔۔۔ "مما! پنک کلر مجھ پر سوٹ کرتا ہے۔۔۔ میں یہ پہن کر جاؤں گی۔" اس نے الماری سے گلابی رنگ کا سوٹ نکالتے ہوئے کہا تھا۔ مومنہ اسے خوش دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔
مریم پچھلے دنوں بہت بیمار رہی تھی اس کا بخار اترنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹروں کے چکر کاٹ رہی تھی۔
"مریم کو باپ کی جدائی کہیں زیادہ بیمار نہ کر دے۔" یہی سوچ کر مومنہ نے رحیم کے دوست نواز کو ساری صورت حال بتائی تھی۔ رحیم نے یہ سن کر سعد کو بھیجا تھا۔ وہ مریم کو لے گیا۔۔۔ مومنہ بھی مطمئن سی ہو گئی۔۔۔ کہ تیرہ سال کی دوری کے باوجود رحیم نے مریم کا خیال کیا تھا۔ جس کی بیماری کی اطلاع سن کر فوراً اس نے اسے گھر بلوایا تھا۔۔۔ جبکہ گھر پر اس کی بیوی سدرہ اور ایک بیٹا حمزہ تھا۔ مومنہ کو احساس ہو گیا تھا۔۔۔ کہ اس نے مریم کو رحیم سے جدا کر کے غلط کیا ہے۔۔۔ کیونکہ جن بیٹیوں کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا۔۔۔ ان پر زمانہ آسانی سے انگلیاں اٹھاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"مومنہ! تمہارے لیے میں کھانا کمرے میں لے آئی ہوں۔۔۔" صدف بھابی نے چنا پلاؤ کی پلیٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔
"بھابی۔۔۔ آپ نے کیوں زحمت کی۔۔۔ میں خود لے لیتی۔" مریم کو سعد کے ساتھ بھیج کر اسے اپنا آپ خالی خالی محسوس ہو رہا تھا۔
"کیسا پکا ہے؟" صدف گرم جوشی سے پوچھنے لگی۔

مومنہ جانتی تھی صدف کا پیار بغیر مطلب کے نہیں ہو سکتا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اچھا۔"

"مومنہ! میں نے سنا ہے کہ آج سعد آیا تھا۔۔۔ رحیم نے مریم کو گھر پر بلوایا ہے؟"

"جی بھابی!" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"میں نے سنا ہے۔۔۔ رحیم کا کاروبار بہت اچھا چل رہا ہے۔۔۔ اس نے تو مریم کا خرچ بھی بھیجا تھا مگر تم نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب مریم وہاں گئی ہے تو میں سوچ رہی تھی کہ تمہیں مریم کا خرچ لے لینا چاہیے۔"

"بھابی۔۔۔ میں کھانے پینے کا خرچ تو مسلسل دے رہی ہوں۔۔۔ پھر آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟" اس نے کھانا چھوڑ دیا۔

"مہنگائی تو دیکھو۔۔۔ تم پانچ ہزار دیتی ہو۔۔۔ بجلی کا بل گیس کا بل تیرہ سال سے میں ہی دے رہی ہوں۔" صدف نے تنگ کر کہا تھا۔

"بھابی! میں آپ کو پوری تنخواہ دے دیتی ہوں۔" مومنہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

صدف نے منہ بنا کر کہا۔ "سات ہزار تمہاری تنخواہ ہے۔۔۔ اس پر تو سات لاکھ کے دکھا رہی ہو۔"

اس سے پہلے بھی وہ کئی بار یعقوب بھائی کے سامنے بھی یہ بات کر چکی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولے تھے۔ فراز کا کاروبار بھی اتنا ٹھیک نہیں چل رہا تھا۔۔۔ کہ رخسانہ کچھ بولتی۔۔۔ ایک دفعہ رخسانہ نے مومنہ کی حمایت کی تھی تو صدف نے اس کو بھی کھری کھری سنا دی تھی۔

مومنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔

صدف اس کو صاف صاف سنا کر چلی گئی تھی کہ اب وہ دس ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لے گی۔۔۔ اس کے پاس گھر کا خرچ چلانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔۔۔ مومنہ سوچ رہی تھی تیرہ سال کے بعد رحیم سے خرچ کا مطالبہ کیسے کرے گی؟ جو پہلے ٹھکرا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سونیا! یہ کیا بدتمیزی ہے۔۔۔ خالہ سے اس طرح بات کرتے ہیں۔" آمنہ، فرحت کی چھوٹی بہن اس کے ہاں آئی ہوئی تھی۔

"سونیا۔۔۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟۔۔۔ تمہاری خالہ جان ہیں۔" فرحت نے جو مسلسل بولتی جا رہی تھی۔۔۔ اور آمنہ اپنے بچوں کے سامنے شرمندگی محسوس کرنے لگی۔

"مما۔۔۔! یہاں سے چلیے مجھے گھر جانا ہے۔" طوبیٰ آمنہ کی بیٹی تھی۔ وہ سامیہ، سونیا کی ہم عمر تھی۔۔۔ اور بات کو سمجھتی تھی۔

"فرحت آپا! میں چلتی ہوں۔۔۔" اس نے پرنم آنکھوں سے اپنی بہن سے کہا تھا۔

"نہیں آمنہ! بیٹھو۔۔۔ سونیا بچی ہے۔۔۔ طوبیٰ! میری بچی رونے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ یہ گھر سونیا کا نہیں۔۔۔ یہ گھر تمہاری خالہ کا ہے۔"

آمنہ اپنے گھر کے حالات سے پریشان تھی۔۔۔ آج ایک ماہ کے بعد اپنی بہن کے گھر آئی تھی۔ آمنہ کی ساس اس سے برا سلوک کرتی تھی۔۔۔ اور اس کا شوہر دبئی میں تھا۔ وہ ماں کو خرچ بھیجتا تھا۔۔۔ اور آمنہ کی ساس اپنی مرضی کے مطابق گھر کا خرچ کرتی تھی۔ آمنہ اور اس کے بچے منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔

سونیا کی گڑیا طوبیٰ نے اٹھائی تو سونیا نے اس سے چھین لی۔

"میں تمہاری گڑیا کھا تو نہیں جاتی۔" طوبیٰ خفگی سے بولی۔

"تم لوگ ہمارے گھر میں کھانے کے لیے آ جاتے ہو۔ اپنے گھر میں دل نہیں لگتا کیا؟" سونیا چیخ کر بولی۔ دونوں میں جھگڑا ہوا۔ بات آمنہ کے کانوں تک بھی پہنچی۔

آمنہ اور طوبیٰ وہاں سے روتی ہوئی چلی گئیں۔۔۔ فرحت کو سونیا پر شدید غصہ تھا۔ عمر کی خفگی کی وجہ سے وہ پہلے ہی پریشان تھی۔ اس نے سونیا کو دو تھپڑ لگائے۔۔۔ سونیا کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔۔۔ اس کے دل میں صرف احتجاج اور نفرت تھی۔

"پلیز مما! سونیا کو چھوڑ دیں۔" سامیہ نے فرحت کو روکا۔۔۔ فرحت نے اسے پیچھے ہٹایا تو سامیہ کا پاؤں پھسل گیا اور وہ ڈریسنگ ٹیبل سے جا ٹکرائی۔۔۔ ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ جو پہلے ہی مرمت طلب تھا۔ اور عمر کی مصروفیت کے باعث تاخیر ہو رہی تھی۔ یکدم اپنے فریم سے نکل کر سامیہ پر آن گرا۔۔۔ سامیہ نے ایک چیخ ماری۔۔۔ اور پھر خاموش ہو گئی۔ سامیہ کے سر سے خون بہنے لگا۔۔۔ فرحت سکتے میں آ گئی جبکہ سونیا نے گھبرا کر عمر کو فون کیا۔

عمر میٹنگ میں تھا۔ گھر سے بار بار کال آنے پر وہ فکرمند سا ہو گیا۔ پھر اس نے گھر فون کیا۔

دوسری طرف سونیا نے گھبراہٹ کے ساتھ اٹھایا۔۔۔ سونیا نے روتے روتے کہا۔

"بابا۔۔۔! سامیہ کے سر سے خون نکل رہا ہے۔۔۔ ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ اس پر گر گیا ہے۔"

عمر کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔۔۔ وہ اپنے دوست اکمل کے ساتھ بھاگا ہوا گھر پہنچا۔۔۔ سامیہ کو خون میں لت پت دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ سونیا ڈر کے مارے اس کے گلے لگ گئی۔۔۔ اور رونے لگی۔

"مما نے سامیہ کو دھکا دیا ہے۔"

عمر فرحت کو تکتا رہ گیا۔۔۔ اور فرحت سکتے میں تھی۔۔۔ اس کو اندازہ ہو گیا تھا۔۔۔ کہ اس واقعے کے بعد عمر کبھی بھی اب اس کو سامیہ کے ساتھ رہنے نہیں دے گا۔۔۔ کیونکہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے سامیہ کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔

☼ ☼ ☼

مومنہ، صدف کے مطالبے سے شدید پریشان تھی۔ اس نے گاڑی کا ہارن سنا تو کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ رحیم، مریم کو دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔ مومنہ نے جلدی سے پردہ برابر کیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔۔۔ رحیم اس کا شوہر تھا اس کی بچی کا باپ۔ اس وقت بھی صدف نے ہی اسے بھڑکایا تھا کہ وہ رحیم سے علیحدہ گھر کا مطالبہ کرے۔ مگر رحیم کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا۔۔۔ اس نے مومنہ سے وعدہ کیا۔۔۔ کہ جلد اس کو علیحدہ گھر لے دے گا۔۔۔ مگر مومنہ نے اس کی ایک نہ مانی تھی۔۔۔ اور خفا ہو کر میکے بیٹھ گئی تھی۔۔۔ آج اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔

"مما۔۔۔!" مریم نے مومنہ کو دیکھ کر اس کو پکارا۔۔۔ اور پھر خوشی کے مارے اس کے گلے لگ گئی۔

"مما۔۔۔ دیکھو۔۔۔ بابا نے مجھے پیسے دیے ہیں۔۔۔ اور بولا ہے کہ جب پیسوں کی ضرورت پڑے فون کر کے منگوا لینا۔" مریم نے اپنے چھوٹے سے پرس میں سے بیس ہزار نکال کر مومنہ کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"ہائے، ہائے میری بچی کہاں چلی گئی تھی۔"

صدف بھابی نے پیسے دیکھ لیے تھے۔۔۔ انہوں نے مریم کو آگے بڑھ کر گود میں لیا۔ مومنہ کو غصہ آنے لگا مگر مریم کے سامنے تماشا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"ممانی جان۔۔۔! آپ سب لوگوں کے لیے بابا نے گفٹ خریدے ہیں۔۔۔ انہوں نے شاید فراز ماموں کو دیا ہے۔" مریم بے خوشی سے بتا رہی تھی۔

اس وقت یعقوب فراز کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

"مما دیکھیں۔۔۔ مریم کے بابا نے میرے لیے گڑیا بھیجی ہے۔"

"ہائے بھتیجی لگ رہی ہے۔" صدف نے اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا۔

"ممانی جان! آپ کے لیے اور چھوٹی ممانی کے لیے سوٹ بھیجا ہے۔۔۔ اور ماموں کے لیے گھڑی لے کر دی ہے۔" رحیم نے گھر کے ہر فرد کے لیے تحفہ بھیجا تھا۔ صدف بہت خوش تھا کہ انہوں نے اس کی بیٹی سے ملنے کی اجازت دے دی ہے۔

رخسانہ سوٹ لے کر خوش تھی۔۔۔ صدف کمرے سے باہر نکلی تو رخسانہ نے مریم کو گود میں لے لیا اور پوچھنے لگی۔

"بابا کیسے تھے۔۔۔؟ اور ان کے گھر والے تم سے کیسے ملے تھے؟"

"دادی اماں بوڑھی ہو گئی ہیں۔۔۔ انہوں نے مجھے

نالیں پہنتے دیکھیں۔" مریم نے اپنے کانوں کے ٹالپس دکھائے۔

مومنہ نے دیکھا تو بولی "گولڈ کے ہیں۔ جبھی تمہیں نہیں لینا چاہیے تھے۔"

"مما۔ امی نے منع کیا تھا مگر وہ کہہ رہی تھیں کہ میں ان کی پوتی ہوں۔" مریم نے خوشی خوشی بتایا۔

"اور کون کون گھر میں ملا۔۔؟" رخسانہ نے تجسس سے پوچھا۔ وہ جانتی تھی۔ کہ مومنہ جاننا چاہتی ہے مگر کبھی نہیں پوچھے گی۔

"حمزہ ملا تھا۔ بابا نے بتایا ہے وہ میرا بھائی ہے۔ اور وہاں اس کی امی بھی تھیں انہوں نے کہا۔ میں تمہاری بڑی امی ہوں۔ انہوں نے مجھے بہت پیار کیا اور کپڑے بھی دیئے ہیں۔"

مومنہ کی آنکھیں پرنم سی ہو گئیں۔ شاید وہ صدرہ کے ساتھ ہوتی تو اس گھر میں وہ تکلیف نہ ہوتی جو آج صدف بھابھی کی وجہ سے ہو رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"پندرہ ہزار اس مہینے تم دے دو۔ میں اگلے مہینے میں حساب کاٹ لوں گی۔" صدف نے انگلی آج اس سے کہا تھا۔

"بھابھی! میرے پاس اتنے پیسے نہیں۔" اس نے بھی خفگی سے جواب دیا تھا۔

"مریم بیس ہزار لائی ہے وہ کہاں رکھے ہیں؟"

"بھابھی۔! وہ مریم کے پیسے ہیں۔ اگلے مہینے اس کی برتھ ڈے ہے وہ اپنے دوستوں کو گھر پر دعوت دینا چاہتی ہے۔" اس نے ضبط کر کے کہا۔

"برتھ ڈے کا تو بہانہ ہے تم نے شاید آفس میں کسی کو دینے ہیں۔" صدف بھابھی نے منہ بنا کر جتایا۔ مومنہ آفس جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"بھابھی آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"سارا دن آفس میں ہوتی ہو کس سے ملتی جلتی ہو، ہم لوگوں کو کیا پتا۔" اس نے مومنہ پر گہری نظر ڈال کر کہا تھا۔

"بھابھی آپ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔ کہ میں کسی اور پر نچھاور کرتی ہوں۔ کیا آپ نے مجھے اتنا گھٹیا سمجھ رکھا ہے۔" اس نے صدمے سے لرزتی آواز میں کہا تھا۔

صدف خاموشی سے کھسک گئی۔ مگر مومنہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ نوبت اس کی ذات پر شک کی آجائے گی۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ رخسانہ نے اس کو تسلی دی تھی اور اس کو رحیم کے ساتھ صلح کرنے کا مشورہ بھی جو اس نے خاموشی سے سنا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ اسپتال کے باہر ٹہل رہی تھی۔ عمر آپریشن کے لیے کچھ ضروری کاغذات پر دستخط کر رہا تھا۔ سامیہ کے سر میں شیشے کی کرچیاں چبھ گئی تھیں۔ وہ خطرے میں تھی۔

فرحت کو سامیہ کے ساتھ ساتھ عمر کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ اس نے عمر کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"عمر! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔"

"پلیز۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔۔۔ ورنہ آج میرا ہاتھ تم پر اٹھ جائے گا۔" وہ شدید غصے میں تھا۔

"عمر! میری بات تو سنو۔" اس نے ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"کیا بات سنوں۔ کیا سنانا چاہتی ہو۔۔۔ یہی کہ تم بے قصور ہو۔ تو مجھے اس کا یقین نہیں۔" اس نے غصے سے کہہ کر اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔

وہ خاموشی سے اسپتال سے باہر آکر ٹہلنے لگی تھی دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ خدا اس کی بیٹی کی جان بخش دے۔

سامیہ کا آپریشن کامیاب رہا۔ مگر ڈاکٹروں نے اس سے نہ ملنے کا حکم دیا۔ کیونکہ سامیہ کے ذہن پہ مزید دباؤ سے اس کی طبیعت کے بگڑنے کا خطرہ تھا۔

"پلیز عمر! مجھے اندر جانے دو، مجھے سامیہ سے ملنا ہے۔" فرحت نے روتے ہوئے کہا تھا۔

"دیکھنا چاہتی ہو کہ وہ زندہ ہے' یا پھر مر گئی ہے؟" عمر نے خفگی سے اسے گھورا۔

"پلیز عمر! خدا کے لیے مجھے اتنا گھٹیا مت سمجھو' وہ میری جان ہے' میں نے اس کی پرورش کی ہے۔" وہ چیخ کر بولی تھی۔

"اس پرورش کرنے کے صلے میں اس کی جان مانگ رہی ہو' فرحت! اگر تم یہ چاہتی ہو کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ دے' تو ایسا ہرگز نہیں ہونے والا' اس کی ماں نہیں ہے مگر باپ زندہ ہے' میں اپنی بیٹی کو تمہارے سائے سے بھی دور رکھوں گا۔" عمر بے جذباتی ہو رہا تھا۔

فرحت نے پھر خاموشی اختیار کر لی' جبکہ عمر کا دوست اکمل جو پچھلے پورے دن سے عمر کا رویہ فرحت کے حوالے سے دیکھ رہا تھا بول اٹھا۔

"عمر۔ فرحت بھابھی پر الزام لگانا چھوڑ دو یہ وقت ایسا نہیں ہے' بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ بچی کو ہوش آجائے۔"

"بھابھی! آپ اندر چلی جائیں' آپ وہ سکون آجائے گا۔" اکمل نے فرحت کی کیفیت دیکھ کر کہا تھا' جو پورے دن سے بھوکی پیاسی اسپتال کے باہر بیٹھی تھی۔

عمر اسپتال کے باہر آگیا' اکمل بھی اس کے پیچھے پیچھے آنکلا' اور عمر سے کہنے لگا۔

"یار! اپنے غصے پر کنٹرول کرو' وہ اتنی ظالم نہیں ہیں' تیرہ سال سے اس کی پرورش کر رہی ہیں' وہ بھی سامیہ کی جان نہیں لے سکتیں اور اگر انہوں نے لینی ہوتی تو وہ اتنا عرصہ کیا انتظار کرتیں۔"

عمر نے سنجیدگی سے کہا۔ "سونیا نے کہا تھا کہ مما نے سامیہ کو دھکا دیا ہے' بس اس بات کو لے کر سوچ رہا ہوں' بچے کبھی جھوٹ نہیں بولتے' اگر فرحت نے ایسا کیا ہے تو میں اس کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔"

اس کی آنکھیں پرنم سی ہو گئیں' وہ جو فرحت کو اپنی زندگی سمجھتا تھا مگر اس حادثے کے بعد اسے لگا جیسے جس گھر کو وہ جنت سمجھتا تھا در حقیقت وہ دوزخ تھی'

جس میں اس کی بیٹی سامیہ جھلس رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"پاپا! مما کدھر ہیں؟" اس نے آنکھیں کھولتے ہی پوچھا تھا۔ جب اس کو کمرے میں چاروں طرف فرحت نظر نہ آئی تھی۔

عمر نے حیرانی سے سامیہ کو دیکھا۔ جس کی نظریں فرحت کو تلاش کر رہی تھیں۔

"بیٹا! اسپتال کے باہر ہے' میں ابھی بلا کر لاتا ہوں۔"

فرحت' عمر کے کمرے سے آنے کے بعد باہر نکل گئی تھی' وہ عمر کے رویے کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی جو اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتا تھا۔

عمر' سامیہ کے کہنے پر فرحت کے پاس گیا' وہ بینچ پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھوں میں تسبیح تھی۔

"سامیہ کو ہوش آگیا ہے' وہ تمہیں بلا رہی ہے۔" عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"سامیہ کو ہوش آگیا۔" وہ تیزی سے اٹھی عمر خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیا۔

"مما۔ آپ کہاں تھیں؟" اس نے رونی صورت بنا کر پوچھا۔

"بیٹا! آپ کے لیے باہر دعا کر رہی تھی' میری چندا کو ہوش آگیا۔" اس نے سامیہ کا ماتھا چوم کر کہا۔

عمر نے غصیلی نظر فرحت پر ڈالی' اور منہ میں بڑبڑایا۔ "ڈراما بند کرو۔" جو فرحت نے سن لیا تھا۔ سامیہ اس کے گلے سے لگی ہوئی تھی' عمر کا دل چاہا کہ وہ اپنی بیٹی کو اس سے الگ کر دے۔

وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامیہ کو فرحت نے سوپ پلایا۔ وہ فرحت کو غصے سے دیکھ رہا تھا جو عمر کے غصے کو نظر انداز کر کے سامیہ کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئی تھی کہ وہ اسپتال میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی۔

✡ ✡ ✡

"وہ میری مما نہیں ہیں' وہ مجھے مار رہی تھیں

مجھے جان سے مار دینا چاہتی تھیں۔ مگر سامیہ اُن کی بیٹی کی جان خطرے میں پڑ گئی۔"

وہ انکل کو بتا رہی تھی۔ انکل نے اس سے پوچھا تھا کہ سامیہ کو کیسے چوٹ آئی ہے۔ سونیا کی بات پر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ سونیا جو فرحت کی سگی بیٹی تھی' وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ وہ تمہاری ماں نہیں ہے؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔

"سچ میں انکل۔۔۔ وہ میری ماں نہیں ہیں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"بیٹا! وہ تمہاری مما ہیں' تمہیں کس نے ان کے خلاف بھڑکایا ہے؟" انکل نے حیرت سے پوچھا۔

دراصل سونیا مسلسل انکار کر رہی تھی کہ وہ اسپتال نہیں جائے گی' وہاں فرحت اس کو جان سے مار دے گی کیونکہ وہ اس کی بیٹی نہیں ہے۔

انکل اور اس کی بیوی ایک دوسرے کو تکنے لگے کہ وہ سونیا کو سچ کیسے بتائیں کیونکہ وہ عمر کی غیر موجودگی میں کوئی بات نہیں بتا سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"بھابھی! خدا کے لیے اتنا گھٹیا الزام مجھ پر مت لگائیں۔" مومنہ نے جب پیسے نہ دیے تو صدف بھابھی نے اس کے دونوں بھائیوں کے کان بھر دیے کہ مومنہ کا کسی غیر مرد سے تعلق ہے' اور وہ پیسے اسے دے آئی ہے۔

"میری مما کے خلاف کوئی بات نہ کریں۔" مریم غصے سے چیخی۔ یعقوب اور فراز' صدف کے ساتھ اس سے جھگڑا کر رہے تھے۔ فراز غصے سے بولا' "جیسی ماں' ویسی بیٹی' اور ویسا باپ۔"

"میرے بابا کو کچھ مت کہیں۔" اس نے آنکھیں دکھائیں۔

"اتنا بابا' بابا کر رہی ہو تو پھر جاؤ' اپنے باپ کے گھر رہو۔" اس نے غصے سے کہا تھا۔ "مریم بڑوں کے مسئلے پر مت بولو۔" مومنہ نے اس کو خاموش کروایا' جو یہ بول رہی تھی کہ جب یہ گھر چھوڑ دیں گے' مگر کہاں جائیں گے' یہ اس کو نہیں پتا تھا' یعقوب نے تو حتمی فیصلہ دیا کہ وہ رحیم سے جو خرچ مریم کا لے گی وہ سارا ان کے حوالے کر دیا جائے۔ مجبور ہو کر مومنہ نے الماری سے پیسے نکال کر صدف کو تھما دیے۔ تاکہ اس کے بھائیوں کو یقین ہو کہ اس نے پیسے کسی بھی مرد پر نچھاور نہیں کیے تھے۔ پیسے دیکھ کر دونوں بھائیوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں۔ مریم رو رہی تھی' اس نے چپ کروایا' مگر وہ ضد کرنے لگی کہ اس کو بابا کے پاس جانا ہے' مومنہ نے بمشکل اسے بہلایا' مگر اگلی صبح مومنہ کی آنکھ کھلی تو وہ بخار میں تپ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بھابھی! مریم کو بہت تیز بخار ہے' میرے پاس دوائی کے پیسے نہیں ہیں' تھوڑے سے پیسے دے دیں۔"

مومنہ' صدف کے کمرے میں آئی تو وہ بچوں کو ناشتہ کھلانے میں مصروف تھی۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں' تمہارے بھائی کے پاس ہیں' وہ گھر جب آئیں گے تو لے لینا۔" صدف نے غصے سے کہہ کر منہ موڑ لیا۔

مومنہ سر جھکائے کمرے سے باہر آئی تو رخسانہ سامنے کھڑی تھی۔ رخسانہ کو بھی فراز نے تنگ کر کے رکھا تھا۔ مگر مومنہ کی حالت دیکھ کر اس نے اپنے قدم کمرے سے نہیں نکالے تھے۔

رخسانہ نے افسردگی سے کہا' "تم ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اس کے ماتھے پر رکھو' میں صدف بھابھی سے پیسے لیتی ہوں۔"

مریم بخار کی حالت میں بابا۔۔۔ بابا۔۔۔ پکار رہی تھی۔ رخسانہ کو بھی جب صدف نے پیسے دینے سے انکار کر دیا تو مومنہ نے فرحت کے گھر فون کیا' مگر فرحت گھر پر نہ تھی۔ مومنہ [illegible] کے خلاف [illegible] تھی۔

پھر مومنہ مریم کے ماتھے پر دن بھر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی' مگر بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

شام کو یعقوب بھائی جب گھر پہنچے تو اس نے پیسے مانگے' مگر انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ انہوں نے بزنس کے سلسلے میں کسی سے ادھار لیا ہوا تھا' وہاں کسی کو ادا کر کے آئے ہیں۔ اس وقت ان کے پاس پیسے نہیں۔

"تم رحیم کو فون کر کے اطلاع دے دو کہ تمہیں پیسے چاہئیں' وہ بھجوا دے گا۔" صدف نے مسکرا کر کہا تھا۔

رات بیت گئی تھی' مگر مریم کا بخار نہ اترا۔ مجبور ہو کر اس نے تین سال کے بعد رحیم کے نمبر پر کال کی۔ دوسری طرف رحیم نے فون اٹھایا' مومنہ نے ہچکچاتے ہوئے اسے بتایا کہ تھوڑے پیسوں کی ضرورت ہے' اس نے مریم کے بخار کے متعلق بات بتانا مناسب نہ سمجھا۔

رحیم نے مریم کا حال دریافت کیا' مگر مومنہ نے روتے ہوئے فون کاٹ دیا۔

رحیم سمجھ گیا کہ مومنہ کسی مسئلے سے دوچار ہے' اس نے اپنے بھائی سعد کے ہاتھ پچاس ہزار مومنہ کو بھجوا دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہائے۔۔۔ ہائے میری بچی کو کیا ہوا؟" فراز نے مریم کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ اس وقت جب یعقوب نے اس کو اطلاع دی کہ رحیم نے پچاس ہزار بھیجے ہیں۔

صدف بھابھی نے فراز کی باہوں سے مریم کو اٹھانا چاہا' مگر مریم کے وزن سے وہ اس کو اٹھا نہ پائی تو یعقوب نے اس کو گود میں اٹھا لیا اور اسپتال لے گئے۔ مگر مریم کے زبان پر بابا۔۔۔ بابا کے الفاظ تھے۔ مومنہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پچھلی ایک رات سے اس کے بھائیوں کو مریم کی کوئی فکر نہ تھی' پیسوں کے لالچ میں وہ مریم سے لاڈ پیار کر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں کہ وہ پیسوں سے مریم کے لیے سب رشتوں کا پیار بھی خرید دے' تو بھی وہ پیار سچا نہیں ہوگا' جیسے رحیم۔۔۔ اس کے باپ کا ہے۔

☼ ☼ ☼

سامیہ کو ڈسچارج کر دیا گیا' سامیہ گھر آ گئی' عمر نے بزنس سے چھٹیاں لے لی تھیں۔

"پاپا! مجھے مما کے ہاتھ سے سوپ پینا ہے۔" سامیہ نے ضد کرتے کہا تھا' جب عمر نے اس کو اپنے ہاتھوں سے سوپ پلانا چاہا۔

"وہ۔۔۔ کچن میں کام کر رہی ہوں گی' تم بیٹا جلدی سے سوپ ختم کرو' میں پلا دیتا ہوں۔" عمر نے اس کو سوپ پلانے کی کوشش کی۔

سامیہ رونے لگی تو عمر مجبور ہو کر فرحت کے پاس کچن میں گیا۔ اس نے فرحت کو سامیہ سے دور رہنے کو کہا تھا۔ سوپ بھی اس نے سامیہ کے لیے خود تیار کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے بھائی کو ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے' تم رحیم سے بات کرو۔" صدف نے ایک ہفتے کے بعد مومنہ سے بات کی۔

"پلیز بھابھی۔۔۔ اتنی بڑی رقم میں کیسے مانگ سکتی ہوں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی رحیم نے پچاس ہزار بھیجے' اس کا بھی کوئی حساب آپ لوگ نہیں دے رہے ہیں۔" مومنہ نے خفگی سے جواب دیا۔

"تمہاری بیٹی کی ادویات پر ہی خرچ ہوئے ہیں۔" صدف نے نظریں چرا کر کہا تھا۔ مومنہ خاموش ہو گئی' لیکن اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس کو بھی پیسوں کی ضرورت ہے' وہ رحیم کے پاس جا کر ادھار لے لے' وہ رحیم سے کوئی پیسہ نہیں مانگے گی۔

صدف بوکھلا گئی' "اپنوں میں ادھار کیسا؟"

مومنہ پھٹ پڑی۔

"تو کیا میں آپ لوگوں کے لیے پرائی ہوں۔۔۔ مجھ سے تو آپ ایک ایک پیسہ وصول کر رہے ہیں۔"

"اوہو۔۔۔ تم بات کو سمجھ کیوں نہیں رہی ہو!" صدف نے مومنہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"دو کیا سمجھانا چاہتی ہیں۔۔۔؟" اس نے خفگی سے پوچھا۔

"مومنہ! رحیم سے پیسے وصول کرو۔۔۔ اس نے سدرہ کو تمہارے اوپر فوقیت دی۔۔۔ اس کی جائیداد پر مریم کا حق ہے۔ اس سے اپنا حق مانگو۔" صدف نے کہا۔

مومنہ سکتے میں آگئی۔ صدف نے پہلے بھی اسے بھڑکا کر اس کا گھر برباد کیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اسے عقل آچکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ہی گھر میں خود کو پرایا سمجھ رہی تھی۔۔۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا۔ عمر دو دن آفس نہیں گیا تھا اور سارا وقت سونیا' سامیہ کے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ فرحت کا سایہ بھی سامیہ کے قریب برداشت نہیں کرتا تھا۔ فرحت بری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ عمر کے رویے سے ظاہر تھا کہ وہ اس کو گھر میں بھی بمشکل برداشت کر رہا تھا۔

عمر کچن میں کھڑا کچھ بنا رہا تھا۔ وہ کچن میں آئی تو اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

"میں گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔۔۔ اس گھر میں شاید میری کوئی ضرورت نہیں رہی۔" وہ آنسو پی کر بولی تھی۔

عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں سونیا کو ساتھ لے کر جانا چاہتی ہوں۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

عمر نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔ اور غصے سے بولا۔۔۔ "وہ میری بھی بیٹی ہے۔"

"میں اکیلی اماں کے گھر جاؤں گی تو شاید وہ فکر مند ہو جائیں گی۔ تم اماں کی طبیعت سے واقف ہو۔" اس نے کانپتے ہونٹوں سے کہا تھا۔

"سونیا جانا چاہتی ہے تو لے جاؤ۔۔۔" اس نے بھی غصے سے جواب دیا۔

فرحت سونیا کا سامان پیک کرنے لگی۔

"مجھے نانی جان کے گھر نہیں جانا۔" سونیا نے صاف انکار کر دیا۔ "وہ میری نانی نہیں ہیں۔ سامیہ کی نانی ہیں۔" اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"کیوں۔۔۔ وہ تمہاری نانی کیوں نہیں ہیں؟" وہ سونیا کی بات پر حیرت زدہ سی رہ گئی۔

سونیا نے خفگی سے کہا۔ "آپ میری سگی ماما نہیں ہیں۔۔۔ آپ سامیہ کی سگی ماما ہیں۔۔۔ میں نے اس دن آپ کی اور مومنہ آنٹی کی بات سن لی تھی۔ آپ جب ان سے کہہ رہی تھیں کہ میں نے سامیہ اور سونیا میں کوئی فرق نہیں سمجھا۔۔۔ مگر سامیہ کو زیادہ پیار بھی نہیں کرتی ہوں۔ وہ آپ کی سگی بیٹی ہے۔۔۔ اس لیے ناں۔" سونیا نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ ہی دی تھی۔ فرحت کو یوں لگا جیسے اس کے جسم میں سکت ہی نہیں رہی۔

عمر جو سونیا سے پوچھنے کے لیے اس کے کمرے میں آیا تھا۔۔۔ سونیا کی بات سن کر وہیں ٹھہر گیا۔

اس نے فرحت کو کتنا غلط سمجھا تھا۔

جس نے اپنی سوتیلی بیٹی کو اتنا پیار دیا تھا کہ اس کی اپنی اولاد اس کو سوتیلی ماں سمجھنے لگی تھی۔۔۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔

فرحت کی آنکھیں بھر آئیں۔

"آپ مجھے بتاتیں کہ میری ماما کدھر ہیں۔۔۔ مجھے اپنی ماما کے پاس جانا ہے۔" سونیا رو پڑی۔

فرحت نے اس کو سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تم میری سگی بیٹی ہو۔۔۔ اور سامیہ۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور بولی۔

"اپنے بابا سے پوچھ لو وہ تمہیں سچ بتا دیں گے۔" وہ اپنی سگی بیٹی کے سامنے بے بس کھڑی تھی۔

عمر کی آنکھیں بھر آئیں۔

سونیا نے دروازہ کھولا تو سامنے عمر کو پایا۔ وہ عمر سے لپٹ گئی۔

"بابا۔۔۔! مجھے بتائیے' میری ماں کہاں ہے؟ میں کس کی بیٹی ہوں؟"

عمر نے اس کا ماتھا چوم کر اس کو یقین دلایا کہ فرحت سچ کہہ رہی ہے۔۔۔ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اسی وجہ سے وہ روز جھگڑا کرتی تھی کہ سامیہ اور اس کی ماں کو بابا گھر سے نکال دیں۔۔۔ اس نے عمر کو بتایا ۔۔۔ کہ فرحت نے سامیہ کو پیچھے ہٹایا تھا تو سامیہ کا پاؤں پھسل گیا تھا۔

عمر سکتے میں آگیا۔۔۔ فرحت نے سامان اٹھایا اور لرزتی آواز میں بولی۔

"سونیا! تم میرے ساتھ آ رہی ہو یا پھر یہاں رہنا چاہتی ہو؟" اس نے دروازہ کھول کر پوچھا تھا۔

سونیا خاموشی سے فرحت کے ساتھ چل پڑی۔۔۔ عمر میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ فرحت سے کوئی بات کر سکتا۔

☼ ☼ ☼

وہ ٹرین میں سونیا کے ساتھ بیٹھی تھی۔۔۔ جب اس کو مریم اور مومنہ اسٹیشن پر نظر آگئیں۔۔۔ فرحت نے مومنہ کو پکارا اور ٹرین سے اتر کر پوچھنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

مومنہ نے آہ بھر کر کہا۔ "میں اپنے گھر جا رہی ہوں ۔۔۔" پھر اس نے فرحت کو ساری بات بتا دی کیونکہ صدف نے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ اس نے مومنہ سے چھپا کر رحیم سے مریم کا حصہ مانگا تھا۔ مومنہ سمجھ چکی تھی کہ اب اس گھر میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ سو اپنی بیٹی کے مستقبل کے لیے اس نے یہ قدم اٹھایا۔

"ماما! مریم اپنے بابا کے پاس جا رہی ہے۔۔۔ مجھے بھی اپنے بابا کے پاس ہی رہنا ہے۔" سونیا نے کہا تو فرحت گم صم سی کھڑی رہ گئی۔ اس کے قدم پھر ٹرین کی طرف نہ بڑھ سکے۔

مومنہ اور مریم ریل پر سوار ہو گئیں۔۔۔ وہ اپنی خوشیاں پانے کے لیے اپنے حقیقی گھر جا رہی تھیں۔

فرحت اور سونیا نے بھی اپنے قدم گھر کی طرف بڑھا دیے۔

فرحت گھر پہنچی تو عمر نے سامیہ کا سامان باندھا ہوا تھا۔۔۔ وہ سامیہ کو بھی فرحت کے پاس بھیج رہا تھا۔۔۔ سامیہ کو ساری حقیقت کا پتہ چل گیا تھا۔۔۔ وہ رو رہی تھی۔۔۔ کہ اس کی وجہ سے اس کی ماما پر الزام لگایا گیا۔۔۔ فرحت کو دیکھ کر وہ اس سے لپٹ گئی۔ سونیا بھی ماں کے گلے لگ گئی۔

عمر خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ پشیمان تھا۔ فرحت سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔

"عمر۔۔۔! بازار سے چکن لے آئیں۔۔۔ میں نے سونیا کے لیے حلیم۔۔۔ اور سامیہ کے لیے بریانی تیار کرنی ہے۔" وہ اسی طرح مسکرا کر بولی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

عمر ہکا بکا رہ گیا۔

"ماما۔۔۔ آج ہماری پسند کا نہیں۔۔۔ آپ بابا کی پسند کا پکائیں۔۔۔ مٹن کا پلاؤ۔" سونیا اور سامیہ ہنس کر بولیں۔

"ٹھیک ہے آج بابا کی پسند کا ہی پکے گا۔ آپ مٹن لا دیں۔۔۔ میں پلاؤ بنانے کی تیاری کرتی ہوں۔" وہ مسکرا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

عمر بھی اس کے پاس کچن میں آ کھڑا ہوا۔۔۔ اس نے فرحت کا ہاتھ تھام لیا۔

"فرحت! کیا تم مجھے معاف کر سکو گی؟"

"اگر مٹن پلاؤ کھانا ہے تو جلدی جائیں ورنہ کھانا نہیں ملے گا۔" فرحت مسکرا کر بولی۔

فرحت نے پیاز کاٹی تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنی بچیوں کو دیکھا۔۔۔ جو کھیل میں مصروف تھیں۔ فرحت نے آنسو پونچھے۔۔۔ اس کے دل سے دعا نکلی کہ اس کی بچیوں کی جب بھی آنکھیں بھر آئیں تو اس کا سبب صرف پیاز ہو۔۔۔ رشتے میں کمی نہ ہو کیونکہ ایک عورت کی زندگی میں اس کے گھر سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔

☼

نمرہ احمد

مصحف

محمل ابراہیم' آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرح دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد بابا آغا کریم اور چچاؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ مسرت سیدھی سادی سی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا قلق محمل کو ہے۔ گھر والوں خصوصاً "تائی مہتاب" کا رویہ ماں بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محمل ٹیوشن سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

آغا ابراہیم کے اس محل نما گھر میں آغا کریم اور مہتاب تائی فواد' حسان' وسیم' سدرہ اور مہرین کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے جڑواں بھائی آغا غفران اور فضہ چچی کے تین بچے حسن' ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعمہ بالائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو' معیز اور معاذ ہیں جبکہ رضیہ پھپھو کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں تائی مہتاب اور آغا کریم کے فرزند فواد کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو' فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محمل کو تائی مہتاب کے خاندان کی اس دکھتی رگ کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ فواد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظرانداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو' سدرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور ذہانت سے حسد ہے۔

کالج جاتے ہوئے ہر روز اسے ایک پراسرار سیاہ فام لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محمل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محمل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی' حال' مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اسے گرفت میں

مکمل ناول

کرنے کا نسخہ ہے۔ محمل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محمل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محمل آغا کریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلد ہی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی اسکالرشپ مل جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ایرونا ٹیکل انجینئر فرقان کا رشتہ سدرہ کے بجائے محمل کے لیے دے دیا جاتا ہے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ تائی مہتاب فوراً" انکار کر دیتی ہیں۔ جس پر محمل اور مسرت کو بہت رنج ہوتا ہے۔ فواد اس سے ہمدردی جتاتا ہے اور اسے فیکٹری میں آفرشپ دینے اور جاب کرنے کے لیے آغا جان سے بات کرتا ہے۔ جس پر وہ انکار کر دیتے ہیں۔ حالات سے تنگ آکر محمل اس پر اسرار لڑکی سے سیاہ جلد والی کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے قبل ہی تائی مہتاب سب کے ساتھ اسے رنگے ہاتھوں پکڑتی ہیں۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ محمل سمیت سب رنگ رہ جاتے ہیں۔ تائی مہتاب اپنی بے عزتی پر بے حد تلملاتی ہیں۔ محمل غصے میں آکر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کرتی ہے اور اسے سخت سست بھی سناتی ہے۔ اس دن محمل پر وہ لڑکی بجھ سی جاتی ہے۔

آغا فواد سب سے چھپ کر محمل کو فیکٹری لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ اسے بیش قیمت ملبوسات بھی دلواتا ہے تاکہ سدرہ کی منگنی پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ محمل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن، محمل کو فواد کے سائے سے بھی دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے تو محمل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میریٹ میں ڈنر کا جھانسہ دے کر فواد محمل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ راستے میں کسی ڈیل کے نہ ہونے پر نقصان کا ڈراما رچا کر محمل کو کلائنٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جاکر محمل کو آغا فواد کے اصل چہرے کا ادراک ہوتا ہے۔ فواد نے اسے ایس پی کے سامنے محمل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا اس صورت حال پر محمل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ وہ اسے جتاتی ہے کہ آغا فواد اس کا بھائی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۲
دوسری قسط

اس کے ارد گرد جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔ اسے بہت زور کا چکر آیا تھا۔ وہ گرنے ہی لگی تھی کہ ہمایوں نے اس کی دوسری کہنی سے پکڑ کر اسے کھڑا رکھا۔

"اب سیدھی طرح بتاؤ کہ تم ہمیں بے وقوف بنا رہی ہو یا آغا نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔ تم محمل ابراہیم ہو اور وہ فواد کریم اور وہ تمہارا سگا بھائی ہے؟ اتنے عرصے سے لڑکیاں فراہم کر رہا ہے، پہلے تو کبھی اپنی بہن کا سودا نہیں کیا۔"

"نہیں۔" اس نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ فواد بھائی میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ۔۔۔ آپ میری ان سے بات کرائیں۔۔۔ آپ خود سن لینا اور میرا ویٹ کر رہے ہیں

ہمیں فنکشن پہ جانا تھا۔"

ہر عام انسان کی طرح محمل کو بھی جھوٹ کی ہلکی پھلکی عادت تو تھی ہی اور اسی بری عادت کا کمال تھا کہ خود بخود اس کے لبوں سے ڈنر کی جگہ فنکشن نکلا تھا۔ کہیں لاشعور میں اسے احساس تھا کہ اگر وہ اپنے اور فواد کے خاص ڈنر کا کہتی تو وہ اسے بری لڑکی سمجھتے۔

"راؤ صاحب! آغا فواد کو فون ملائیں۔"

"رائٹ سر!" راؤ موبائل پہ نمبر ملانے لگا۔

"اور اسپیکر آن رکھیں۔" اس نے کہہ کر ایک گہری نظر محمل پہ ڈالی جو بے قرار اور ہراساں سی راؤ کے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھ رہی تھی۔

"جی راؤ صاحب۔" ایک دم کمرے میں فواد کی

آواز گونجی۔ "مال پہنچ گیا؟"

"پہنچ تو گیا ہے مگر پرزے آواز بہت دے رہے ہیں۔ آپ بات کرلیں۔" اس نے فون آگے بڑھا کر محمل کے کان سے لگایا۔

"ہیلو فواد بھائی!" وہ رو پڑی تھی۔ "فواد بھائی! یہ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ آپ پلیز ان کو۔۔۔"

"بکواس مت کرو اور میری بات غور سے سنو۔ تمہیں وہ ڈائمنڈ رنگ چاہیے یا نہیں؟ چاہیے ہے نا! تو جیسے اے ایس پی صاحب کہتے ہیں، کرتی جاؤ۔"

"فواد بھائی!" وہ حلق کے بل چلائی۔ "یہ میرے ساتھ کچھ غلط کریں گے۔"

"وہ جو کرتے ہیں کرنے دو، صرف ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ اب زیادہ بک بک مت کرنا، صبح تمہیں ڈرائیور لینے آجائے گا۔" ساتوں آسمان اس کے سر پہ ٹوٹے تھے۔

وہ ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

"صرف ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ صرف ایک رات کی ہی تو بات ہے۔" اس کی آواز اس کے ذہن پہ ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"بس ایک ڈائمنڈ رنگ کا ادھار لیا ہے اس نے تمہیں؟ اور تم تو کہتی ہو کہ وہ تمہارا بھائی ہے؟" فون اس کے کان سے ہٹا کر بند کرتے ہوئے ہمایوں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

وہ اسی طرح پتھر کا بے جان بت بنی کھڑی تھی۔ اس کا ذہن ڈل ہو گیا تھا۔ آنکھیں نیم بند ہو رہی تھیں۔

"راؤ صاحب! پتہ کرائیں کہ یہ واقعی فواد کریم کی بہن ہے یا نہیں اور اس کی بات میں کتنی سچائی ہے۔ تو ہم بعد میں خود معلوم کر لیں گے۔ نکلیں، چلیں۔" اس نے زور سے آواز دی۔

اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے تھے، ساکت کھڑے وجود میں سے گویا کسی کی جان آہستہ آہستہ نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے

اندھیرے بادل چھانے لگے تھے۔ ذہن گہن میں ڈوبتے ہوئے اندر گرتے تھے۔

"شمس! اسے اوپر والے کمرے میں بند کر دو اور دھیان رکھنا کہ بھاگنے نہ پائے اور بلکہ۔" اس سے پہلے کہ اس کا فقرہ مکمل ہوتا، محمل چکرا کر گری اور اگر اس نے اس کو دونوں بازوؤں سے تھام نہ رکھا ہوتا تو وہ نیچے گر پڑتی۔

"محمل۔۔۔ محمل!" وہ اس کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں اور ذہن گہرے اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھوں پہ کچھ نمی ڈالی گئی تھی۔ گیلے پن کا احساس تھا یا کچھ اور اس نے ایک دم ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔

"اٹھ جاؤ، بہت سو لیا۔" وہ گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر سامنے کرسی پہ جا بیٹھا تھا۔

چند لمحے وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی اور جب آہستہ آہستہ ذہن بیدار ہوا تو جیسے چونک کر سیدھی ہوئی۔

وہ بڑا سا پر تعیش بیڈ روم تھا۔ قیمتی صوفے، قالین اور بھاری خوب صورت پردے۔ وہ ایک بیڈ پہ لیٹی تھی اور اس کے اوپر بیڈ کور ڈالا ہوا تھا۔ سامنے کرسی پہ وہ اکھڑے اکھڑے تیور کے ساتھ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

اسے یاد آیا وہ اسے کسی کمرے میں بند کرنے کی بات کر رہے تھے جب وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب وہ کدھر تھی؟ اور اسے کتنی دیر بیت چکی تھی؟ گھر میں سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔

وہ گھبرا کر قدرے سیدھی ہو بیٹھی۔ وہ ابھی تک اسی سیاہ جھلملاتی ساڑھی میں ملبوس تھی اور پوشش کی لگائی گئی ساری پنیں ویسے ہی کسی کے لگی تھیں۔

"میں۔۔۔ میں کدھر ہوں؟ کیا وقت ہوا ہے؟ صبح ہو

گی؟" وہ پریشان سی ادھر ادھر دیکھنے لگی تو سامنے وال کلاک پہ نگاہ پڑی۔

ساڑھے تین بج رہے تھے۔

"ابھی صبح نہیں ہوئی اور آپ وہیں ہیں جہاں آنے کے لیے فواد نے آپ کو ڈائمنڈ رنگ کالالچ دیا تھا۔"

"مجھے فواد بھائی نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا انہوں نے کہا تھا کہ میں فائل سائن کروا کر واپس آجاؤں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"میں کیسے مان لوں کہ تم سچ کہہ رہی ہو آغا فواد تو کہتا ہے کہ تم اس کے گھر میں پلنے والی ایک یتیم لڑکی ہو نہ کہ اس کی بہن۔"

"یتیم ہوں تب ہی تو تم جیسے عیاشوں کے ہاتھ بیچ ڈالا اس نے مجھے جو میرا سگا تایازاد بھائی تھا۔ تم سب گدھوں کا بس یتیموں پہ ہی تو چلتا ہے۔" وہ پھٹ پڑی تھی۔

"مجھے یہ آنسو اور جذباتی تقریریں متاثر نہیں کرتیں۔" وہ اب اطمینان سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ "مجھے صرف سچ سننا ہے اور ٹھیک ٹھیک ورنہ میں تمہارے لے جا کر تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے وہ تمہیں کتنا شیئر دیتا رہا ہے، کدھر کدھر بھیجا ہے اس نے تمہیں اور تمہارے اس گینگ میں اور کون کون ہے؟" سگریٹ کا ایک کش لے کر اس نے دھواں چھوڑا تو لمحے بھر کو دھوئیں کے مرغولے ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئے۔

"مجھ سے قسم لے لو میں سچ۔"

"وہ قسم لے لوں؟ واقعی؟"

"ہاں لے لیں۔"

"سو بندوں کے سامنے عدالت میں اٹھاؤ گی قسم؟" وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا سگریٹ لبوں میں دبائے کش لے رہا تھا۔

"میں تیار ہوں مجھے عدالت میں لے جائیں میں یہ سب دہرانے کو تیار ہوں۔"

"تب ہو گا جب میں تمہارے کہے پہ یقین کروں گا۔ یقین جو ابھی تک مجھے نہیں آیا۔" اس نے سگریٹ ایش ٹرے پہ جھٹکی۔ راکھ کے چند ٹکڑے ٹوٹ کر گرے۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرا کسی گینگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے فواد بھائی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"تم اسے بچانے کی کوشش کر رہی ہو میں جانتا ہوں۔"

"نہیں پلیز۔" وہ لحاف اتار کر بستر سے اتری اور گھٹنوں کے بل اس کے قدموں میں آبیٹھی۔

"اے ایس پی صاحب!" اس نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں لاعلم تھی کہ آپ کا کیا مقصد ہے کہ فواد بھائی کا کیا مقصد ہے۔ میں میریٹ میں ڈنر پہ جانے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" اس کی کانچ سنہری آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گرنے لگے۔ "اللہ کی قسم میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اللہ کی قسم کھانے کے لیے آغا فواد نے کیا آفر کیا تھا؟ ڈائمنڈ کا سیٹ؟"

وہی سخت پولیس آفیسر اور مخصوص طنزیہ انداز۔ جتنا وہ شخص وجیہہ تھا اس کی زبان اس سے بڑھ کر کڑوی تھی۔ محمل کا دل چاہا، اس کا منہ نوچ لے اور اگلے ہی پل وہ اس پہ جھپٹی اور اس کی گردن دبوچنی چاہی مگر ہمایوں نے اس کی دونوں کلائیاں اپنی گرفت میں لے لیں۔ اسی کشمکش میں محمل کے دو ناخن اس کے گال سے رگڑ کھا گئے۔

"صرف آنکھیں نہیں، تمہاری تو حرکتیں بھی بلیوں والی ہیں۔" وہ کھڑا ہوا اور اس کو کلائیوں سے پکڑے پکڑے ساتھ کھڑا کیا، پھر جھٹکا دے کر پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ دو قدم پیچھے جا ہوئی۔

"مجھے گھر جانا ہے۔ مجھے گھر جانے دو۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔" وہ مڑ کر جانے لگا تو وہ تڑپ کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور پھر سے ہاتھ جوڑ دیے۔ "صبح ہو گئی تو بدنام ہو جاؤں گی۔"

"میں نے کہا نا بی بی مجھے یہ جذباتی تقریریں متاثر نہیں کرتیں۔" اس نے اپنے گال پہ ہلکا سا ہاتھ پھیرا، پھر استہزائیہ مسکرایا۔ پھر کہا۔ "تم بہادر لڑکی ہو۔ میں تمہیں گھر جانے دوں گا مگر ابھی نہیں۔ ابھی تم ادھر ہی رہو گی۔ کم از کم صبح تک۔"

"میں بدنام ہو جاؤں گی اے ایس پی صاحب! رات گزر گئی تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

"ہو جائے! مجھے پروا نہیں ہے۔" وہ سگریٹ جھک کر ایش ٹرے میں پھینک کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ ہاتھ جوڑے کھڑی رہ گئی اور وہ دروازہ باہر سے بند کر کے جا چکا تھا۔ دروازے کی جانب وہ لپکی اور زور زور سے کھینچا۔ وہ باہر سے بند تھا۔

"دروازہ کھولو۔ کھولو۔" وہ دونوں ہاتھوں سے زور زور سے دروازہ بجانے لگی مگر جواب ندارد۔ وہ بے بسی سی وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

فواد۔ فواد اس کے ساتھ ایسا کر سکتا تھا؟ اسے یقین نہ آتا تھا۔ اس نے کیا کیا تھا فواد کا جو اس نے چند روپوں کے عوض اسے بیچ دیا؟

وہ گھٹنوں پہ سر رکھے "آنسو بہاتی" وہ شام یاد کر رہی تھی جب وہ اسے دیکھتے دیکھتے چونکا تھا اور چائے کا کپ لیتے ہوئے اس کی انگلیاں اس کے ہاتھ سے مس ہوئی تھیں۔

"کم عمر خوب صورت اور ان چھوئی۔" آغا نے کہا تھا۔ "ہماری ڈیمانڈ پہ پوری اترتی ہے۔"

تو وہ اس لیے چونکا تھا کہ کسی عیاش شخص کی بتائی گئی ڈیمانڈ پہ اس کے گھر میں پلنے والی وہ یتیم لڑکی پوری اترتی تھی۔

"تم کتنی خوب صورت ہو محمل! مجھے پتا ہی نہیں لگا۔" اس کے کہنے کا فسوں اور پھر اس کی وہ ساری

عنایتیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی کمزوری کیا ہے۔ اس نے اس کو اس کی من پسند چیزوں کی جھلک دکھائی یہاں تک کہ وہ جب اس کے مکمل قابو میں آگئی تو فواد نے اسے ادھر بھیج دیا اور وہ بھی کتنی بے وقوف اور سادہ تھی اسے پتا ہی نہ چلا۔ وہ اس کو آفس میں ادھر ادھر چیزیں سائن کروانے بھیج دیتا تھا اور کوئی کام تو اس نے محمل سے لیا ہی نہ تھا، وہ تب بھی نہ سمجھ سکی؟

اور اب یہ شخص ہمایوں وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ آدمی کون تھا اس سے یہ سب باتیں کیوں پوچھ رہا تھا اور اس کا کیا مقصد تھا۔ اسے صرف علم تھا تو اتنا کہ اگر رات بیت گئی تو صبح اسے کوئی قبول نہ کرے گا اور قبول تو شاید اب بھی کوئی نہ کرے۔ کوئی فواد کے خلاف اس کی بات پہ یقین نہیں کرے گا۔ کوئی اسے بے گناہ نہ سمجھے گا اور فواد وہ تو شاید سرے سے مکر ہی جائے کہ وہ کبھی محمل کو آفس لے کر گیا ہے۔ خدایا وہ کیا کرے؟

اس نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔ کمرہ قدرے دھندلا سا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں تو آنسوؤں کی دھند پیچھے کو سرک گئی۔

کمرہ نہایت خوب صورتی سے آراستہ تھا۔ قیمتی قالین، خوب صورت فرنیچر اور بھاری مخملیں پردے۔ پردے۔ وہ چونکی۔ کیا ان کے پیچھے کوئی کھڑکی تھی؟ وہ پردوں کی طرف دوڑی اور جھٹکے سے انہیں ایک رخ کھینچا۔ پردہ کھلتا چلا گیا۔

باہر ٹیرس تھا اور اس کی روشنیاں جل رہی تھیں، جن میں وہ بغیر دقت کے وہ گن مین چوکس کھڑے دیکھ سکتی تھی۔

اس نے گھبرا کر پردہ برابر کیا۔

"اللہ تعالیٰ! پلیز!" وہ رو رو کر دعا کرنے لگی اور جب دعا کرتے کرتے تھک گئی تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اپنا عکس دیکھا۔

رونے سے سارا کاجل بہہ گیا تھا، آنکھیں متورم اور قدرے بھیانک لگ رہی تھیں۔ جوڑا ڈھیلا ہو کر

گردن تک آگیا تھا اور گھنگھریالی لٹوں کے بل سیدھے ہونے لگے تھے۔

محمل ایک مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی، اس کے باوجود فواد کے اس بھیانک روپ کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ شروع میں تو اس نے ہمت ہار دی اور اعصاب جواب دے گئے، لیکن اب وہ کسی حد تک سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تھی۔ فواد سے سارے بدلے تو وہ بعد میں چکائے گی، ابھی اسے اس اکھڑ اور سرد مہر اے ایس پی کی قید سے نکلنا تھا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا، کچھ خاص نظر نہ آیا تو پھر وارڈ روب کھولا۔ اندر مردانہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے کچھ ہینگرز الٹ پلٹ کیے اور سوچ کر ایک کرتا شلوار نکالا۔ براؤن کرتا اور سفید شلوار۔ سب سے پہلے اس نے ساڑھی کے بوجھ سے نجات حاصل کی، پھر اس کرتے شلوار کو پہن کر بال سیدھے کر کے پونی میں باندھے اور باتھ روم میں جا کر منہ اچھی طرح دھویا۔ باہر نکلنے کے لیے کسی روزن کو تلاشتی اس کی نگاہوں کو باتھ روم کی کوئی کھڑکی، روشن دان نظر نہ آیا تو مایوسی پھیلتی گئی تھی کہ ایک دم چونک گئی۔

ایک دیوار میں شیلف تھا۔ اس میں شیمپو اور شیو کا سامان رکھا تھا۔ شیلف کا اندر سے رنگ باقی دیوار سے زیادہ چکنا سفید تھا۔ بھلا کیوں؟

وہ قریب گئی، سارا سامان نیچے اتارا، اور پھر بغور اندر دیکھتے ہاتھ پھیرا تو احساس ہوا کہ اس خانے کے پیچھے دیوار نہیں بلکہ کارڈ بورڈ کے سفید پھٹے تھے جو میخوں سے جڑے تھے۔ میخیں کچی اور تازہ لگ رہی تھیں۔

آگے کا کام بہت آسان تھا۔ اس نے سارے نل کھول دیے، تاکہ آواز باہر نہ جائے اور تھوڑی سی محنت کے بعد پھٹے کھینچ کر اتار لیے۔ وہ جلدی میں لگائے لگ رہے تھے، سو اسے زیادہ زور نہیں لگانا پڑا تھا۔

ان کے پیچھے کھڑکی تھی۔ اچھی خاصی چوڑی تھی۔ وہ اس میں سے باآسانی گزر سکتی تھی۔ بے حد مطمئن سی ہو کر محمل نے کھڑکی کھولی اور جب باہر جھانکا تو ایک لمحے کو تو سر چکرا گیا۔ کھڑکی سے دو فٹ کے فاصلے پہ دیوار تھی۔ گھر کی چار دیواری۔ کھڑکی اور چار دیواری کے درمیان صرف خلا تھا اور نیچے بہت نیچے پکا فرش تھا۔ وہ اس گھر کی غالباً" تیسری منزل پہ موجود تھی۔ شاید اسی لیے انہوں نے کچے سے پھٹے لگا دیے تھے، اندازہ ہوگا کہ وہ یہاں سے نہیں نکل سکتی۔

اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔ یہ آخری راستہ بھی بند ہوتا نظر آیا تھا۔ وہ مایوس سی نل بند کر کے کھڑکی بند کرنے ہی لگی تھی کہ سناٹے میں ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔

"آپ صحن میں کیا کر رہی ہیں؟"

"باجی وہ میڈم مصباح نے کہا تھا کہ اپنی بار تک منہ پہ گلاس رکھ کر پریکٹس کروں تو آواز اچھی نکلتی ہے وہی کر رہی تھی۔"

لڑکیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں بہت قریب نہیں تو بہت دور بھی نہیں تھیں۔ وہ چونکی اور پھر باتھ روم کی لائٹ بند کی۔

باہر کا منظر قدرے واضح ہوا۔ کھڑکی سے دیوار کا فاصلہ دو فٹ کا تھا، مگر وہ دیوار کی منڈیر تھی اور وہ آوازیں کہیں نیچے سے نہیں برابر سے آ رہی تھیں۔ بالکل برابر سے۔ یعنی اس باتھ روم کے برابر سامنے کا صحن تھا۔

اگر وہ یہ دیوار پھلانگ جائے تو...؟

اس اچھوتے خیال نے ذہن میں سر اٹھایا تو اس نے نوٹ اتارے اور نیچے جھانکا۔ اگر گر گئی تو نہیں بچے گی، مگر موت اس ذلت سے تو بہتر ہوگی جو صبح یا اس سے بھی بدتر گھر پہنچنے پہ اسے اٹھانی پڑے گی۔

اس نے دونوں ہاتھ چوکھٹ پہ رکھے ہی تھے کہ کمرے کا دروازہ کسی نے زور زور سے کھٹکھٹایا۔ دروازے کی وہ اندر سے کنڈی لگا چکی تھی، سو وہ کھول

نہ پار ہے تھے یقیناً" کسی نے مٹھے اکھاڑنے کی آواز سن لی تھی۔ وہ سہمے لیے بھر کو بھی نہ گھبرائی اور ہاتھ بڑھا کر دیوار کو ٹٹولا۔ وہ قریب ہی تھی۔

"اللھم۔ اونہوں۔" برابر والے صحن میں وہ گنگناری تھی۔ "آگے اور لے" اس کی مدھر مگر ہلکی آواز اندھیری فضاؤں میں گونجنے لگی۔

"اللھم جعل فی قلبی نورا۔" (اے اللہ میرے دل میں نور ڈال دے۔)

محمل نے دیوار پہ دونوں ہاتھ رکھے اور نیچے دیکھے بغیر پاؤں بھی اوپر رکھ دیا۔

"وفی بصری نورا" وفی سمعی نورا۔" (اور میری بصارت و سماعت میں نور ہو۔)

گھوڑے کی پیٹھ پہ سوار کی طرح سے وہ دیوار پہ بیٹھی اور نیچے دیکھا۔ صحن کی زمین بہت قریب تھی۔ دیوار چھوٹی سی تھی۔

"وعن یمینی نورا" وعن یساری نورا۔" (اور میرے دائیں اور بائیں جانب نور ہو۔)

اس نے آہستہ سے دونوں پاؤں زمین پہ رکھے۔ وہ بلاآخر برابر والوں کی چھت پہ آ گئی تھی۔ ابھی بھی وہ بے یقینی کی پلٹ کر دیوار کو دیکھنے لگی جس کے پار اسے اس کے ظالموں داور کا گھر تھا، بلکہ قید خانہ جس سے وہ نکل آئی تھی۔ اسی پل دیوار کے پار سے روشنی سی چمکی۔ وہ ٹھٹکی۔ یقیناً" کسی نے باتھ روم کی لائٹ جلائی تھی۔

اپنی بے وقوفی پہ اسے غصہ آیا۔ اسے باتھ روم کا دروازہ بند کر کے نل کھول کر آنا چاہیے تھا مگر عادی فراری تو نہ تھی، یا پھر اس لڑکی کی آواز کے فسوں میں کھو گئی تھی کہ ہوش نہ رہا تھا۔

"وفوقی نورا" وتحتی نورا" (اور میرے اوپر اور نیچے نور ہو۔)

سامنے ایک برآمدہ تھا جس کے آگے گرل لگی تھی۔ گرل کا دروازہ کھلا تھا اور دروازے سے کافی دور

ایک لڑکی زمین پہ بیٹھی، گرل سے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کیے منہ پہ گلاس رکھے گنگنا رہی تھی۔

"وامامی نورا" وخلفی نورا۔" (اور میرے آگے پیچھے نور ہو۔)

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ گھٹنوں کے بل رینگتی گرل تک آ گئی۔ وہ لڑکی دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی مناجات میں گم تھی۔

"واجعل لی نورا۔" (اور میرے لیے نور بنا دے۔)

محمل چاپ پیدا کیے بغیر کھلے دروازے سے اندر رینگ گئی۔ لڑکی اسی طرح مگن سی تھی۔

"وفی لسانی نورا" وعصبی نورا۔" (اور میری زبان و اعصاب میں نور ہو۔)

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا۔ لمبا سا برآمدہ خالی تھا۔ بس دور ایک فریج پڑا تھا اور اس کے ساتھ جالی دار الماری تھی۔ اندھیرے میں مدھم چاندنی کے باعث اسے اتنا ہی نظر آیا تھا۔ وہ بہت آہستہ سے اٹھی اور دبے پاؤں فریج کی طرف بڑھ گئی۔

"ولحمی نورا" ودمی نورا" (اور میرے گوشت اور لہو میں نور ہو۔)

فریج اور الماری کے درمیان چھپنے کی جگہ تھی، وہ جھٹ ان کے درمیان آ بیٹھی، مگر سامنے ہی دروازہ تھا۔ وہ لڑکی واپس آئی تو سیدھی اس پہ نگاہ پڑتی۔ نہیں اسے یہاں چھپنے کی بجائے نیچے جانا چاہیے۔

"وشعری نورا" وبشری نورا۔" (اور میرے بال اور کھال میں نور ہو۔)

اندر جانے والا دروازہ بند تھا۔ اگر اسے کھولتی تو آواز باہر جاتی۔ وہ پریشان سی کھڑی ہوئی۔ تب ہی جالی دار الماری کے ہینڈل سے کچھ لٹکتا نظر آیا۔ اس نے جھپٹ کر وہ اتارا۔ سیاہ چادر جیسا کالا برقعہ۔

اس نے چاند کی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چادر۔

"واجعل فی نفسی نورا" (اور میرے نفس میں نور ہو۔)

باہر وہ بے خبری ابھی تک دعا پڑھ رہی تھی۔
اس نے لبادہ کھولا۔ وہ سیاہ عبایا تھا اور ساتھ ایک گرے اسکارف۔ محمل نے پھر کچھ نہیں سوچا اور عبایا پہننے لگی۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ وہ مردانہ کرتا شلوار میں کھڑی ہے اور ننگے پاؤں ہے۔ وہ عبایا بھی اسے غنیمت لگا تھا۔

"واعظم لی نورا" (اور میری ہڈیوں میں نور ہو۔)
اسکارف کو اس نے بمشکل چہرے کے گرد لپیٹا۔ عادت نہ تھی تو مشکل لگ رہا تھا۔ اب اسے کسی طرح نیچے جا کر سڑک تک پہنچنا تھا۔ آگے اپنے گھر کا راستہ تو آنکھیں بند کر کے بھی آتا تھا۔

"اللھم اعطنی نورا" (اے اللہ! مجھے نور عطا کر۔)
وہ اسی ترنم میں پڑھ رہی تھی۔ محمل تیزی سے عبایے کے بٹن بند کر کے سکارف پہ ہاتھ پھیر کر درست کر رہی تھی کہ ایک دم اسے بہت خاموشی لگی۔

باہر صحن میں بہت چپ سا ہو گیا تھا۔ شاید اس لڑکی کی دعا ختم ہو گئی تھی۔

اس نے قدرے گھبراہٹ، قدرے جلد بازی میں تیزی سے دروازہ کھولنا چاہا، اسی پل اس لڑکی نے پیچھے گرل کی چوکھٹ پہ قدم رکھا۔

"السلام علیکم۔۔۔ کون؟" چونکی سی آواز اس کے عقب میں ابھری تو اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ دروازے پہ ہاتھ رکھے وہ گہری سانس لے کر پلٹی۔

وہ سامنے شلوار قمیص میں ملبوس، سر پہ دوپٹہ لپیٹے، ہاتھ میں کتاب پکڑے، الجھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

محمل کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی، جانے اب کیا ہو گا؟
"وہ میں آپ کی آواز سن کر آئی تھی، بہت اچھی تلاوت کرتی ہیں آپ۔"

"تلاوت نہیں۔۔۔ وہ دعائے نور تھی۔ میری آواز نیچے تک آ رہی تھی کیا؟" لڑکی کا انداز سادہ مگر محتاط تھا۔ محمل کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے کسی طرح اس لڑکی کو باتوں میں الجھا کر یہاں سے نکلنا تھا۔ ایک دفعہ وہ سڑک تک پہنچ جائے تو آگے گھر کے تمام راستے اسے آتے تھے۔

"خوب صورت آواز ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔ میں تلاوت سمجھ کر آئی تھی، معلوم نہ تھا کہ آپ دعا مانگ رہی ہیں۔"
"دعا مانگ نہیں، یاد کر رہی تھی۔ آپ نے بتایا نہیں، آپ کا نام؟"
شائستگی سے کہتی وہ لڑکی دو قدم آگے آئی تو گرل سے چھن کر آتی چاندنی میں اس کا چہرہ واضح ہوا۔
چکنی سپید رنگت، بے حد گلابی ہونٹ اور بادامی آنکھیں جن کی رنگت سنہرے پکھراج کی سی تھی۔ گولڈن کرسٹل، یہ پہلا لفظ محمل کے ذہن میں آیا تھا اور اسے دیکھتے ہی وہ لمحے بھر کو چونکی تھی۔ بہت شدت سے محمل کو احساس ہوا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو پہلے کہیں دیکھ رکھا ہے۔ کہیں بہت قریب۔ ابھی یہ خوب صورت چہرہ، پہلے اس کے نقش نہیں، یہ وہ سنہری آنکھیں کہیں جو شناسا تھیں۔

"میں محمل ہوں۔" جانے کیسے لبوں سے پھسل پڑا۔ "مجھے دراصل راستے نہیں معلوم تو بھٹک جاتی ہوں۔"

"اوہ آپ ہاسٹل میں نئی آئی ہیں؟ جبھی کہہ رہی ہیں؟"
اور اسے امید کا ایک سرا نظر آ گیا۔ وہ شاید کوئی گرلز ہاسٹل تھا۔
"جی میں شام میں ہی آئی ہوں۔ نیو کمر! اوپر آ تو گئی ہوں مگر نیچے جانے کا راستہ نہیں مل رہا۔"
"نیچے آپ کے روم تو تھرڈ فلور پہ ہی ہیں نا؟ پھر نیچے۔۔۔ اوہ آپ تہجد پڑھنے کے لیے اٹھی ہوں گی یقیناً" وہ خود سے ہی کہہ کر مطمئن ہو گئی۔ "میں بھی تہجد

کے لیے نیچے Prayer Hall میں جا رہی ہوں، آپ میرے ساتھ آ جائیں۔"
اس لڑکی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا، پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
"میں فرشتے ہوں، آ جائیں۔" وہ دروازہ دھکیل کر آگے بڑھ گئی تو محمل بھی متذبذب سی پیچھے ہو لی۔ سامنے سنگ مرمر کی طویل راہداری تھی۔ دائیں طرف اونچی کھڑکیاں تھیں جن سے چھن کر آتی چاندنی سے راہداری کا سفید مرمریں فرش چمک اٹھا تھا۔
فرشتے راہداری میں آگے تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔
وہ ننگے پاؤں اس کے تعاقب میں چلنے لگی۔ مردانہ کھلے پائنچے اس کے پاؤں میں آ رہے تھے مگر اوپر عبایے نے ڈھانپ رکھا تھا۔
راہداری کے اختتام پر سیڑھیاں تھیں۔ سفید چمکتے سنگ مرمر کی سیڑھیاں جو ولائی میں نیچے جاتی تھیں۔ اس نے ننگے پاؤں زینے پہ رکھے، رات کے اس پہر ٹائل کا سنگ مرمر بے حد سرد تھا۔ یخ ٹھنڈا۔ وہ محسوس کیے بغیر تیز تیز سیڑھیاں اترنے لگی۔
تین منزلوں کے زینے ختم ہوئے تو سامنے ایک کشادہ برآمدہ تھا۔ برآمدے کے آگے بڑے بڑے سفید ستون تھے اور سامنے لان نظر آتا تھا۔ ہلکی چاندنی میں برآمدہ نیم تاریک سا لگ رہا تھا۔
ایک کونے میں چوڑی، بے حد چوڑی سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ فرشتے ان سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو لمحے بھر کو اسے خوف آیا۔ وہ بے حد چوڑی سیڑھیاں خاصی نیچے تک جا رہی تھیں۔ مدھم چاندنی میں چند زینے ہی دکھتے تھے، آگے سب تاریکی میں گم تھا۔ جانے کیا تھا نیچے؟
فرشتے کے پیچھے وہ سنبھل سنبھل کر نیم تاریک زینے اترنے لگی۔ بہت نیچے جا کر فرش قدموں تلے آیا تو محسوس ہوا کہ نیچے نرم سا قالین تھا جس میں اس کے پاؤں دھنس گئے تھے۔ وہ ایک بے حد طویل و عریض کمرے میں کھڑی تھی۔ وہ کمرہ کدھر شروع کدھر ختم ہوتا تھا، کچھ

پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ ادھر ادھر گردن گھماتی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔
فرشتے نے دیوار پہ ہاتھ مارا۔ بٹن دبانے کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحے جیسے پورا آسمان روشن ہو گیا۔ محمل نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔
وہ ایک بہت بڑا سا ہال تھا۔ چھت گیر فانوس اور اسپاٹ لائٹس جگمگا اٹھی تھیں۔ ہال چھ اونچے ستونوں پہ کھڑا تھا۔ بے حد سفید ستون، سفید دیواریں، روشنیوں سے جگمگاتی اونچی چھت اور دیواروں میں اونچی گلاس ونڈوز۔
"وضو کی جگہ وہ سامنے ہے۔" فرشتے نے اپنے دوپٹے کو پن لگاتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا تو وہ جیسے چونکی، پھر سر ہلا کر اس طرف بڑھ گئی۔
وضو کی جگہ نیم تاریک تھی۔ سنگ مرمر کی چوکیاں اور سامنے ٹونٹیاں۔ ایک ایک ٹائل چمک رہا تھا۔ وہ ہر شے روشنی سے دمکتی۔ ایک چوکی پہ بیٹھی اور جھک کر ٹونٹی کھولی۔
فواد اور وہ رات۔۔۔ محمل ابراہیم کو سب فراموش ہو چکا تھا۔
"مسنون" کھلے دروازے سے فرشتے نے جھانکا۔
"بسم اللہ پڑھ کر وضو کرنا۔"
محمل نے یونہی سر ہلا دیا اور پھر اپنے گیلے ہاتھوں کو دیکھا جن پہ ٹونٹی سے پانی نکل کر پھسل رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر وضو کرنے لگی۔
فرشتے جیسے اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔
محمل اس کے برابر نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ شاید تہجد پڑھنی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھائے تو رات بھر کے تمام مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے۔ درد کی ایک تیز لہر سینے میں اٹھی تھی۔
دھوکہ دہی، اعتماد کا خون، فواد، بے وقوف بنائے جانے کا احساس۔۔۔ کیا کچھ فواد نے نہیں کیا تھا اس کے ساتھ؟ وہ کس کس کا ماتم کرتی؟
سلام پھیر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ساری عمر

کی محرومیاں اور نارسائیاں سامنے آنے لگیں۔
"میں کیا مانگوں؟ مانگنے کی ایک طویل فہرست ہے میرے سامنے مجھے۔ کبھی وہ نہ ملا جس کی میں نے تمنا کی تھی، جو ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے انسان کے پاس ہونا چاہیے مجھے۔ کبھی بھی وہ نہ ملا جو لوگ جمع کرتے ہیں۔ کیوں؟ کیوں میرے پاس وہ سب نہیں ہے جو لوگ جمع کرتے ہیں؟"

اور جب دل نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر آنسو خشک کیے اور سر اٹھایا۔

سامنے ہال کے سرے پہ ایک بڑا سا اسٹیج بنا تھا۔ درمیان میں میز اور کرسی رکھی تھی، ایک طرف فاصلے پہ ڈائس بھی رکھا تھا۔ شاید وہاں درس و تدریس کا کام بھی ہوتا تھا۔

کرسی کے پیچھے دیوار پہ ایک بے حد خوب صورت خطاطی سے مزین فریم آویزاں تھا۔ اس پہ وہ سرسری سی نگاہ ڈالتی یکدم ٹھٹک کر رکی۔

خوب صورت عربی عبارت کے نیچے اردو میں خوشخط لکھا تھا۔

"پس لوگوں کو چاہیے کہ اس پہ خوشی منائیں۔ قرآن ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ جمع کر رہے ہیں۔" (یونس:58)

وہ یک لخت چونکی۔

"کیا دیکھ رہی ہو محمل؟" فرشتے بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہی کہ میں نے بھی ابھی ایسا ہی کچھ سوچا تھا۔ جو ادھر لکھا ہے کتنا عجیب اتفاق ہے نا۔"

"اتفاق کی کیا بات ہے؟ یہ فریم اسی لیے تو ادھر لگا تھا کیونکہ تم نے آج صبح یہاں یہی بات سوچنی تھی۔"

"مگر فریم لگانے والے کو تو علم نہیں تھا کہ میں بھی سوچوں گی۔"

"لیکن اس آیت کے اتارنے والے کو تو تھا نا۔"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟"

"جس نے قرآن اتارا ہے وہ جانتا ہے کہ تم نے کب کیا سوچنا ہے۔ غور، یہ تمہاری سوچ کا جواب ہے۔"

"نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ "میری سوچ کا اس سے کوئی تعلق نہیں، میں تو بہت کچھ سوچتی رہتی ہوں۔"

"مثلاً کیا؟" وہ دونوں دو زانو ہو کر بیٹھی تھیں اور فرشتے بہت نرمی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہی کہ اچانک کسی بے قصور انسان پہ خوامخواہ مصیبت کیوں آجاتی ہے؟"

"وہ اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔ ہم قطعاً بھی بے قصور نہیں ہوتے محمل۔"

"غلط، بالکل غلط۔ میں نہیں مانتی۔" وہ جیسے بھڑک اٹھی۔ "ایک لڑکی کو اس کا سگا تایا زاد پرپوز کرنے کے بہانے ڈنر کا جھانسہ دے کر اسے خوب بننے سنورنے کا کہہ کر اپنے کسی عیاش دوست کے گھر لے جا کر ایک رات کے لیے بیچ آئے، یہ خوامخواہ کی مصیبت، خوامخواہ کا ظلم نہیں ہے کیا؟"

"نہیں۔"

"نہیں؟" محمل نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔

"ہاں قطعاً نہیں۔ اس صورت حال سے بچنے کو اللہ تعالیٰ نے اسے بہت پہلے ہی سب بتا دیا تھا۔ یقیناً اس لڑکی کو یہ تو علم ہوگا کہ اسے ایک نامحرم کے لیے تیار نہیں ہونا چاہیے، اس کے ساتھ ڈنر پہ نہیں جانا چاہیے۔ کزن بھی تو نامحرم ہے اور لڑکی کو بھی پتا ہوگا کہ اسے اپنا جسم اور چہرہ اس طرح ڈھکنا چاہیے کہ کسی نامحرم، بالفرض اس کے کزن کو بھی علم ہی نہ ہو سکے کہ وہ اتنی خوب صورت ہے کہ وہ اسے 'بیچنے' کا سوچے۔ اب بتاؤ، یہ ظلم ہے یا اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی؟"

وہ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بنا پلک جھپکے فرشتے کو دیکھ رہی تھی، جو سر جھکائے دو زانو بیٹھی آہستگی اور نرمی سے کہہ رہی تھی۔

"اور یقیناً اپنے کزن کے دھوکے میں آنے سے قبل کسی نے اللہ کے حکم سے اسے خبردار ضرور کیا ہو گا۔ اس کے ضمیر نے یا شاید کسی انسان نے مگر اس نے پھر بھی نہیں سنا اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اسے عزت اور حفاظت سے رکھے یہ تو اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ 'آؤٹ آف دی وے' لطف ہے۔ ہم اتنے بے قصور ہوتے نہیں ہیں محمل! جتنا ہم خود کو سمجھتے ہیں۔"

وہ کہے جا رہی تھی اور اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔

چچاؤں کا قطعیت سے فواد کو محمل کے آفس میں کام کرنے سے منع کرنا۔ حسن کے الفاظ... اور وہ تنبیہ جو سدرہ کی منگنی والے روز اس نے کی تھی۔

اس نے اپنی دائیں کلائی دیکھی۔ اس پہ ابھی مندمل ہوئے زخم کے نشان تھے۔ ہاں، حسن نے اسے خبردار کیا تھا۔

"میں... فرشتے! میں... واقعی مجھے..."

"اپنی نادانیوں پہ کسی کو گواہ نہیں بناتے محمل!"

"چلو فجر کی اذان ہو رہی ہے، نماز پڑھتے ہیں۔"

وہ سادگی سے کہتی پھر سے کھڑی ہو گئی تھی مگر محمل اپنی جگہ سے ہل نہ پائی۔

ماضی کا آئینہ بہت بھیانک تصویر پیش کر رہا تھا۔ اسے ایک ایک کر کے تمام باتیں پھر سے یاد آنے لگیں۔ فرشتے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سب سے زیادہ قصور تو خود اسی کا تھا۔ وہ آخر فواد کی گاڑی میں بیٹھی ہی کیوں تھی؟ اس نے دل اور مصحف میں سے دل کا انتخاب کیوں کیا تھا؟

اس نے بھیگی آنکھیں اٹھائیں۔ فرشتے اسی سکون سے رکوع میں کھڑی تھی اور سامنے وہی الفاظ چمک رہے تھے۔

"قرآن ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ جمع کر رہے ہیں۔"

اس کا دل رو دیا تھا۔

کیسے ڈھٹائی سے اس نے اس سیاہ فام لڑکی کو اس کا مصحف واپس کیا تھا۔ اس سے اس کی آواز میں کیسی

بے رخی تھی۔
ٹی وی پہ اذان لگتی یا تلاوت ہوتی تو وہ چینل بدل دیا کرتی تھی۔ یہ آواز کانوں پہ بوجھ لگتی تھی۔ سیپارے پڑھنا کتنا کٹھن لگتا تھا اور فجر تو سوائے پیپرز کے اس نے کبھی نہ پڑھی تھی۔ اب وہی فجر پڑھنے کے لیے وہ فرشتے کے برابر کھڑی ہو گئی۔
"میرے اللہ تعالیٰ! مجھے گھر واپس پہنچا دے۔" وہ پھر سے رونے کو تھی۔ "مجھے تیری قسم میں پھر کبھی فواد بھائی کے ساتھ بھی تنہا۔ کبھی ان کو اکیلے نہیں ملوں گی۔ میں قسم کھاتی ہوں۔ آئی سوئیر!"
دعا مانگ کر قدرے پرسکون ہوئی تو چہرے پہ ہاتھ پھیر کر اٹھی۔
"ایک بات پوچھوں فرشتے؟" وہ دونوں ساتھ ساتھ ہال کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔
"ہوں پوچھو!"
"قسم کھانے سے اللہ مان جاتا ہے؟"
"قسم ناپسندیدہ چیز ہے، یہ مقدر نہیں بدلتی۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔"
"اور اگر قسم کھالی جائے تو؟"
"تو مرتے وقت تک اس کو نبھانا پڑتا ہے۔" آخری سیڑھی چڑھتے فرشتے ذرا سی رکی۔ "کبھی الٹی سیدھی قسم مت کھانا کہ یہاں سے رہائی ملنے پہ تم فلاں اور فلاں کام کرو گی۔"
"رہائی؟" برآمدے کی چوکھٹ پار کرتے محمل گھبرا گئی۔ دل زور سے دھڑکا۔
"ہاں تمہیں گھر جانا ہے نا۔ میں تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔" وہ ساکت سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"رک کیوں گئیں؟ آؤ نا۔"
"آپ کو... آپ کو کیسے پتا چلا؟"
"بات یہ ہے محمل! اول تو تہجد کے وقت یہاں کوئی عبایا پہن کر نہیں گھومتا، دوم یہ کہ تم نے میرا عبایا اور اسکارف پہن رکھا ہے اور سوم تم، میں نے تمہیں صحن پھلانگتے دیکھ لیا تھا۔"
محمل نے بوکھلا کر اپنے جسم پہ موجود عبایا کو دیکھا جس سے لمبی مردانہ شلوار کے پائنچے ذرا اونچے جھانک رہے تھے۔
"وہ... دراصل۔"
"ہمایوں کے باتھ روم کی کھڑکی ہماری چھت پہ کھلتی ہے۔ اس نے تمہیں باتھ روم میں بند کر دیا تھا؟ میں اس سے بات کروں گی۔ اسے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تھوڑا سا خشک مزاج ہے مگر دل کا برا نہیں ہے۔" اور پھر اس کی شاکڈ شکل دیکھ کر وضاحت کی۔ "ہمایوں میرا فرسٹ کزن ہے، وہ برا آدمی نہیں ہے۔"
اسی پل گیٹ کسی نے زور سے بجایا۔ ساتھ ہی بیل بھی بجی۔ فرشتے نے گہری سانس لی۔ "آؤ لڑکی۔" اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گیٹ تک لائی، پھر ہاتھ چھوڑ کر دروازہ کھولا۔
"فرشتے! ادھر وہ..."
"السلام علیکم اور یہ کیا غلط حرکت ہے؟ تمہیں مسئلہ اس کے کزن کے ساتھ ہے تو اس کو باتھ روم میں کیوں بند کیا تھا؟"
"بالکل ٹھیک کیا تھا۔ ہے کدھر وہ؟" وہ جواباً بگڑ کر بولا تھا۔
محمل سہم کر قدرے اوٹ میں ہو گئی۔ یہ تو وہی تھا۔ وہ اس کی آواز پہچانتی تھی۔
"وہ میرے ساتھ ہے۔ مگر تمہیں اس سے عزت سے پیش آنا چاہیے تھا۔" فرشتے کے لہجے میں دبی دبی خفگی تھی۔
"جو بھی ہے تم اسے..."
"نہیں ہمایوں! تم اس کو مجرم کی طرح ٹریٹ مت کرو۔ اس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو اپنے بھائیوں جیسے کزن پہ ٹرسٹ کر کے معصومیت میں چلی آئی تھی۔"
وہ حق دق سنے جا رہی تھی۔ ابھی تو فرشتے کو بالواسطہ سب کہانی سنا آئی تھی اور تب فرشتے فواد کو "نامحرم" کہہ رہی تھی اور اب ہمایوں کے سامنے اس کی نادانیوں پہ کیسے پردہ ڈال گئی تھی۔
"اس کا قصور یہ ہے کہ وہ فواد کریم کی کزن ہے۔"
اسے [illegible] اب کہ ہمایوں داؤد کا لہجہ متوازن تھا۔ فرشتے اسے راستہ دینے کے لیے چوکھٹ پار کر کے باہر چلی گئی تو وہ دھڑکتے دل سے گیٹ کی اوٹ سے نکلی۔
سامنے ہی وہ کھڑا تھا۔ یونیفارم میں ملبوس، مکمل طور پہ تیار، اکھڑے تیور اور ماتھے پہ بل لیے۔
"جب میں نے بکواس کی تھی کہ وہاں رہو تو تم نے باہر قدم کیوں نکالا؟"
"نوکر نہیں ہوں میں آپ کی جو آپ کا حکم مانوں۔ آپ ہیں کون مجھے حکم دینے والے ہاں؟" وہ بھی جواباً بھڑک اٹھی تھی۔
"واٹ؟ تم..."
"زبان سنبھال کر بات کریں اے ایس پی صاحب! میں مسجد میں کھڑی ہوں اور اب آپ کا مجھ پہ کوئی زور نہیں ہے۔" اس نے گیٹ کا کنارہ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔
"تم..." وہ کچھ سخت کہتے کہتے ضبط کر گیا، پھر فرشتے کی طرف پلٹا جو خاموشی سے سب دیکھ رہی تھی۔
"اس سے کہو کہ میرے ساتھ آئے۔ میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔"
فرشتے نے خاموشی سے دونوں کی بات سنی اور جب وہ چپ ہوا تو وہ محمل کی طرف مڑی۔
"اس کے ساتھ چلی جاؤ، یہ تمہارا دشمن نہیں ہے۔"
"مجھے ان پہ رتی برابر بھروسہ نہیں ہے۔"
"بھروسا بھی نہیں چاہیے مگر تمہارے تنہا گھر جانے اور پولیس موبائل میں جانے میں فرق ہو گا۔ آگے تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔"
بات کچھ ایسی تھی کہ وہ خاموش سی ہو گئی۔
"ٹھیک ہے آئیں۔" اس نے باہر قدم رکھے، پھر پلٹ کر فرشتے کو دیکھا جو گیٹ کے ساتھ سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔
اس کی پشت پہ وہ عالیشان تین منزلہ عمارت تھی جس کے اونچے سفید ستون بہت وقار سے کھڑے تھے جیسے کوئی بلند و بالا سفید محل ہو۔ اس کا گنبد نہ تھا مگر فرشتے اسے مسجد کہہ رہی تھی۔
اس سے متصل بنگلہ اپنی خوب صورت آرائش کے ساتھ وہیں موجود تھا جہاں اس نے رات میں دیکھا تھا۔
"تھینکس۔" وہ کہہ کر رکی نہیں۔
ہمایوں سامنے کھڑی پولیس موبائل کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ وہ اعتماد سے چلتی ہوئی گئی اور فرنٹ ڈور کھول کر نشست سنبھالی۔
"آپ مجھے میرے گھر لے کر جا رہے ہیں؟"
"نہیں۔" مروت سے انداز میں کہہ کر وہ گاڑی سڑک پہ ڈال چکا تھا۔
"پھر؟ پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"
"تھانے!"
"مگر مجھے گھر..."
"بی بی! مجھے بحث پسند نہیں ہے۔ خاموش رہو۔" اس کو جھڑک کر ہمایوں نے اسپیڈ اور بڑھا دی۔
وہ نم آنکھوں سے سامنے سڑک کو دیکھنے لگی۔ جانے اس کی قسمت اس کو اب اور کیا کیا دکھانے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج آغا ابراہیم کی عالیشان محل نما کوٹھی کے لان میں صبح سے ہی سب جمع تھے۔
آغا کریم چہرے پہ ڈھیروں غیض و غضب لیے، رعونت انداز میں کرسی پہ براجمان تھے۔ مہتاب تائی، ندا اور ناعمہ چچی قریب ہی کرسیوں پہ بیٹھی مدھم سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ غفران چچا اور اسد چچا بھی پاس ہی پریشان سے بیٹھے تھے۔
برآمدے کے مختصر زینے پہ آرزو بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پہ پلیٹ رکھے وہ اپنی ازلی بے نیازی سے توس پہ جیم لگا رہی تھی۔
اس کے پیچھے برآمدے میں بچھی کرسیوں پہ باقی لڑکیاں بیٹھی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔

حسن مضطرب سا گھاس پہ ٹہل رہا تھا۔ بار بار اپنے سیل فون پہ کوئی نمبر پریس کرتا وہ جھنجلا سا رہا تھا۔ سو تیم اپنے کمرے میں تھا اور۔

فواد' آغا جان کے برابر کرسی ڈالے اخبار پھیلائے سرسری سا مطالعہ کر رہا تھا۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر سب کے چہروں کے تاثرات دیکھ لیتا۔ اس کے اندر میں اطمینان و سرشاری تھی۔

بس ایک مسرت تھیں جو کچن میں کرسی پہ بیٹھی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں۔ ان کی ساری زندگی کی ریاضت رائیگاں گئی تھی۔ محمل کل اکیڈمی جانے کا کہہ کر باہر نکلی تھی اور جب شام تک اس کی واپسی نہ ہوئی تو ان کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ کتنے نفل پڑھ ڈالے' کتنی دعائیں کر لیں مگر وہ واپس نہ آئی۔

بات چھپنے والی کہاں تھی بھلا؟ سب کو خبر ہو ہی گئی۔ آغا جان تو سراپا غیض و غضب بن گئے۔ تھانے جانے کی بات کی تو فواد نے ہی انہیں سمجھایا کہ گھر کی عزت داؤ پہ لگانے کا فائدہ' تھوڑی دیر مزید انتظار کر لیتے ہیں۔

حسن اور اسد چچا ساری رات اسے ہسپتالوں' مردہ خانوں اور سڑکوں پہ تلاشتے رہے تھے۔ مگر جب تین بجے کے قریب وہ ناکام لوٹے تو گھر میں گویا صف ماتم بچھ گئی۔

عورتوں کی معنی خیز نگاہیں' مردوں کے ملامت بھرے فقرے مسرت کو اپنی روح میں گڑتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ اسی وقت سے روئے چلی جا رہی تھیں۔ کوئی صفائی' کوئی دہائی نہیں' بس آنکھ میں آنسو اور لبوں پہ وہ ایک ہی دعا کہ محمل کی لاش کسی ہسپتال' کسی نہر نالے سے مل جائے مگر وہ نہ ہو جو ان کی ساری ریاضت ضائع کر دے۔

"بھاگ گئی کسی کے ساتھ' ارے میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔" صبح کا سورج طلوع ہونے لگا تھا جب تائی مہتاب کی آواز کچن میں سنائی دی۔

"شک تو مجھے بھی لگ رہا ہے۔" ناعمہ چچی نے بلند سی سرگوشی کی۔ وہ سب رات سے جاگ رہی تھیں۔ البتہ حسن کے علاوہ دوسرے لڑکے لڑکیاں بھرپور نیند لے کر ابھی بیدار ہوئے تھے۔

"بس!" آغا جان ایک دم دھاڑے' اندر کچن میں روتی مسرت نے دہل کر بھیگا چہرہ اٹھایا۔

سب نے چونک کر آغا جان کو دیکھا جن کا سرخ و سفید چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

"اب اگر وہ زندہ اس دہلیز پہ واپس آئی تو میں اسے یہیں دفن کروں گا۔ سن لیا سب نے۔"

"ارے ایسی بیٹیوں کا تو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دینا چاہیے۔ ابراہیم اس کو بھی ساتھ لے کر مرتا۔ ہماری عزت داغ دار کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ توبہ توبہ۔"

"ضرور کسی کے ساتھ چکر تھا۔ قرآن اٹھا کر چھت پہ جاتی تھی' توبہ استغفار' تاکہ ہم اس پہ شک نہ کریں۔ اسی لیے تو میں نے اس دن کہا تھا مگر کوئی سنے تو۔" تائی مہتاب کو اپنا غم یاد آیا تھا۔

مسرت کا دل ڈوبتا چلا گیا۔

"تم مر جاؤ محمل' خدارا مر جاؤ مگر واپس نہ آؤ۔" ان کا دل رو رو کے چلا رہا تھا۔

"آج کے بعد اس کا نام کوئی اس گھر میں نہیں لے گا' اور اگر۔۔۔" آغا جان کی بات ادھوری رہ گئی۔ کسی نے زور سے گیٹ پہ دستک دی تھی۔

سب نے چونک کر گیٹ کو دیکھا' یہاں تک کہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی توس کھاتی آرزو نے بھی سر اٹھایا تھا۔

مسرت دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی میں آن کھڑی ہوئیں۔ صبح کے سات بجے پہلے تو کبھی اس طرح دستک نہ ہوئی تھی۔

"حسن! دروازہ کھولو۔" اسد چچا نے کہا تو حسن نے آگے بڑھ کر گیٹ کے چھوٹے دروازے کے ہینڈل کا ہک کھولا اور پیچھے ہوا۔

دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ایک سرمئی سپید ہاتھ دروازے پہ دھرا اور پھر چوکھٹ پہ اندر آتے سپید ننگے پاؤں دکھائی دیے۔

آغا جان بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باقی سب بھی ساتھ ہی اٹھے۔ سب کی نظریں گیٹ پہ جمی تھیں جہاں چھوٹے دروازے کو دھکیل کر وہ اندر داخل ہو رہی تھی۔

سیاہ پاؤں تک آتا عبایا اور چہرے کے گرد سختی سے لپیٹا سرمئی اسکارف' ننگے پاؤں' سر جھکائے محمل ابراہیم نے اندر قدم رکھا۔

"حسن! اس سے کہو یہاں سے دفع ہو جائے' ورنہ میں اس کا خون کر دوں گا۔" آغا جان زور سے دھاڑے تھے۔ "ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے بے شرم لڑکی ورنہ۔"

"آپ کے باپ کا گھر ہے جو نکل جاؤں؟" وہ جو گردن جھکائے اندر قدم رکھ رہی تھی' ایک دم سر اٹھا کر اتنی بے خوفی سے غرائی کہ لمحے بھر کو سب بھونچکا رہ گئے۔ تائی مہتاب نے تو ششدر سا ہو کر منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔

حسن الجھ کر محمل کو دیکھ رہا تھا اور فواد۔ فواد اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔

وہ اب پلٹ کر گیٹ کھول رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے زن سے ایک پولیس موبائل آگے بڑھی۔ اندر آ کر رکی' جھٹ سے دروازے کھلے اور سپاہی اتر کر تیزی سے ادھر ادھر پھیلتے چلے گئے۔

"پورے گھر کی تلاشی لو۔" بلند حکمیہ کہتا وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ یونیفارم میں ملبوس' چہرے پہ مدھم سی فاتحانہ مسکراہٹ لیے وہ گھاس پہ کھڑے ان پتھر ہوئے لوگوں کے قریب آیا۔

وہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔ فواد کو ہی سب سے پہلے ہوش آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگائی جا رہی تھی۔

"کیا بکواس ہے؟" اس نے غرا کر ہاتھ پیچھے کرنے چاہے۔

"اس بکواس میں لکھا ہے کہ تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری منسوخ ہو چکی ہے اور یہ کہ تمہیں فوری گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے۔"

"مسئلہ کیا ہے آفیسر؟ کیا کیا ہے میرے بیٹے نے؟"

"آغا صاحب! آپ کے بیٹے نے اپنی کزن۔" ہمایوں نے ایک نگاہ محمل پہ ڈالی جو گیٹ کے ساتھ پیچھے ہاتھ باندھے کھڑی نفرت بھری نظروں سے فواد کو دیکھ رہی تھی۔ "محمل ابراہیم کو اپنی ایک پھنسی ہوئی فائل نکلوانے کے عوض ایک رات کے لیے بیچا اور ابھی ناشتہ کرتے ہوئے وہ غالباً اسی فائل کے اپروو ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سر' میرا بیٹا۔"

"آپ کا بیٹا شمالی علاقہ جات کی لڑکیوں کے اغوا اور خرید و فروخت میں ملوث ہے' یہ آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی۔ اس دفعہ انہوں نے چالاکی کی اور اپنی کزن کا سودا کر کے اسے دھوکے سے متعلقہ پارٹی کے پاس بھیجا' البتہ آپ کی بھتیجی پولیس کی حفاظت میں ہی رہی کیونکہ وہ سب پولیس کے پلان کے تحت تھا۔ آغا فواد نے گینگ کو منظر عام پہ نہ لانے کے لیے چال تو اچھی چلی مگر ہر چال کامیاب نہیں ہوتی۔"

"محمل کا اس اے ایس پی سے چکر تھا۔" فواد خاموشی سے سن کر بہت آرام سے بولا۔ "میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ اب اپنے کرتوت پہ پردہ ڈالنے کے لیے مجھے پھنسا رہے ہیں یہ لوگ۔"

"خاموش ہو جائیں۔" وہ پھٹ پڑی تھی۔ "ایک لفظ بھی آپ نے میرے متعلق کہا تو میں آپ کا منہ نوچ لوں گی۔ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا' آپ کو اندازہ ہے؟"

"ارے یہ کیا چپ رہے' میں بتاتی ہوں۔" تائی مہتاب جیسے ہوش میں آئی تھیں' ایک دم سینے پہ ہاتھ مارتی سامنے آئیں۔ "سارا فساد اسی لڑکی کا مچایا ہوا ہے۔ یہ میرے بیٹے کو پھنسا رہی ہے تاکہ اس کے اپنے کرتوت نہ کھلیں' آغا صاحب۔" انہوں نے تائید طلب نظروں سے آغا جان کو دیکھا اور پھر ادھر ادھر گردن گھمائی۔ سب خاموش کھڑے تھے۔ کسی نے ہاں ۔۔۔ یا ناں نہیں کی۔

"لڑکی کا نام محمل ابراہیم ہے۔" ہمایوں نے موبائل کا بٹن دبا کر ان کے سامنے کیا۔ اسپیکر سے آواز

گونجنے لگی۔ فواد کی آواز۔ جو ہر وقت پہچانی جاتی تھی۔
"تین تاریخ، ہفتے کی شام وہ آپ کے پاس ہوگی۔ معصوم، کمسن، بھولی اور نوجوان ہے۔ آپ کی ڈیمانڈ پہ پوری اتری ہے۔" اور ایک قہقہہ۔

محمل کو اپنا چہرہ تمتماتا ہوا محسوس ہوا۔ ذرا سے وقفے سے مختلف آوازیں گونجی تھیں۔

"فواد بھائی! یہ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"فواد بھائی! یہ لوگ میرے ساتھ کچھ غلط کر دیں گے۔"

"بکواس بند کرو اور میری بات غور سے سنو۔ تمہیں وہ ڈائمنڈ رنگ چاہیے ہے نا؟ تو جیسے وہ کہیں کرتی جاؤ۔ بس ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ صبح تمہیں ڈرائیور لینے آ جائے گا۔"

ہمایوں نے بٹن دبایا اور موبائل نیچے کیا۔ فواد نے سر جھٹکا۔

"تو یہ قانون کی عدالت میں قابل قبول نہیں ہوتا اے ایس پی صاحب۔"

"گھر کی عدالت میں تو ہوتا ہے۔"

اور وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ان سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ ساکت و متاسف کھڑا تھا۔

"دیکھ لوں گا میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔"

"فی الحال تو تمہیں ایک لمبے عرصے تک جیل کی دیواروں کو دیکھنا ہوگا۔"

"اسی دن کے لیے۔" حسن ایک دم تیزی سے سامنے آیا۔ "اسی دن کے لیے کہتا تھا کہ اس سے دور رہو، ساری دنیا جانتی ہے، یہ کس قماش کا آدمی ہے، لڑکیوں کا کاروبار کرتا ہے، اسی لیے تمہیں منع کرتا تھا۔"

"مجھے منع کر سکتے تھے اس کے ہاتھ نہیں توڑ سکتے تھے؟ میری جگہ اپنی بہن ہوتی تو بھی کچھ نہ کرتے؟" وہ جواباً ایسے تڑخ کر بولی کہ حسن کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ محمل کبھی ایسے نہ بولی تھی۔

"محمل بس میں۔"

"مجھے آپ کی کوئی وضاحت نہیں چاہیے۔ آپ سب ایک سے ہیں۔" اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ تب ہی اس نے برآمدے کے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے نڈھال سی مسرت کو دیکھا۔ ہو جانے کب ادھر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے قریب برآمدے کی سیڑھی پہ بیٹھی آرزو ہنا پلک جھپکے مبہوت سی اس مغرور اور وجیہہ سے اے ایس پی کو دیکھ رہی تھی۔ توس کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔

"آغا صاحب! انہیں روکیں، یہ میرے بیٹے کو کدھر لے جا رہے ہیں۔" وہ فواد کو لے جانے لگے تو تائی مہتاب آغا جان کا بازو جھنجھوڑ کے رو پڑی تھیں۔ آغا جان چپ کھڑے تھے، بالآخر غفران چچا آگے بڑھے۔

"بھابھی بیگم! حوصلہ کریں ان شاء اللہ فواد شام تک گھر پہ ہوگا۔" ان کی بات پہ ہمایوں نے استہزائیہ سر جھٹکا اور پلٹا۔

"ایک منٹ اے ایس پی صاحب۔"

آغا جان ٹھہرے ہوئے انداز میں مخاطب ہوئے تھے۔ وہ چونک کر پلٹا۔

"یہ لڑکی رات باہر گزار آئی ہے، ہم شریف لوگ ہیں، اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ آپ اسے بھی ساتھ ہی لے جائیں۔"

محمل ساکت رہ گئی۔ اسے لگا وہ کبھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گی۔

"واقعی؟" ہمایوں نے ابرو اٹھائی۔

برآمدے کے ستون سے لگی مسرت کے آنسو پھر سے ابل پڑے۔

"جی واقعی!" ان کے چبا کر کہنے پہ وہ مسکرایا۔

"ٹھیک ہے محمل بی بی اٹھائے چلیے آپ سلطانی گواہ ہیں، گواہی دیں اور فواد کریم کو ساری عمر جیل میں سڑتے دیکھیں۔ میں نے تو چاہا تھا گھر کی بات گھر میں رہ جائے، لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا کو علم ہو کہ فواد نے گھر کی بچی کا سودا کیا ہے تو ٹھیک ہے۔" "ہم اس سلطانی گواہ کو ساتھ لے چلتے ہیں نہ آپ اس بچی کو سمجھا بجھا کر راضی کر کے چپ کرائیں گے نہ ہی فواد کبھی باہر آئے گا۔ چلو محمل۔"

"ارے نہیں اے ایس پی صاحب! محمل ہماری بچی ہے،" بھائی صاحب بس یونہی ناراض ہیں، ہمیں یقین ہے کہ یہ پولیس کی حفاظت میں رہی ہے۔ عزت سے گھر آئی ہے۔" غفران چچا نے بوکھلا کر بات سنبھالی۔

"نہ بھی یقین کریں، پھر بھی محمل کو ہم نے مسجد بھجوا دیا تھا عورتوں کی سمجھ ہے، میری بہن ادھر رہتی ہے۔" اس نے آغا صاحب کو بغور دیکھتے ہوئے بہن پہ زور دیا اور ایک سخت نظر ڈال کر پلٹ گیا۔

وہ ابھی تک ویسے ہی ساکت و ششدر کھڑی تھی جیسے آغا جان کے الفاظ کا ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔

گاڑیاں گیٹ سے باہر نکل گئیں۔ غفران چچا موبائل پہ کوئی نمبر ملانے لگے۔ تائی مہتاب زور زور سے رونے لگیں۔

"یہ سارا اسی منحوس کا کیا دھرا ہے۔ اسے گھر سے نکالیں آغا صاحب! کمبخت نے میرے بیٹے کو پھنسا دیا، مہتاب کے ساتھ بیٹھ کیوں نہیں مرگئی؟"

وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھیں مگر حسن درمیان میں آگیا۔

"کیا کر رہی ہیں آپ تائی اماں؟" ان کے دونوں ہاتھوں کو گرفت میں لیے اس نے بمشکل انہیں باز رکھا۔ "بھلا ایک لڑکی کے کہنے پہ فواد کریم جیسے اثر و رسوخ والے شخص کے اریسٹ وارنٹ بن سکتے ہیں؟"

"یہ جھوٹ بکتی ہے، میں اسے جان سے مار دوں گی۔"

"محمل! اندر جاؤ۔" فضہ چچی نے آہستہ سے کہا تو وہ چونکی اور پھر اندر کی طرف دوڑی۔

فضہ اور ناعمہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آغا جان ڈرائیو وے کی طرف بڑھ گئے۔ تائی اماں ابھی تک حسن کے بازوؤں میں رو چیخ رہی تھیں۔

وہ بھاگتی ہوئی برآمدے کے سرے پہ رکی۔ ستون سے لگی کھڑی مسرت نے منہ پھیر لیا۔ اسے دھچکا سا لگا۔

"اماں!" اس کی آنکھوں میں مرچیں چبھنے لگیں۔

"اے محمل!" آرزو نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ ذرا سا چونکی۔

"یہ ہینڈسم آفیسر کون تھا؟"

"یہ ہمایوں تھا، ہمایوں داؤد۔"

"ہوں نائس نیم۔ کدھر رہتا ہے؟"

"جہنم میں، ایڈریس چاہیے؟" وہ زہر خند ہوئی تو آرزو نے برا سا منہ بنایا۔ محمل اس کا ہاتھ جھٹک کر ایک شکوہ کناں نگاہ پہ ڈالتی اندر بھاگتی گئی۔

"ہمایوں داؤد!" آرزو زیر لب مسکرائی اور پھر توس کھانے لگی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں اگلے کئی روز تک خاموشی چھائی رہی۔ بس ایک حسن تھا جو ہر دم، ہر ایک کے سامنے اس کا دفاع کرتا نظر آتا۔

"اگر محمل کی جگہ آرزو ہوتی تو بھی آپ یہی کہتیں چچی؟" وہ ناعمہ کی کسی بات پہ بھڑک کر بولا تو وہ جو سر لپیٹے اندر پڑی تھی، جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے باہر آئی۔

"آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے ہر ایک کے سامنے میری صفائی دینے کی۔" وہ لاؤنج میں آ کر ایک دم چلا کر بولی تو سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"مگر محمل!"

"اگر ان لوگوں نے مجھے یونہی پورے خاندان میں بے عزت کرنا ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر عزت ایک دفعہ چلی گئی تو میں کس عزت کو بچانے کے لیے کورٹ میں چپ رہوں گی؟ میں بھری عدالت میں سارے شہر کو بتاؤں گی۔ سن لیں آپ سب۔"

اپنے پیچھے دھاڑ سے دروازہ بند کر کے اس نے پھر سے خود کو کمرے میں قید کر لیا۔

اندر مسرت بستر کی چادر درست کر رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر لمحے بھر کو سر اٹھایا، پھر واپس کام میں مصروف ہو گئیں۔

"آپ ابھی بھی مجھ سے ناراض ہیں اماں؟" مسرت خاموشی سے تکیے پہ غلاف چڑھاتی رہیں۔

"اماں!" اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ وہ تکیے درست کر کے دروازے کی طرف بڑھیں۔

"میں نے کیا کیا ہے اماں؟" وہ رو پڑی تھی۔ دروازے کی طرف بڑھتی مسرت نے گردن موڑی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا محمل!" بہت دنوں بعد وہ اس سے بولی تھیں۔

"اماں۔" وہ تڑپ کر ان کے قریب آئی۔ "فواد بھائی نے مجھے فنکشن کا کہہ کر۔۔۔"

"مجھے پتہ ہے۔"

"پتہ ہے، مگر یقین نہیں ہے؟"

"ہے۔"

"پھر بات کیوں نہیں کرتیں مجھ سے؟"

"میں برسوں ان کی خدمت کرتی رہی کہ شاید کبھی ہمیں کچھ عزت دیں، مگر میری بیٹی ان ہی کے بیٹے کو پکڑوا کر اس کے خلاف کورٹ کچہری میں گواہی دیتی پھرے۔۔۔ پہلے زندگی کم مشکل تھی محمل جو تم نے مزید مشکل بنا دی ہے۔" وہ تھکی تھکی سی پلٹ گئیں۔

وہ نم آنکھوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ایک غلط قدم اسے یہاں لا پہنچائے گا، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر کتنے ہی دن وہ ماتم کرتی رہی۔ اس کے پاس رونے کو بہت کچھ تھا۔ پھر کئی دنوں بعد اسے اس عبایا، اسکارف اور مردانہ شلوار قمیص کا خیال آیا تو دونوں کو الگ الگ شاپر میں ڈال کر فرشتے کو واپس کرنے نکلی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے ہمایوں داؤد کے منہ لگنے کی، فرشتے خود وہاں کی وردی آگے پہنچوا دے گی۔" اس نے سوچا تھا۔

بس اسٹاپ کا بنچ اب ویران ہوتا تھا۔ وہ سیاہ فام لڑکی مڑ کر کبھی واپس نہ آئی تھی۔ جانے کون تھی، کہاں چلی گئی۔ وہ اکثر سوچتی رہ جاتی۔

بس سے اتر کر اس نے سڑک پہ کھڑے گردن اونچی کر کے دیکھا۔ وہ دونوں عمارتیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ہمایوں داؤد کا بنگلہ سبز بیلوں سے ڈھکا تھا اور ساتھ موجود اونچے ستونوں والی سفید عمارت کوئی انسٹی ٹیوٹ تھا شاید۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس فضول انسان کا دروازہ کھٹکھٹانے کی۔ میں مسجد میں ہی چلی جاتی ہوں۔" وہ مسجد کے سیاہ گیٹ کے سامنے آئی۔ گیٹ کا سیاہ لوہا چمک رہا تھا۔ اسے اس چمکتے لوہے میں اپنا عکس دکھائی دیا۔

بلیو جینز کے اوپر گھٹنوں تک آتا کرتا، گردن سے لپٹا دوپٹہ، اونچی بھوری پونی ٹیل باندھے، ماتھے پہ بل ڈالے وہ اپنے مخصوص تیکھے پن میں تھی۔

گیٹ کے اس طرف ایک بورڈ لگا تھا جس کو پہلے نہ دیکھ سکی تھی۔ اس پہ واضح لکھا تھا۔

"No men Allowed" (مردوں کا داخلہ ممنوع ہے)

ساتھ باوردی گارڈ بیٹھا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر اندر قدم رکھا۔

بڑا سا سرسبز لان، سامنے سفید سنگ مرمر کا چمکتا برآمدہ۔ برآمدے کے کونے میں ریسپشن ڈیسک کے پیچھے کھڑی لڑکی، جو سیاہ عبایا کے اوپر سرمئی اسکارف میں ملبوس، فون کان سے لگائے محو گفتگو تھی۔

سامنے سے سفید شلوار قمیص میں ملبوس ایک لڑکی چلی آ رہی تھی۔ اس نے عنابی اسکارف لے رکھا تھا۔ جیسے یونیفارم ہو۔ محمل کے قریب سے گزرتے اس نے مسکرا کر "السلام علیکم" کہا۔

"جی؟" وہ چونکی۔ وہ لڑکی مسکرا کر اس کے پاس سے گزر گئی۔

"ہیں؟ اس نے مجھے سلام کیوں کیا؟ کیا یہ مجھے جانتی ہے؟" وہ الجھ ہی رہی تھی کہ ریسپشنسٹ کی آواز آئی۔

"السلام علیکم۔ کین آئی ہیلپ یو؟"

"جی، مجھے فرشتے سے ملنا ہے۔" وہ ڈیسک کے قریب آئی۔

"فرشتے باجی کلاس میں ہوں گی۔ اندر کاریڈور میں رائٹ پہ فرسٹ ڈور۔"

"اچھا۔"

وہ ادھر ادھر دیکھتی سنگ مرمر کے چمکتے فرش پہ چلتی جا رہی تھی۔ کاریڈور میں پہلے کھلے دروازے پہ وہ رکی۔ اندر سے فرشتے کی مضبوط مگر خوب صورت آواز آ رہی تھی۔

"مرتین سے مراد بنی اسرائیل میں ہونے والا دو مرتبہ کا فساد ہے۔ مفسر کے مطابق پہلی دفعہ سے مراد زکریا کا قتل، جبکہ دوسری دفعہ سے عیسیٰ کے قتل کی سازش مراد ہے۔"

اس نے کھلے دروازے سے اندر گردن کی۔ سامنے پلیٹ فارم پہ کرسی پہ وہ بیٹھی اپنے آگے میز پہ کتاب کھولے مصروف سی پڑھا رہی تھی۔ اس کے سامنے قطار در قطار لڑکیاں کرسیوں پہ بیٹھی تھیں۔

عنابی اسکارف میں لپٹے بہت سے جھکے سر اور تیزی سے لکھتے قلم۔ وہ واپس پلٹ گئی۔

برآمدے میں ریسپشن ڈیسک کے سامنے دیوار سے لگے کاؤچ پہ بیٹھ کر وقت کاٹنا اسے بہتر لگا۔ سو تھوڑی دیر وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی، پاؤں جھلاتی، چیونگم چباتے ہوئے تنقیدی نگاہوں سے ارد گرد گزرتی لڑکیوں کا جائزہ لیتی رہی۔

وہاں ایک منظم سی چہل پہل ہمہ وقت ہو رہی تھی۔ وہ جیسے کوئی اور ہی دنیا تھی۔ یونیفارم میں ملبوس ادھر ادھر تیزی سے آتی جاتی لڑکیاں۔ وہاں ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اسٹوڈنٹس کی سفید شلوار قمیص اور اوپر عنابی رنگ کا اسکارف تھا، جبکہ تمام ٹیچرز اور آفیشلز کے سیاہ عبایے اور سرمئی اسکارف تھے۔ ان کے عبایا اور اسکارف لینے کا انداز بے حد نفیس تھا۔ بہت پر اعتماد، ایکٹو اور مصروف سی لڑکیاں۔ جیسے وہ الگ سی دنیا وہ لڑکیاں ہی چلا رہی تھیں۔ کچھ تھا اس مسجد میں جو محمل کو کہیں اور نظر نہیں آیا تھا۔

"السلام علیکم۔ اگر آپ بور ہو رہی ہیں تو اس کا مطالعہ کر لیں۔"

"شیور۔" اس نے شانے اچکا کر ریسپشنسٹ کے ہاتھ سے وہ دبیز کتاب لے لی۔

صفحے پلٹتے ہی اسے بے اختیار وہ شام یاد آ گئی جب آغا جان نے ٹیرس پہ اس سے وہ سیاہ جلد والا مصحف چھینا تھا۔

وہ قرآن کی سادہ ٹرانسلیشن تھی۔

وہ یونہی درمیان سے کھول کر پڑھنے لگی۔

"اور اس نے ہی غنی کیا اور مالدار بنایا ہے اور وہی ہے جو شعریٰ (ستارے) کا رب ہے اور بلاشبہ اس نے ہی پہلی قوم عاد کو ہلاک کیا اور قوم ثمود کو بھی، پھر کچھ باقی نہ چھوڑا اور ان سے پہلے قوم لوط کو بھی، بلاشبہ وہ سب انتہائی ظالم اور سرکش لوگ تھے اور اس نے ہی الٹی ہوئی بستیوں کو۔۔۔ پھر ان پر چھا گیا جو چھا گیا تھا۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں پہ جھگڑو گے؟ یہ تو تنبیہ ہے پہلی تنبیہات میں سے۔ آنے والی قریب آ گئی۔ اللہ کے علاوہ کوئی ظاہر کرنے والا نہیں۔ تو کیا تم اس قرآن سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو، روتے نہیں اور تم کھیل تماشہ کر رہے ہو؟"

"محمل؟ ارے۔۔۔!"

وہ جو بالکل کھو کر پڑھتی چلی جا رہی تھی، بری طرح چونکی۔

فرشتے سامنے کھڑی تھی۔

اس نے قرآن بند کیا اور میز پہ رکھ کر کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم۔ کیسی ہو؟" فرشتے اس کے گلے لگ کر الگ ہوئی اور اسے شانوں سے تھام کر مسکرا کر دیکھا۔ وہ محمل سے دو انچ لمبی تھی۔ شفاف سپید چہرہ سرمئی اسکارف میں مقید اور وہ کانچ سی بھوری

"ٹھیک۔ آپ کیسی ہیں؟"

"الحمدللہ۔ اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں، گھر میں سب ٹھیک ہے؟"

"جی۔" اس نے نگاہیں جھکائیں اور بہت سی نمی اپنے اندر اتاری۔

"چلو کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آپ کی چیزیں تھیں میرے پاس۔" اس نے شاپر اوپر کیا۔

"میں سمجھی تم میرے لیے کوئی گفٹ لائی ہو۔" وہ ہنسی اور شاپر لے لیا۔ کوئی تکلف نہیں، بہت خالص سا انداز۔ سچا اور خالص۔

"لیکن اگر تم یہ رکھنا چاہو تو۔"

"نہیں، میں یہ عبایا وغیرہ نہیں لیتی۔"

"تو پراِبلم دین۔ بہت شکریہ۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی تو مخمل کو اچھا لگا۔

بہت مذہبی لوگ عموماً" اتنے سنجیدہ اور سخت نظر آتے ہیں کہ جیسے ایک وہی نیک مومن ہوں اور باقی سب گناہ گار کافر۔ اسے ایسے لوگوں سے شدید چڑ ہوتی تھی جن کے سامنے اسے لگے کہ وہ مجھ سے بہت گناہ گار سمجھ رہا ہے۔ مگر فرشتے اور اس کی مسجد کی لڑکیاں اس روایتی امیج سے بہت مختلف تھیں۔

"یہ ان کا ہے۔" اس نے دوسرا شاپر سامنے کیا۔

"ہمایوں کا؟"

"جی۔"

"اچھا' ہمایوں کبھی شہر میں ہوتا ہے' کبھی نہیں۔ میرا اس سے ایزیلی کونٹیکٹ نہیں رہتا۔ میں بھول بھی جاتی ہوں بہت۔ اگر تم یہ اس کے چوکیدار کو دے دو تو وہ پہنچا دے گا۔"

"فرشتے! انہوں نے آپ کو اپنی اور فواد بھائی کی ڈیل کے بارے میں بتایا تھا؟"

"ڈیل نہیں' وہ دراصل تنگ تھا فواد سے بہت تنگ تھا اور اسے اس کے گینگ کی کسی لڑکی کے ذریعے پکڑنا چاہتا تھا۔"

"وہ گینگ کی لڑکی کی توقع کر رہے تھے تو آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں ان کی کزن ہوں؟"

"تم نے خود بتایا تھا جب ہم پہلی دفعہ ہسپتال میں تجوید پڑھ رہے تھے۔"

"اوہ!" کئی دن کی الجھن سلجھ گئی۔ "میں تو گینگ کی لڑکی نہیں تھی' پھر انہوں نے فواد بھائی کو کیسے اریسٹ کر لیا؟"

"یہ تو تم ہمایوں سے پوچھنا۔ میری تو عرصے سے اس سے بات نہیں ہوئی۔"

"ٹھیک۔ وہ بجنے کو ہیں فرشتے! میں پھر آؤں گی۔" اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا ہمایوں سے زیادہ رابطہ نہیں رہتا مگر اسے فواد کے کیس کی ہر بات معلوم تھی۔ عجیب بات تھی۔

"اور میں دعا کروں گی کہ تم کبھی ہمارے ساتھ آ کر قرآن پڑھو۔"

"معلوم نہیں۔ شاید میں کچھ عرصے تک انگلینڈ چلی جاؤں۔"

"اوہ۔" فرشتے کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔

"آپ کی مسجد میں قرآن پڑھاتے ہیں؟"

"ہاں۔ سیدہ دراصل ایک اسلامک اسکول ہے۔"

"ہوں' میں چلتی ہوں۔" وہ اسے لان تک چھوڑنے آئی۔

"تمہیں کبھی کسی نے اس کتاب کی طرف نہیں بلایا محمل؟" جاتے سے اس نے پوچھا تو اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔

یادوں کے پردے پہ ایک سیاہ فام چہرہ لہرایا تھا۔

"بلایا تھا مگر میں نے دل کا انتخاب کیا اور میں خوش تھی۔ اس نے کہا تھا یہ کتاب سحر کرتی ہے' اور مجھے مسحور ہونے سے ڈر لگتا ہے۔"

"کتاب سحر نہیں کرتی' پڑھنے والا خود کو سحر زدہ محسوس کرتا ہے۔"

"ان دونوں میں کیا فرق ہے؟"

"بہت ہے۔ لفظوں کو الگ الگ پرکھنا سیکھو' ورنہ زندگی کی سمجھ نہیں آئے گی۔"

فرشتے چلی گئی اور وہ شاپر اٹھائے خود کو گھسیٹتی باہر

نکلی۔
ساتھ والے کھلے گیٹ میں اندر جاتی گاڑی لمحے بھر کو رکی۔ شیشہ نیچے ہوا۔ سر پہ کیپ اور روشن چہرے پہ ڈارک گلاسز لگائے اس نے اسے دیکھا تھا جو گیٹ کے سامنے کھڑی آنکھیں سکوڑے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ چوکیدار کو کچھ کہہ کر گاڑی زن سے اندر لے گیا۔
چوکیدار بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا۔
"صاحب کہہ رہا ہے، آپ کو اندر ڈرائنگ روم میں بٹھائے، وہ آتا ہے۔"
"تمہارے صاحب نے سوچا بھی کیسے کہ میں اس سے ملنے آئی ہوں۔ مائی فٹ۔ یہ پکڑو" اور اپنے صاحب کے منہ پہ مارنا۔" غصے سے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ سارا کیا دھرا اسی شخص کا تھا، اسے اس پہ بے طرح غصہ آیا تھا۔ اس نے شاپر اسے تھمایا۔
اسی پل وہ کیپ ہاتھ میں لیے تیزی سے چلتا ان تک آیا۔
"خان! گیٹ بند کر دو اور بتول سے کہو، چائے پانی کا بندوبست کرے، مہمان ہیں اور آپ، پلیز اندر آ جائیں۔" شائستہ و ہموار لہجہ وہ قطعی مختلف لگ رہا تھا۔
"مجھے اندر آنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"
"لیکن آغا فواد کے باہر آنے کی خبر سننے کا تو ہوگا۔"
اور وہ متذبذب سی سوچتی رہ گئی تو ہمایوں نے مسکرا کر سر جھٹکتے راستہ چھوڑ دیا۔
دن کی روشنی میں اس کا لاؤنج اتنا ہی نفیس تھا جتنا اس رات لگا تھا۔
اونچی دیوار گیر کھڑکیوں کے ہلکے سی گرین پردے نفاست سے بندھے تھے۔ سنہری روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ کونوں میں بڑے بڑے مغلیہ طرز کے سنہری گملوں میں لگے پودے بہت تروتازہ لگ رہے تھے۔
"بیٹھیے۔" وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا سامنے صوفے پہ بیٹھا۔ اس کے چہرے پہ کھڑکی سے روشنی سیدھی پڑ رہی تھی۔
"تھینک یو۔" وہ ذرا تکلف سے بیٹھی۔ اس کا صوفہ اندھیرے میں تھا۔ ہمایوں کو اس کا وجود بھی اسی تاریکی کا حصہ لگا تھا۔
"آپ نے جو بھی کہنا ہے، ذرا جلدی کہیے۔"
"ڈر رہی ہیں؟" وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، ٹیک لگائے محظوظ سا مسکرایا۔
"میں ڈرتی نہیں ہوں، بلکہ آپ کو بے حد ناقابل اعتبار سمجھتی ہوں۔"
"شوق سے سمجھیں، مگر میں نے آپ کو اغوا نہیں کیا۔ آپ کورٹ میں میرے خلاف بیان نہیں دے سکتیں۔"
"آپ کو کس نے کہا کہ میں آپ کے خلاف بیان دے رہی ہوں؟"
"آپ کے تایا نے۔"
محمل نے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔
"وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کورٹ میں یہ بیان دیں گی کہ میں نے آپ کو حبس بے جا میں رکھا اور بقیہ وہ آپ [illegible] دیکھ لیں گے۔"
"آپ کو کیوں لگا کہ انہیں مجھ پر دباؤ ڈالنا پڑے گا؟" وہ اب مطمئن سی ٹانگ پہ ٹانگ رکھے پاؤں جھلا رہی تھی۔ انداز میں ہلکا سا طنز تھا۔ ہمایوں ذرا چونک کر سیدھا ہوا۔
"کیا مطلب؟"
"حبس بے جا میں تو آپ نے مجھے رکھا تھا اے ایس پی صاحب۔"
"مس محمل ابراہیم! اتنی آسانی سے اتنے بڑے بیان نہیں دیے جا سکتے۔ حالانکہ آپ جانتی ہیں کہ میں بے قصور ہوں۔"
"بے قصور؟ اگر آپ مجھے گھر جانے دیتے تو میں یوں بدنام نہ ہوتی۔"
"پہلے آپ بے ہوش ہو گئیں، حالانکہ اس وقت آپ ایک اے ایس پی کی تحویل میں تھیں، ہمایوں داؤد کی نہیں۔ اگر آپ مسجد کی چھت نہ پھلانگتیں تو میں آپ کا بیان لے کر رات میں ہی آپ کو اکیلے گھر چھوڑ آتا۔"
"مجھے کمرے میں بند کرتے وقت تو آپ نے کسی بیان کا ذکر نہیں کیا تھا۔"
"مجھے قانون مت سکھائیں۔ وہ میرا تفتیش کا طریقہ تھا۔"
"اور آپ کے اس طریقے میں بھلے کوئی بدنام ہو جائے؟"
"تو ہو جائے، مجھے پروا نہیں۔"
"آپ۔۔۔" اس کا دل چاہا، وہ گملے اس کے سر پہ پھوڑ دے۔
"میم! اس وقت آپ کو آپ کے گھر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ہم فواد کو ڈھیل دے رہے تھے۔ میں جانتا تھا، آپ سمجھ گئی ہیں اور فجر سے پہلے مسجد کے دروازے نہیں کھلتے، سو فجر کی اذان ہوتے ہی آپ کو لینے آیا تھا۔"
"مجھے آپ کی کہانی نہیں سننی۔" وہ [illegible] اٹھی۔
وہ ابھی تک تاریکی میں تھی، جس سے اس کے چہرے کے نقوش [illegible] ہو گئے تھے۔
"اوکے، سنیں۔ مگر میرا کارڈ رکھ لیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے۔" اس نے ایک کارڈ اس کے ہاتھ میں گویا زبردستی رکھنا چاہا۔
"مجھے ضرورت نہیں ہے۔" اس نے پکڑ تو لیا، مگر جتانا نہ بھولی اور پھر اسی طرح کارڈ پکڑے باہر نکل گئی۔
وہ لاؤنج میں تنہا کھڑا رہ گیا۔ کھڑکی سے چھن کر آتی روشنی ابھی تک اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

لاؤنج میں سب بڑے موجود تھے۔ وہ سر جھکائے، کارڈ کو احتیاط سے پاکٹ میں چھپا کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔
"محمل!" غفران چچا نے قدرے رعب سے پکارا۔ آغا جان نے تو اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اس دن سے اس سے مخاطب نہیں ہوئے تھے۔
"جی؟" وہ ناگواری سے رکی۔
"کدھر سے آ رہی ہو؟"
"پرچہ کٹوانے گئی تھی تھانے!"
"واٹ؟" غفران چچا غضب ناک سے اس کی طرف بڑھے۔
"جی آپ کے فواد آغا کے خلاف پرچہ کٹوانے گئی تھی۔ کیوں؟ نہیں کٹوا سکتی؟" وہ ان کے بالکل سامنے کھڑی بلند آواز میں بدلحاظی سے بولی تھی۔ "اور مجھ سے آئندہ سوال جواب مت کیجئے گا، میں جدھر بھی جاؤں میری مرضی۔ آپ لوگ ہوتے کون ہیں مجھ سے۔۔۔"
چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کے منہ پہ تھپڑ لگا تھا۔
وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور چہرے پہ ہاتھ رکھے بے یقینی سے غفران چچا کو دیکھا۔
"پرچہ کٹواؤ گی تم؟ ہاں؟" انہوں نے اس کو بالوں سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔
"ہاں ہاں کٹواؤں گی۔ مجھے نہیں روک سکتے آپ لوگ۔" وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی۔
وہ پرے ہی تھے کہ اسد چچا اٹھے اور پھر ان دونوں بھائیوں نے کچھ نہ دیکھا۔ تابڑ توڑ اس پہ تھپڑوں کی بارش سی کر دی۔
آغا جان بڑے صوفے پہ خاموشی سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھے اسے پٹتے دیکھ رہے تھے۔ تائی مہتاب، ناعمہ اور فضہ بھی قریب ہی بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ سامیہ کچن کے کھلے دروازے میں کھڑی تھی۔ اوپر سیڑھیوں سے ندا جھانک رہی تھی۔
وہ اسے بری طرح گالیاں بکتے، مارتے چلے گئے۔ صوفے پہ بے حال سی گری چیخ چیخ کر رو رہی تھی مگر ان دونوں نے اسے نہیں چھوڑا۔
"بول، کٹوائے گی پرچہ؟" وہ دونوں بار بار یہی پوچھتے، یہاں تک کہ نڈھال سی محمل میں جواب دینے کی سکت نہ رہی تو انہوں نے ہاتھ روک لیا۔ صوفے کو ایک ٹھوکر مار کر غفران چچا باہر نکل گئے۔
"امی! امی!" وہ صوفے پہ گری منہ پہ بازو رکھے گھٹی گھٹی سسکیوں سے رو رہی تھی۔ مسرت ادھر

کہیں بھی نہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ سب بڑے ایک ایک کر کے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ سیڑھیوں سے لگی تماشا دیکھتی لڑکیاں بھی اپنے کمروں کو ہو لیں۔

"مر جاؤ تم سب۔ اللہ کرے تمہارے سب کے بچے مر جائیں، چھت گرے تم لوگوں پہ۔۔۔ گردن کاٹ دوں میں تمہارے بچوں کی۔۔۔" وہ ہچکیوں سے روتی گھٹ گھٹ کر بددعائیں دیے جا رہی تھی۔

کتنی ہی دیر بعد لاؤنج کا دروازہ کھلا اور دن بھر کا تھکا ہارا حسن اندر داخل ہوا۔ کوٹ بازو پہ ڈالے، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہ "ممی، ممی" پکارتا ذرا آگے آیا تو ایک دم ساکت رہ گیا۔

کارپٹ پہ بکھرے کشن اور ایک صوفہ جیسے ٹھوکر مار کر جگہ سے ہٹایا گیا تھا۔ اس پہ عجیب طرح سے گری محمل۔ بکھرے بال، چہرے پہ نیل۔ بازوؤں پہ سرخ نشان۔ وہ بازوؤں سے آدھا چہرہ چھپائے سسکیوں سے رو رہی تھی۔

وہ متحیر سا چند قدم آگے آیا۔

"محمل!" وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ "کس نے۔۔۔ کس نے کیا یہ سب؟"

"مر جاؤ تم!" ایک دم بازو ہٹا کر اس نے حسن کو دیکھا اور پھر چلائی تھی۔ "خدا کرے تم سب مر جاؤ، یتیموں پہ ظلم کرتے ہو، خدا کرے تمہارے بچے مر جائیں سب کے۔"

"محمل! مجھے بتاؤ، یہ کس نے کیا ہے میں۔۔۔"

"مر جاؤ تم سب۔" وہ پوری قوت سے چلائی، پھر یکدم بلک کر رو دی اور اٹھ کر لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کے تیسرے پہر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مدھم سی چرچراہٹ سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ لاؤنج سنسان اور تاریکی میں ڈوبا تھا۔

وہ دکھتے جسم کو زبردستی گھسیٹتی ٹی وی تک آئی۔ ساتھ ہی فون اسٹینڈ رکھا تھا۔ اس نے کارڈلیس نکالا اور ادھر ادھر احتیاط سے دیکھتی واپس آئی۔

مسرت آج گھر پہ نہ تھیں۔ صبح جب وہ میجر جانے کے لیے نکلی تھی تو مسرت گھر پہ ہی تھیں، مگر شاید اس کے جاتے ہی ان کو کہیں بھیج دیا گیا تھا۔ غالباً رضیہ پھپھو کے گھر۔

وہ دروازے کی کنڈی لگا کر بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ لائٹ آن کر رکھی تھی۔ سامنے دیوار پہ آئینہ لگا تھا۔ اسے اپنا عکس سامنے ہی دکھائی دے رہا تھا۔

لمبے بال چہرے کے اطراف میں گرے، سوجے ہونٹ، ماتھے اور گال پہ سرخ سے نشان جو نیلے پڑ رہے تھے۔ اس نے بے اختیار بال کانوں کے پیچھے اڑسے۔

وہ کارڈ ابھی تک اس کی جینز کی جیب میں تھا۔ اس نے مڑا تڑا سادہ کارڈ نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔

پہلی گھنٹی پوری بھی نہ گئی تھی کہ چونکتی سی "ہیلو" سنائی دی۔

"اے۔۔۔ اے ایس پی صاحب؟" اس کی آواز لڑکھڑائی۔

"کون؟" وہ چونکا تھا۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ محمل۔" اسے اپنا گھمنڈی انداز یاد کر کے رونا آیا۔

"محمل؟ کدھر ہو تم؟ خیریت ہے؟"

وہ چپ رہی۔ آنسو اس کے چہرے پہ لڑھکتے گئے۔

"محمل۔۔۔ بولو۔"

"مجھے، مجھے انہوں نے ٹارچر کیا ہے، مارا ہے۔"

"اوہ۔" وہ چپ ہو گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "اب کیسی ہو؟"

"مجھے نہیں پتہ۔" وہ رونے لگی تھی۔ "مجھے بتائیں، فواد بھائی جیل میں ہیں؟"

"ہے تو سہی، مگر شاید جلد ہی اس کی ضمانت ہو جائے۔ وہ لوگ عنقریب تمہیں میرے خلاف گواہی دینے پہ اکسائیں گے۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"مان جاؤ۔"

"کیا؟" اس نے بے یقینی سے فون کو دیکھا۔ عجیب سر پھرا شخص تھا۔

"تم جھوٹا وعدہ کر لو کہ تم میرے خلاف بیان دو گی، ورنہ یہ تمہیں کورٹ میں نہیں پہنچنے دیں گے۔"

"اور کورٹ میں جا کر مکر جاؤں؟"

"ہاں، فی الحال سب سچ بتا دینا۔"

"اور وہ اس دھوکے پہ میرا کیا حشر کریں گے، آپ کو اندازہ ہے؟"

"تم اس کی پروا۔۔۔"

"آپ سب مجھے اپنے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں، آپ کو مجھ سے کوئی سچی ہمدردی نہیں ہے۔"

چند لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر ہمایوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

وہ گم سی فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

مسرت اگلی صبح ہی آ گئی تھیں۔ انہوں نے کوئی سوال نہ کیا، کوئی جواب نہ مانگا۔ بس اسے دیکھ کر ایک چادر کی چپ ہونٹوں پہ لگ گئی۔ بہت دیر بعد آہستہ سے بولیں تو بس اتنا کہ

"تم فواد کے خلاف ضرور گواہی دو گی۔ انہوں نے میری بچی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" اور پھر چپ چاپ کام میں لگ گئیں۔

پورے گھر کا اس سے سوشل بائیکاٹ تھا۔ وہ کمرے میں کھانا کھاتی اور سارا دن اندر ہی بیٹھی رہتی۔ باہر نہ نکلتی، اگر نکلتی بھی تو کوئی اس سے بات نہ کرتا۔

اس روز بہت سوچ کر وہ فرشتے سے ملنے مسجد چلی آئی۔

کالونی کی سڑک گھنے درختوں کی باڑ سے ڈھکی تھی۔ درختوں نے سارے میں ٹھنڈی چھاؤں کر رکھی تھی۔ آہنی گیٹ کے سامنے رک کر اس نے گردن اوپر اٹھائی۔

سفید اونچے ستونوں والی وہ عالیشان عمارت اپنے اسی وقار و تمکنت کے ساتھ کھڑی تھی۔ برابر میں سبز بیلوں سے ڈھکا بنگلہ تھا جس کی بیرونی دیوار کے ساتھ ایک خالی سنگی بنچ نصب تھا۔ محمل جب بھی ادھر آتی، وہ بنچ ویران نظر آتا۔ اسے بے اختیار بس اسٹاپ کا بنچ اور وہ سیاہ فام لڑکی یاد آئی تھی، نہ جانے کیوں۔

سفید سنگ مرمر کی فرش پہ چمکتی راہداریاں آج بھی ویسی ہی پرسکون تھیں جیسی وہ ان کو چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ ادھر ادھر کلاسز کے کھلے دروازوں میں جھانکتی آگے بڑھتی گئی۔

"باب لُد، دجال مدینہ طیبہ میں نہ آ سکے گا۔"

آخری کھلے دروازے سے اسے فرشتے کی آواز سنائی دی۔ اس نے ذرا سا جھانکا۔

وہ کتاب ہاتھ میں لیے منہمک سی پڑھا رہی تھی۔ سیاہ عبایا کے اوپر سرمئی اسکارف میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور وہ سنہری چمک دار کرسٹل کی سی آنکھیں۔۔۔ اس نے کہیں دیکھ رکھی تھیں۔۔۔ مگر کہاں؟

وہ انہی سوچوں میں گھری دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی جب فرشتے باہر آئی۔

"ارے محمل! السلام علیکم۔"

اور اسے دیکھ کر وہ خود بھی بہت خوش ہوئی تھی۔

"تم کیسی ہو محمل؟ آؤ بلکہ یوں کرو میرے ساتھ اندر آفس میں چلتے ہیں۔" فرشتے نے اس کا ہاتھ ہولے سے تھاما اور پھر اسے تھامے ہی اسے مختلف راہداریوں سے گزارتی اپنے آفس تک لائی۔

"اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے بیٹھتے ہوئے میز کی شیشے کی سطح میں اپنا عکس دیکھا۔ بھوری اونچی پونی ٹیل سے نکلتی لاپروا لٹیں، آنکھوں تلے گہرے حلقے، ماتھے اور گال پہ گہرے نیل، اور ہونٹوں کے سوجے کنارے۔

یکدم روشنی اس کے چہرے پہ پڑی تو اس نے آنکھیں چندھیا کر چہرہ پیچھے کیا۔ فرشتے اپنی کرسی کی پشت پہ کھڑکی کے بلائنڈز کھول رہی تھی۔

"ہمایوں نے بتایا تھا تم نے اسے کال کی تھی؟"

وہ ذرا سی چونکی۔ ہمایوں ہر بات کیوں اسے بتاتا تھا؟

اسے یہ نہیں بتانا چاہیے تھا۔

"ہمایوں کو تمہاری بہت فکر تھی۔" وہ واپس کرسی پہ آ بیٹھی تھی۔

"انہیں میری نہیں، اپنی فکر ہے۔ بہت خود غرض ہیں آپ کے کزن۔"

"جانے دو۔" وہ نرمی سے مسکرائی۔ "کسی کے پیچھے اس کا برا ذکر نہیں کرتے۔"

"جو بھی ہے۔" اس نے شانے اچکائے۔ یقیناً وہ اپنے کزن کی برائی نہیں سن سکتی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ۔" وہ ذرا کرسی پہ آگے کو ہوئی۔ "آگے پڑھائی کا کیا پروگرام ہے؟"

"ستمبر میں یونیورسٹی جوائن کرنی ہے۔"

"تو ابھی گرمیوں کی چھٹیوں میں ادھر اسکول آ جاؤ، قرآن پڑھنے۔"

"... نہیں ... ایکچوئلی ... میرے پاس قرآن ہے ترجمے والا۔ گھر میں پڑھ لوں گی۔"

"بی ایس سی میں کون سا سبجیکٹ تھا؟"

"میتھس۔"

"کس سے پڑھا تھا؟"

"کالج میں پروفیسر سے اور شام میں ایک باجی کے پاس ٹیوشن لینے جاتی تھی۔"

"میتھس کی بک تھی تو سہی تمہارے پاس، پھر وہ دو جگہ سے کیوں پڑھا؟ گھر بیٹھ کر پڑھ لیتیں۔"

"گھر میں خود سے کیسے پڑھا جاتا ہے اور..." پھر رک گئی اور جیسے سمجھ کر گہری سانس لی۔ "قرآن اور نصابی کتابوں میں فرق ہوتا ہے۔"

"اسی لیے ہم چار سال کی عمر سے ٹیکسٹ نصاب کو پڑھتے رہتے ہیں اور قرآن کو بڑھاپے کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔"

"مگر قرآن کو اللہ نے آسان بنا کر اتارا ہے تاکہ ہر کوئی سمجھ سکے۔ میتھس ٹیچر کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔"

"قرآن آجاتا ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

فرشتے نے گہری سانس لی اور جھک کر دراز سے ایک سیاہ جلد والی دبیز کتاب نکالی۔

"یہ انجیل مقدس کا ایک قدیم حصہ ہے۔ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیش گوئی ہے۔ کافی دلچسپ ہے یہ پڑھو۔" اس نے ایک صفحہ کھول کر اس کے سامنے کیا۔ محمل نے کتاب اپنی جانب کھسکائی۔

"اس کی امت کی اناجیل ان کے سینوں میں ہوں گی۔" وہ بے اختیار رکی۔ "اناجیل؟" اس نے پوچھا۔

"انجیل کی جمع۔ مراد ہے قرآن مجید۔ یہ یہاں سے پڑھو۔" فرشتے نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ مخروطی سپید انگلی جس کا گلابی ناخن نفاست سے تراشیدہ تھا۔ اس نے انگلی میں زمرد جڑی چاندی کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔

"وہ اچھا۔" وہ ادھر سے پڑھنے لگی۔

"وہ بازاروں میں شور کرنے والا نہ ہو گا نہ بے ہودہ گو۔ نام احمد ہو گا۔ ولادت مکہ، ہجرت طیبہ اور ملک شام ہو گا۔ وہ آفتاب کے سایوں پہ نظر رکھنے والا ہو گا۔ اس کے اذان دینے والے کی آواز دور تک سنی جائے گی۔" وہ رک کر جیسے الجھ کر پھر شوق سے دیکھنے لگی۔

"ملک شام ہو گا؟"

"بعد میں مسلمانوں کی حکومت شام تک پھیل گئی تھی۔ اسی طرف اشارہ ہے۔"

"اور آفتاب کے سایوں پہ نظر رکھنا...؟"

"نمازوں کے اوقات کے لیے۔"

"اور اذان دینے والا...؟"

"بلال۔" فرشتے جواب دیتے ہوئے مسکرائی۔

"گھر بیٹھ کر پڑھو گی تو یہ سوال کس سے پوچھو گی؟"

"قرآن کی تفاسیر بھی تو پڑھ سکتے ہیں۔"

"علم پڑھنے سے نہیں سمجھنے سے آتا ہے۔"

"آخر گھر بیٹھ کر پڑھنے میں کیا ہے؟"

"موسیٰ کو خضر کے پاس جانا پڑتا ہے میری جان، خضر موسیٰ کے پاس نہیں آتے۔ اچھی کوالٹی کے علم کے لیے اتنا ہی سفر کرنا پڑتا ہے۔"

"آپ... آپ کی ساری بات ٹھیک ہے مگر مگر میری بات بھی ٹھیک ہے۔"

"مذبذبین بین ذالک لا الی ھولاء ولا الی ھولاء۔" فرشتے پین کو انگلیوں کے درمیان گھماتی مسکرا کر گہری سانس لے کر بولی۔ "وہ ان کے درمیان تذبذب میں ہیں، نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے ہیں۔"

"آپ نے عربی میں کچھ کہا تھا؟ اب عام بندے کو عربی کہاں سمجھ میں آتی ہے؟ قرآن اردو میں کیوں نہیں اترا؟"

"اچھا سوال ہے۔" وہ اپنی نشست سے اٹھی اور سامنے کتابوں کے ریک کی طرف گئی۔ پھر سیدھی کھڑی کتابوں کی جلدوں پہ انگلی گزارتی کسی کتاب کو تلاش کرنے لگی۔

"تو تمہارا نقطہ یہ ہے کہ صرف خالی محاورتاً ترجمہ دیکھ کر قرآن پڑھنا بھی کافی ہے۔" اس نے ایک کتاب پہ انگلی روکی اور اسے کھینچ کر باہر نکالا۔

"یہ سورۃ بنی اسرائیل میں ابلیس کے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے کا قصہ ہے۔ یہاں ابلیس نے اولاد آدم کے لیے کیا لفظ استعمال کیا..." اس نے عربی ترجمے والا قرآن اس کے سامنے کھول کر رکھا اور اپنی زمرد جڑی انگوٹھی والی انگلی ایک لفظ پہ رکھی۔ محمل بے اختیار قرآن پہ جھکی۔

"لاحتنکن" البتہ میں ضرور قابو کروں گا۔" اس نے لفظ اور ترجمہ دونوں پڑھے۔

"رائٹ۔ اگر البتہ میں اور ضرور کے شدوں کو نکال دو تو تین حرفی لفظ رہ جاتا ہے۔ ح ن ک یعنی حنک، حنک کے تین معانی ہوتے ہیں۔ کسی چیز کو خوب باریکی میں سمجھنا، ٹڈیوں کا کھیت کا صفایا کرنا اور گھوڑے کے جبڑوں کے درمیان سے لگام گزار کر گھوڑے کو قابو کرنا۔ اردو میں بس اتنا لکھا ہے قابو کرنا۔ جسے انگریزی میں کنٹرول کہتے ہیں۔ جبکہ عربی کی وسعت ہمیں بتاتی ہے کہ شیطان کس طرح ہماری نفسیات سمجھ کر، ہمارے ایمان کا صفایا کر کے ہمیں لگام ڈالتا ہے اور وہ لگام عموماً منہ کے راستے سے ڈالی جاتی ہے اور قرآن اسی لیے عربی میں اترا اور... تم میری بات سے بور ہو رہی ہو۔ چلو جانے دو۔ ابھی تمہارے پاس ٹائم ہے، اس لیے کہہ رہی تھی، ورنہ بعد میں دنیاوی تعلیم میں کھو کر تمہیں اس کا وقت نہیں ملے گا۔"

"یعنی آپ بھی ٹیپیکل مولویوں کی طرح دنیاوی تعلیم کو گناہ سمجھتی ہیں؟"

"میں دنیاوی تعلیم میں کھو کر مادہ پرست بننے کو گناہ سمجھتی ہوں۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔" وہ بیگ کندھے پہ ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے، گھر میں سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"پریشان وریشان کوئی نہیں ہوتا، یتیموں کی پروا کسی کو نہیں ہوتی۔"

"کون یتیم؟"

"میں، میرے ابا نہیں ہیں۔"

"عمر کیا ہے تمہاری؟"

"بیس سال۔"

"پھر تو تم یتیم نہیں ہو۔ یتیم تو اس نابالغ بچے کو کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہو جائے۔ بلوغت کے بعد کوئی یتیمی نہیں ہوتی۔ اپنی اس خود ترسی کو اپنے اندر سے نکال دو محمل!"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" محمل بے یقینی سے پیچھے ہٹی اور چند لمحے اسے یونہی بے اعتبار نگاہوں سے دیکھ کر پلٹی اور تیزی سے باہر بھاگ گئی۔

فرشتے کی بات نے ایک دم اسے بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔

"بھاڑ میں گئی ڈکشنری، میں یتیم ہوں!" وہ تیزی سے راہداری عبور کر کے برآمدے میں آئی۔ آگے نکل ہی نہ پائی تھی کہ ریسیپشنسٹ نے روک لیا۔

"السلام علیکم۔ یہ آپ کا ایڈمیشن فارم، فرشتے باجی نے کہا تھا کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔"

"اف! اوہ!" گہری سانس بھر کر ڈیسک کے قریب آئی۔

"دکھایئے۔"

"بس دیکھ کر واپس کر دوں گی مجھے مولوی نہیں بننا' ماسٹرز کرنا ہے۔" اس نے سوچا۔
"نیا بیچ کون سا ہے؟" وہ اب پراسپیکٹس کے صفحے پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔
"تفہیم الکتاب۔ پرسوں پہلی کلاس ہے۔"
"میں فرشتے کو صاف انکار کر دوں گی' بھلے وہ برا منائے۔ بس پورا دیکھ کر واپس کر دوں گی۔" وہ سوچ رہی تھی۔
"اور یہ فارم فل کر کے کدھر دینا ہے؟"
"اسی ڈیسک پہ۔"
"اور فیس؟"
"علم کی فیس نہیں ہوتی۔"
"پھر بھی کچھ چارجز تو ہوں گے۔"
"ہم قرآن پڑھانے کے چارجز نہیں لیتے۔"
"تو نہ لیں' مجھے کون سا ادھر داخلہ لینا ہے۔ میں تو پورا دن اسکارف لپیٹ کر قرآن نہیں پڑھ سکتی۔ آئی ایم سوری فرشتے' مگر میں یہ نہیں کروں گی۔" اس نے خود کلامی کی تھی۔
مگر بس بے مقصد وہ فارم فل کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بیگ کو اسٹریپ سے تھامے' ہاتھ گرائے یوں تھکے تھکے قدموں سے چل رہی تھی کہ بیگ لٹکتا ہوا زمین کو چھو رہا تھا۔ کالونی کے گھنے درخت خاموشی سے جھکے کھڑے تھے۔ وہ آہستہ سے بنچ پہ جا بیٹھی جو آج بھی اداس تھا۔ وہ فارم جمع کرا کے فرشتے سے ملے بغیر وہاں سے نکلی تھی' ابھی تک وہی سوچ رہی تھی' تب ہی کسی کے دوڑتے قدم اس کے قریب ست پڑے۔
"کیسی ہو؟" کوئی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔
اس نے ہولے سے سر اٹھایا۔
ہمایوں بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ ٹراؤزر پہ رف سی سفید شرٹ پہنے' ماتھے کے گیلے بال اور چہرے پہ نمی' پھولی سانس' جیسے تیز جاگنگ کرتا ادھر آیا تھا۔
"کیا فرق پڑتا ہے آپ کو؟"
"فرق تو پڑتا ہے۔ تمہیں یوں دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ تم میرے خلاف کورٹ میں پیش ہونے کے لیے تیار ہو گئی ہو۔"
"ہونا پڑے گا مگر اب کیا کروں۔"
"کچھ نہ کرو۔" وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ محمل چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ جو سامنے گھنے درختوں کی باڑ کو دیکھ رہا تھا۔ "جب تک تم عدالت میں جاؤ گی' ہمارا پھندا افواد کی گردن کے گرد مزید تنگ ہو چکا ہو گا۔ بس ابھی ان کی مانتی جاؤ اور کورٹ میں سچ بول دینا۔"
"استعمال کر لیں سب مجھے اپنے اپنے مقاصد کے لیے۔" وہ دکھ سے سر جھٹک کر اٹھی اور زمین پہ گرا بیگ اسٹریپ سے اٹھایا۔
"کمزور ہو گئی ہو' بہت اپنا خیال رکھا کرو۔"
"آپ کی فکر میں بھی غرض پوشیدہ ہے۔ کاش میں آپ کے خلاف بیان دے سکوں۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی سڑک پہ آگے بڑھ گئی۔
وہ شانے اچکا کر گیٹ کی طرف آیا' گیٹ بند کرتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کو گردن موڑ کر اسے دیکھا ضرور تھا جو سر جھکائے تیز تیز سڑک کے کنارے چلتی جا رہی تھی۔ اس کی بھوری اونچی پونی ٹیل گردن پہ برابر جھول رہی تھی۔
ہمایوں پلٹ کر ڈرائیو وے پہ جاگنگ کی طرح بھاگتا ہوا اندر بڑھ گیا۔
درختوں کی باڑ اور پتھر کا بنچ پھر سے ویران ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو!"
وہ بیڈ سے ٹیک لگائے' گھٹنوں پہ پراسپیکٹس رکھے سرسری سا پڑھ رہی تھی جب دروازہ کھلا۔ آواز پہ محمل نے سر اٹھایا۔
چوکھٹ میں آرزو کھڑی تھی۔ ریڈ ٹراؤزرز کے اوپر سلیولیس سفید شرٹ' یہ اس کا مخصوص ایکسر سائز کا

لباس پہنا ہوا تھا۔ بال کٹے ہوئے تھے جو بمشکل شانوں تک آتے تھے۔ تیکھی کمان کی طرح بھنویں اٹھائے وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" انداز دوستانہ تھا۔ محمل بمشکل سنبھل پائی۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟" وہ سیدھی ہو بیٹھی اور پراسپیکٹس نامحسوس انداز سے ایک طرف کھسکا دیا۔

"فٹ!" وہ بے تکلفی سے اس کے بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ اندر آتے ہوئے اس نے دروازہ پورا بند کر دیا تھا۔ محمل بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی جو علوی "بالوں میں انگلیاں چلاتی" اپنی پتلی بھنوؤں کو سکیڑے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کتنا چھوٹا کمرہ ہے تمہارا محمل! ایٹ لیسٹ آغا جان کو تمہیں پراپر بیڈ روم دینا چاہیے تھا۔ بعض دفعہ آغا جان بہت زیادتی کر جاتے ہیں۔ ہے نا؟" اس نے رائے مانگی۔ محمل نے ایک نظر دروازے کو دیکھا۔ وہ بند تھا۔

"معلوم نہیں۔"

"وہ تم کو تو شش ایاسے کہہ کر تمہیں بڑا روم دلوا دوں؟"

(یہ خیال اتنے سالوں میں تو آپ کو نہیں آیا۔ آج کیوں؟)

"اٹس اوکے۔ میں خوش ہوں۔" اس نے پھر سے بند دروازے کو دیکھا۔ "مجھے آغا جان سے کوئی شکایت نہیں۔"

"خیر، آغا جان کی ہی کیا بات۔ خود فواد نے تمہارے ساتھ کتنی زیادتی کی۔ کم از کم گھر کی عزت کا ہی خیال کیا ہوتا۔"

"آپ کو 'آپ کو' میرا یقین ہے؟" اسے جھٹکا لگا تھا۔

"آف کورس۔ فواد کو کون نہیں جانتا اور اب تو یہ لوگ تمہارے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔"

"کیسی سازشیں؟" وہ محتاط ہوئی۔

"یہ تم سے اس اے ایس پی کے خلاف بیان دلوائیں گے۔ کیا نام تھا اس کا؟ ہمایوں؟" اس کا انداز بے حد سرسری تھا۔

"ہمایوں داؤد۔" بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

"ہاں اسی کے گھر فواد تمہیں لے گیا تھا۔ کدھر رہتا ہے وہ؟" اب آرزو بہت ہی لاپروائی سے کہتی ادھر ادھر زیادہ دیکھ رہی تھی۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا آرزو باجی کہ وہ کس کا گھر تھا۔"

"فون نمبر تو ہوگا تمہارے پاس؟"

"جی ہے۔ آپ کو چاہیے؟"

"ہاں بتاؤ!" آرزو یکدم الرٹ سی ہوئی۔ سارا سرسری پن اڑنچھو ہو گیا۔

"ون فائیو پہ کال کر لیں، یہی نمبر ہوتا ہے پولیس والوں کا۔" اس نے مسکراہٹ دبائے پراسپیکٹس پھر سے اٹھا لیا۔

خیر، رہنے دو۔ مجھے کام ہے، چلتی ہوں۔" آرزو ناگواری سے کہتے ہوئے تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

"ان کا بھی کیسا دل ہے، فٹ بال کی طرح فواد اور ہمایوں کے درمیان لڑھکتا رہتا ہے۔ ہونہہ۔" اس نے استہزائیہ سر جھٹک کر پھر سے پراسپیکٹس اٹھا لیا۔

☆ ☆ ☆

آج کتنے ہی دنوں بعد وہ خود سے ناشتے کی میز پہ موجود تھی۔ کسی نے اس کو مخاطب نہ کیا، وہ خود بھی خاموشی سے تیز تیز لقمے لے رہی تھی۔ یونیفارم کی سفید شلوار قمیص پہنے اور بے بی پنک اسکارف گردن میں ڈالے، بالوں کی اونچی پونی ٹیل بنائے وہ اپنی پلیٹ پہ جھکی تھی۔

"محمل!" فضہ چچی نے خود ہی اسے مخاطب کر لیا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ "کالج جوائن کر لیا ہے؟" توس پہ جیم لگاتے حسن نے چونک کر اسے دیکھا جو سر جھکائے ناشتے میں مگن تھی۔ اونچی بھوری پونی سے

ایک لٹ نکل کر گال کو چھو رہی تھی۔ فضہ کے پکارنے پہ اس نے گردن اٹھائی۔

"نہیں۔ ایک انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لیا ہے۔"

"کیا پڑھتی ہو ادھر؟"

"میں بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔" وہ کرسی دھکیلتی اٹھ گئی تھی۔ حسن کی نگاہوں نے دور تک اسے باہر جاتے دیکھا تھا۔

اسکول کی ایک راہداری میں لگے ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اسکارف کو سر پہ رکھا اور چہرے کے گرد نفاست سے لپیٹ کر پن لگائی۔ یوں کہ دمکتی سنہری رنگت والا چہرہ بے بی پنک ہیضوی ہالے میں مقید ہو گیا۔ اونچی پونی ٹیل کے باعث پیچھے سے اسکارف قدرے اوپر اٹھ گیا۔

"ہوں نائس۔" وہ خود کو سراہتی واپس برآمدے تک آئی۔ گھر سے اسکارف لے کر آنا اسے عجیب سا لگ رہا تھا، سو یہیں آکر اس نے اسے سر پہ لیا تھا۔

برآمدے سے چوڑی سیڑھیاں نیچے ہال میں جاتی تھیں۔ ساتھ ہی جوتوں کا ریک رکھا تھا۔ اس نے جوتے ریک پہ اتارے اور ننگے پاؤں سنگ مرمر کے ٹھنڈے زینے اترنے لگی۔

وسیع و عریض prayer ہال بھرا ہوا تھا۔ قالین پہ سفید چادریں بچھی تھیں۔ ان پہ بہت سلیقے سے صفوں میں ڈیسک لگے تھے۔ وہ ڈیسک زمین سے بالشت بھر ہی اونچے تھے جیسے عموماً مدرسوں میں ہوتے ہیں۔ ڈیسکوں کے پیچھے سفید یونیفارم اور بے بی پنک اسکارف سے ڈھکے سروں والی لڑکیاں سفید چادروں پہ دوزانو مؤدب سی بیٹھی تھیں۔

محمل نے آہستہ سے آخری سیڑھی پہ پاؤں رکھا۔ وہ ہال کے آخر میں تھی۔ اس کے سامنے ان ساری صفوں میں بیٹھی لڑکیوں کی پشت تھی۔ سامنے اونچے پلیٹ فارم پہ میڈم کی کرسی اور میز تھی۔ ان کے پیچھے دیوار پہ وہ کیلی گرافی آویزاں تھی۔

"قرآن ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ جمع کر رہے ہیں۔"

اسے لگا وہ ان لڑکیوں کی طرح نیچے نہیں بیٹھ سکے گی۔ سو ہال کے آخر میں دیوار سے لگی کرسیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اس کی کتابیں خاصی انٹرسٹنگ تھیں۔ کتاب الطہارۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب العلم، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الصیام، کتاب الحج و عمرہ۔ چھوٹے چھوٹے کتابچے تھے۔ باقی ایک سپارہ تھا۔ پہلا سپارہ بہت بڑے سائز کا۔ ہر صفحے پہ بڑی بڑی پانچ عربی کی سطور تھیں اور ہر دو کے درمیان تین خالی لائنیں تھیں، غالباً نوٹس لینے کے لیے۔ عربی کے ہر لفظ تلے اس کا اردو ترجمہ ایک چوکور خانے میں لکھا تھا، یوں ہر لفظ الگ الگ نظر آتا تھا۔

وہ دس منٹ لیٹ تھی۔ میڈم مصباح کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔

"سب سے پہلے تو آپ لوگ یہ ذہن میں رکھیں کہ یہاں آپ کو دین پڑھایا جائے گا، مذہب نہیں۔ دین اور مذہب میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دین religion کو کہتے ہیں اور مذہب عقیدے یا اسکول آف تھاٹ کو۔ دین پڑھنے سے قبل ایک بات ذہن میں نقش کر لیں اور گرہ سے باندھ لیں۔ دین میں دلیل صرف قرآن کی آیت یا حدیث صلی اللہ علیہ وسلم سے دی جا سکتی ہے۔"

اب وہ سورۃ فاتحہ سے آغاز کر رہی تھیں۔

"الحمد للہ۔ عربی کے الفاظ تین یا چار حروف سے بنتے ہیں جنہیں ہم روٹ ورڈ کہتے ہیں۔ الحمد میں "حمد" کا روٹ ورڈ حا میم دال (ح م د) ہے۔ یعنی تعریف۔ اسی "حمد" سے حامد، حماد، احمد، محمد، حمید، محمود بنتے ہیں۔ حامد 'تعریف کرنے والا'، احمد 'تعریف والا'، حمید 'خوب خوب تعریف والا'۔ جب آپ قرآن کو لسٹل ورڈ ڈیفینیشن پہ پڑھیں گے تو آپ اتنا انجوائے کریں گے کہ بس۔ جیسے "مسجد" کا روٹ ورڈ "سجد" ہے اس سے مسجد، ساجد، سجدہ بنتا ہے۔"

پڑھانے کا انداز دلچسپ تھا۔ محمل تیزی سے نوٹس لے رہی تھی۔ اس نے بارہا سوچا کہ یہ فیصلہ صحیح تھا یا

غلط مگر اندر سے وہ متذبذب سی رہی تھی۔

اگلے کچھ روز وہ پڑھائی میں اتنی مصروف رہی کہ فرشتے سے مل ہی نہ سکی۔ تجوید، تفسیر، حدیث کی پڑھائی۔۔۔ پڑھائی ٹھیک تھی اور بس ٹھیک ہی تھی۔ کوئی غیر معمولی چیز تو اسے ابھی تک نظر نہ آئی تھی۔ البتہ اپنی رائے صحیح لگی کہ قرآن میں وہی کچھ تھا جو اس نے سوچا تھا۔ نماز کا حکم، زکوٰۃ دینا، مال خرچ کرنے کی تاکید۔ مومن، کافر، منافق کی تعریف وہی، مدینہ کے منافقوں کا ذکر۔ یعنی اب مسلمان ہیں، "اتنا تو پڑھ ہی رکھا تھا۔ ہاں وہ باتیں تو ہرگز نہ تھیں جس کا ذکر وہ سیاہ فام لڑکی کیا کرتی تھی۔

البتہ وہ قرآن کو بہت دھیان سے پڑھتی، "الفاظ کے معنی یاد کرنے کی کوشش کرتی، نوٹس لیتی" اور روٹ ورڈز سمجھتی۔ آہستہ آہستہ اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا غلط قرآن پڑھتی تھی۔ الفاظ کو مجہول ادا کرتی تھی۔

مثلاً "ب (بازیر) بی ہوتا ہے" مگر وہ بازبر (بے) پڑھتی تھی اور یہ ساری آسیاں "نانی والیاں" جو ہمیں قرآن سکھاتی ہیں "وہ عیں" غلط تلفظ سے مجہول ہی پڑھتی ہیں۔ بس میں اور بث کا فرق ہی نہیں پتہ چلتا۔

"جب ہم زیر زبر کو بہت لمبا کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم قرآن میں ایک حرف کا اضافہ کر رہے ہیں۔ زبر کو کھینچ کر الف کا اضافہ کر رہے ہیں، قرآن میں تحریف کر رہے ہیں۔ معانی بدل رہے ہیں۔ انگریزی کو تو خوب برٹش اور امریکن لہجے میں بولنے کی کوشش کرتے ہیں اور قرآن، جس کو عربی لب و لہجے میں پڑھنے کا حکم ہے اور جس میں زبر زیر کو اصل سے زائد کھینچنا بھی حرام درجے کی غلطی شمار ہوتا ہے، اس کے سیکھنے کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔"

مسجد میں ایک اور عجب رواج تھا، اسے شروع میں تو عجب ہی لگا اور بعد میں اچھا۔ وہاں ہر کسی کو سلام کیا جاتا تھا۔ راہداریوں میں سے گزرتے، سیڑھیوں پہ اترتے چڑھتے، جو بھی لڑکی نظر آتی، اس کو مسکرا کر سلام کیا جاتا۔ بھلے کسی کو آپ جانتے ہیں یا نہیں، مگر سلام فرض تھا۔ کسی کو مخاطب کرنے کے لیے بھی "ایکسکیوز می" کی جگہ "السلام علیکم" کہہ کر مخاطب کیا جاتا۔

"ایکسکیوز می کہہ کر سوالی کس منطق کی مانتیں ہیں جو ہوئی ہی نہیں؟ دعا کیوں نہ دیں؟" فرشتے نے بہت پہلے بتا دیا تھا تو وہ سوچتی رہ گئی تھی۔

ان تمام سوچوں کے برعکس محمل قرآن کو عزت دیتی۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی صبح کے نوٹس پڑھ رہی تھی، جب دروازہ ہولے سے بجا۔ اس نے حیرت سے سر اٹھایا۔ یہ کھٹکھٹا کر کون آئے گا بھلا اس کے کمرے میں؟

"جی؟" دروازہ ہولے سے کھلا۔ وہ الجھ کر آہستہ آہستہ کھلتے دروازے کو دیکھے گئی۔ یہاں تک کہ وہ پورا کھل گیا اور لمحے بھر کو تو وہ سن سی ہو گئی، پھر جیسے بوکھلا کر نیچے اتری۔

"آ۔۔۔ آغا جان۔۔۔ آپ؟"

وہ دہلیز میں کھڑے تھے۔ اطراف کا جائزہ لیتے، کمر پہ ہاتھ باندھے اندر داخل ہوئے۔

"آپ۔۔۔ آپ بیٹھیں آغا جان! مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

وہ انہیں کہاں بٹھائے۔ جلدی سے سپارہ اور نوٹس پرے رکھا اور بیڈ کی چادر ٹھیک کی۔ وہ خاموشی سے بیڈ پہ بیٹھ گئے۔

"ادھر آؤ بیٹا! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

یہ اس واقعے کے بعد پہلی دفعہ تھا جب وہ اس سے مخاطب ہوئے تھے اور انداز میں خاصی نرمی تھی۔ وہ کسی معمول کی طرح ان کے سامنے آ بیٹھی۔

"جی۔۔۔ جی۔"

"محمل!" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے آہستہ سے بولے۔ محمل سانس روکے ان کو دیکھے گئی۔

"فواد نے تمہارے ساتھ برا کیا، بہت برا۔ میں تم سے اس کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں آغا جان پلیز۔" انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تو وہ موم کی طرح پگھلنے لگی، بے اختیار ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں ہوئیں، میں جانتا ہوں اور اب میں ان کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی؟" وہ کچھ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

"میں جائیداد میں سے تمہارا حصہ الگ کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم اس کی دیکھ بھال کر سکو۔ ففٹی پرسنٹ کی تم مالک ہو۔ تم وہ حصہ لے لو۔ میں نے وکیل کو پیپرز تیار کرنے کا کہہ دیا ہے۔"

وہ حق دق ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"کیا تم اپنا حصہ لینا چاہتی ہو؟"

"جی۔۔۔ جیسے آپ کہیں۔" بعض دفعہ اپنے حقوق کی بات اکیلے میں کرنا آسان ہوتا ہے بہ نسبت اپنے مخالفین کے سامنے۔ وہ اور کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ بس یک ٹک انہیں دیکھے گئی جو اس کے سامنے بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھے تھے۔

"میں آج جائیداد کے کاغذ سائن کرتا ہوں مگر تم... میری ایک شرط ہے۔" وہ لمحے بھر کو رکے۔ ان کی نگاہیں اس کے چہرے پہ جمی تھیں، وہ پلک نہیں جھپک رہے تھے۔ اسے دیکھ رہے تھے جو دم سادھے ان کی منتظر تھی۔

"تم فواد کے خلاف نہیں بلکہ اے ایس پی ہمایوں داؤد کے خلاف اغوا کے جرم کا بیان دو گی کورٹ میں۔"

وہ ادھ کھلے لب اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔

"عدالت نے ہمیں تاریخ دے دی ہے۔ اگلے ماہ کی تاریخ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم عدالت میں اپنے بیان سے نہ پھرو تاکہ میں جائیداد کے کاغذ تمہارے حوالے کروں۔ جیسے ہی تم کورٹ میں بیان دو گی، میں دستخط کر دوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ انہیں دیکھنے کے لیے گردن بھی نہ اٹھا سکی۔

"تمہارے پاس وقت ہے، خوب اچھی طرح سوچ لو اور اسے ایک بزنس ڈیلنگ سمجھو۔ یہ تمہیں آئندہ ابراہیم کی بزنس ایمپائر سنبھالنے میں مدد دے گی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھے۔

"مجھے منظور ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔ فیصلہ کرنے میں اسے ایک پل لگا تھا۔ بھاڑ میں گیا ہمایوں، جس نے جاتے ہوئے تو اسے بھی پیچھے رکھا تھا۔

انہوں نے ذرا سا مڑ کر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"ہوں، اچھی بزنس وومن بن سکتی ہو، گڈ۔ ٹھیک ہے۔" اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

کیا یوں ہمایوں گرفتار ہو جائے گا؟ اور۔۔۔ اور فواد۔۔۔ کیا وہ گھر آ جائے گا؟ نہیں۔۔۔ مگر جائیداد اور اپنے مقام کو پا لینے کی خواہش۔ کبھی وہ بھی تنی پہ یونہی ختم جائے۔ سب اس کی عزت کریں، اس کے حکم سے گھر میں کام ہوں، اس کی موجودگی ہر جگہ ضروری سمجھی جائے۔ وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔

کیا اس نے صحیح کیا؟ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح آٹھ بجے وہ مسجد کے گیٹ پہ تھی۔ تبھی اندر داخل ہونے سے قبل اس نے رک کر ریلنگ سے جھانکتے ہوئے دیکھا، جس کا کونا آج بھی ویران پڑا تھا۔

"بابا! تمہارا صاحب ہے؟" کچھ سوچ کر اس نے باوردی گارڈ کو مخاطب کیا۔

"وہ تو شہر سے باہر گیا ہے۔"

"کب آئے گا؟"

"معلوم نہیں۔"

"اچھا۔" اس نے ذرا سی ایڑی اونچی کر کے گیٹ کے پار دیکھا۔ ہمایوں کی گاڑی کھڑی تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

رخسانہ نگار عدنان
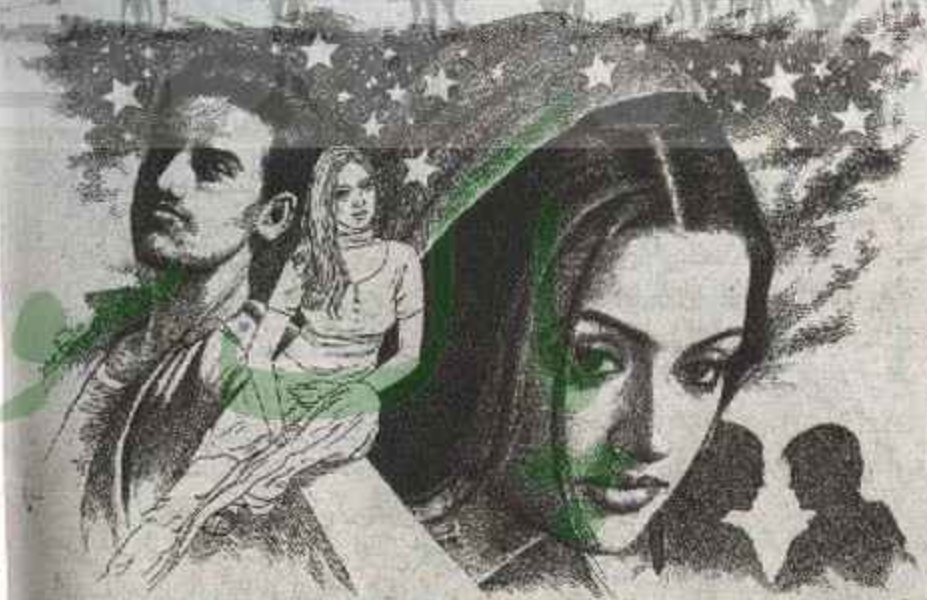
۶۰
ساٹھویں اور آخری قسط

"میں چاہتا ہوں، میں تمہارے لیے شہر کا بہترین وکیل ہائر کروں جو تمہارے کیس کی اس طرح پیروی کرے کہ تمہیں کم سے کم سزا ہو۔" بہت دیر خاموش رہنے کے بعد انہیں خیال آیا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔

"عجیب منصف شہر ہے جو چاہتا ہے مجرم کو کم سے کم سزا ہو۔۔۔ ایسا قاضی۔ جس کی ہمدردیاں جرم کرنے والے کے ساتھ ہیں اور مجرم بھی ایسا جو اقبالِ جرم بھی کر چکا ہو اور سزا کے لیے بھی تیار ہے پھر قاضی کی ایسی ہمدردی چہ معنی دارد؟"

وہ اسی تمکنت بھرے انداز میں ان کے چہرے پر نظریں جما کر بولیں نظریں بھی ایسی جو مدِ مقابل کو اندر سے

چت کروالیں۔

"اور اگر آپ اس طرح ہر مجرم کے ساتھ ایسی ہی ہمدردیاں دکھاتے ہیں پھر تو ہم سب کو اس شہر کی فسادی فضا سے سمجھوتا کر لینا چاہیے کہ یہاں ہر مجرم کا ہمدرد کوئی نہ کوئی قاضی ضرور ہے اور وہ محاورہ کیا ہے۔ اکیلی کلہاڑی تو جنگل سے ایک لکڑی بھی نہیں کاٹ سکتی جب تک جنگل کی لکڑی غداری کرکے کلہاڑی کا دستہ نہ بن جائے۔ میر جعفر، میر صادق صرف اپنی شرپسند طبیعت کی وجہ سے بدنام نہیں ہوئے بلکہ کچھ تو خیر خواہ ہوں گے ان کے جو اس شر پر ان کے کندھے تھپکتے تھے۔"

"اف اتنا لمبا اتنا کٹیلا جواب!" محمود عالم کو توقع نہیں تھی۔

وہ تو آئے تھے کہ یہاں ایک بالکل بدلی ہوئی ٹوٹی ہوئی یاقوت سے ملاقات ہوگی جو اتنے عرصے کے بعد یوں ان کی خالص ہمدردیوں کو ایسے کٹھن لمحوں میں پا کر کچھ تو پگھل سکے گی۔ معافی کا کوئی نہ کوئی در تو کھل ہی جائے گا۔ امید سی امید تھی اور اب ایک دم سے جیسے سب کچھ الٹ پلٹ سا گیا۔

وہ ابھی بھی اسی طمطراق اسی شان کے ساتھ گردن اٹھائے ان کے سامنے کھڑی تھیں۔

"آپ جانتے ہیں میں نے گرفتاری خود دی تھی۔ میرے پاس بھاگنے کے بچ نکلنے کے ایک نہیں ایک ہزار راستے تھے۔ آپ جیسے اس شہر میں میرے اتنے مہربان اتنے قدردان موجود ہیں کہ میرے ایک فون پر پورے ایئرپورٹ کو میرے لیے اتنا محفوظ بنا دیتے، جہاز کی پرواز تک کہ میں ان فضاؤں سے اتنی دور جا چکی ہوتی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔"

محمود عالم نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔

"مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں آج سے پہلے کس لیے بھاگتی رہی۔ اس بار مع ثبوت کے قانون کے ہتھے چڑھی اور کوئی میرا بال بیکا نہیں کر سکا۔ یہاں سے آپ جرم کی دنیا کی طاقت کا اندازہ کرلیں جب تک مجرم بھی خود سے willing (خواہاں) نہ ہو ہمارا نام نہاد قانون بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور مجھے ابھی کچھ جانا تھا تلاش کرنا تھا اپنے بچے کو اور تمہاری بے وفائی اور بزدلی کا انتقام لینا تھا سو میں ہر بار بچ نکلی۔ اس بار بھی نکل جانا کچھ دشوار نہیں تھا۔ مگر کس لیے اب کس کے لیے مجھے بھاگنا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ تنزل ہوگا۔ میرا بیٹا مجھے اتنے سالوں کی تلاش کے بعد ملے گا تو وہ مجھے یوں دھتکار دے گا شاید اگر وہ مجھے پہلے سے نہ جانتا تو یوں مجھ پر تھوک کر نہ چلا جاتا۔ میری قسمت کی خوبی دیکھیے جس کی تلاش تھی اسی کو دنیا بھر کی دولت دے چکی تھی۔

اور انتقام... میں نے لیا بھی تو آدھا ادھورا... اور مجھے آج لگ رہا ہے وہ محمود عالم! میں تم جیسی سخت دل نہ ہو سکی۔ چاہتی تو جس طرح تم نے میری اور میرے بچوں کی زندگی برباد کی۔ میں تمہیں بھی جیتے جی زندہ درگور کر دیتی مگر میں انتقام میں بھی کچی نکلی یا شاید اس محبت میں پکی جو کبھی مجھے تم جیسے بزدل سے رہی۔" کہتے ہوئے انہوں نے منہ پھیر لیا۔ "دیکھو میں انتقام بھی پورا نہیں لے سکی۔" وہ اسی طرح رخ پھیرے کھڑی تھیں۔

محمود عالم نے آہستگی سے ان کے کندھے کو چھوا۔ "مجھے معاف کردو نیلی! میں تمہارا مجرم ہوں ایک زندگی کا نہیں تین زندگیوں کا بلکہ نہیں چھ زندگیوں کا مجرم ہوں اور میں جانتا ہوں میں معافی کے قابل کبھی نہیں مگر پھر بھی... در توبہ کبھی بند نہیں ہوتا لیکن اس کے اوپر دستک دینے سے پہلے مجھے تم سے معافی مانگنا ہوگی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے تھے۔

وہ بے حس کھڑی رہیں۔

"نیلم...!" ان کی مسلسل خاموشی پر وہ کراہ کر بولے جیسے نزع کا عالم طاری ہو ان پر اور اگر ان کی پکار کا جواب

نہ آیا تو سانسیں سینے میں اٹکی رہیں گی۔

"کیا کرو گے معافی لے کر... اور کیا اس معافی سے کچھ بدلا جا سکتا ہے۔ سدھارا جا سکتا ہے۔ اب کچھ بھی نہیں۔ اب تم معافی مانگو نہ مانگو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں معاف کروں نہ کروں۔ ہمارا مقدمہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو چکا ہے۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اس کے فیصلے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری عدالت میں بھی تو ایسے بے شمار کیس آتے ہوں گے جو بغیر کسی فیصلے کے ہمیشہ کے لیے فائلوں کے مردہ خانے میں دفن ہو جاتے ہوں گے۔ تم سمجھ لینا یہ بھی ایک ایسا ہی کیس تھا۔"

وہ ذرا سے وقفے میں ایک بار پھر خود کو سنبھال چکی تھیں۔

"تو تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟"

"اگر اس معافی سے وہ نیلم واپس آسکتی ہے... وہ گھڑیاں... جب میں نے لاوارثوں کی طرح اپنے دونوں بچوں کو پیدا کیا اور ان میں سے ایک کو کھو دیا اور پھر میں جرائم اور گندگی کی دلدل میں شدید دھنستی چلی گئی۔ کوئی مہربان مخلص ہاتھ مجھے اس دلدل سے نکالنے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ میرا بیٹا میرے انتقام کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اگر یہ سب کچھ واپس آسکتا ہے تو میں نے تمہیں سچے دل سے معاف کیا۔"

اور محمود عالم آنکھوں میں بے بسی اور لاچاری لیے ہمیشہ کے لیے ناامید ہو گئے۔

وہ ان میں سے کوئی ایک گزشتہ لمحہ بھی تو واپس نہیں لا سکتے تھے اور وہ ٹھیک کہتی تھی اب معافی یا معاوضے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

"اور تمہارا کیس...!" بہت دیر بعد انہیں پھر سے خیال آیا تو بولے۔ یاقوت نے فوراً ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

"اگر مجھے اپنی صفائی کے لیے... اپنی برأت کے لیے لڑنا ہوگا تو میں خود لڑوں گی۔ مجھے کسی وکیل کی کسی قانونی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ انسان کا سب سے بڑا وکیل اس کا ضمیر ہوتا ہے وہی اس کا منصف بھی۔ یہاں ان سلاخوں کے پیچھے آنے سے پہلے میں اپنا کیس اپنی ضمیر کی عدالت میں پیش کرکے سزا بھی پا چکی ہوں۔ اب یہ سلاخیں اس تنگ کوٹھری کی گھٹن یا پھانسی کا پھندا میرے لیے کچھ بھی معنی نہیں رکھتے۔ مجھ وقت نے میرے لیے یہ سزا بھی کم ہے میں نے اپنے ارد گرد جہاں وہاں سب کے لیے یہ من کے شر سے اور تشدد سے تقسیم کرنا شروع کر دی اور محمود عالم اب تو ملاقات کا وقت بھی ختم ہو گیا ہے اور میں تیار ہوں میرے ساتھ کیا ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔"

وہ یوں ذہنی طور پر تیار تھیں جیسے آنے والے دنوں میں انہیں اپنی فیشن انڈسٹری کا کوئی پراجیکٹ لانچ کرنا ہے جس میں دشوار مرحلے ہیں اور ان کی چیلنجنگ طبیعت ان مرحلوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔

"اور تمہیں تو میری اس وقت فکر نہیں ہوئی جب تم مجھے واقعی بچا سکتے تھے۔ جب مجھے واقعی تمہاری ضرورت تھی۔ اب میں اس طرح کی احتیاج سے دور جا چکی ہوں۔ مجھے جینا ہوگا یا مرنا۔ مجھے اس کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی اس دنیا میں اسی طرح واپس چلے جاؤ۔ جیسے ان مشکل ترین لمحوں میں مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے اور میرے بارے میں کچھ نہ سوچنا بھول جانا۔ بالکل ویسے جیسے تم مجھے ان اندھیری راتوں اور تاریک لمحوں کی کال کوٹھری میں ڈال کر بھول گئے تھے۔ جاؤ محمود عالم! مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں۔" کہہ کر وہ دوسری طرف منہ کرکے کھڑی ہو گئیں جیسے اب کبھی ان کی طرف نہیں دیکھیں گی۔ اور محمود عالم بہت دیر تک اسی آس میں ساکت کھڑے رہے کہ شاید اب لمحہ بھر کو وہ پھر سے ان کی طرف دیکھیں شاید اس آخری دیکھنے والی نظر میں ان کے لیے کوئی درد کوئی پچھلی محبت کا نازک لمحہ کوئی پچھتاوا یا ان دھڑک سکے اور وہ ایک نظر التفات کی... الفت

یا پھر معافی کی ان پہ ڈال دیں مگر وہ بے مراد ہی رہے کہ ان کے لیے اب نیلم کے پاس ایک نظر بھی نہیں تھی۔

وہ وہاں سے یوں پلٹے جیسے ساری دنیا کی مسافت طے کر کے زندگی کے آخری کنارے پر آ بیٹھے ہوں۔ اب انہیں نہ آگے جانا ہے نہ پیچھے پلٹنا ہے، ہر طرح کا سفر تمام ہوا۔ محبت کا بھی، خواب کا بھی۔ آگے اب کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف حیات تمام کا قصہ اور سفر آخرت جس پر ہر کوئی جاتا ہے مرضی سے جائے یا زبردستی جانا ضرور ہے۔ اب انہیں بھی بس اس آخری بگل کا انتظار کرنا تھا جب ان کی زندگی کا بیڑا اس آخری سفر پر جانے کے لیے روانہ ہو جاتا جس کے بعد انہیں معلوم تھا حساب کتاب کے لیے نہ ختم ہونے والے کھاتے تھے جس کا اختتام کہیں بھی نہیں تھا۔ نیلم کے اعمال کی اس دنیا میں سزا کا اختتام تھا مگر ان کی سزا بے انجام تھی کبھی نہ ختم ہونے والی نہ اس دنیا میں نہ اس دنیا میں۔

☼ ☼ ☼

"کمال ہے تم نے اسے جانے کیوں دیا۔ اتنی بے خبر رہیں تم اس کے جانے سے؟" اسامہ جھنجلا کر عائشہ پر برس پڑا۔

"بھائی قسم لے لیں میں نہانے کے لیے گئی تھی اور اس کا کہیں جانے کا ارادہ تھا بھی نہیں ورنہ وہ مجھ سے ذکر ضرور کرتی۔"

"اس کا سیل فون بھی گھر پر ہے۔ یہیں چھوڑ گئی وہ۔ حتیٰ کہ اپنا پرس، ضروری سامان کچھ بھی تو ساتھ نہیں لے کر گئی۔" اسامہ متفکر لہجے میں بولا۔

"اسی بات کی تو مجھے پریشانی ہے۔ وہ خالی ہاتھ بنا بتائے کہاں جا سکتی ہے؟"

"آپ نے تنزیل سے رابطہ کیا؟" ذرا دیر بعد اسے خیال آیا۔

"وہ میرے ساتھ ہی تو تھا۔ ہم دونوں شہر بھر کی خاک چھان کر آ رہے ہیں۔ اور ہمیں تو اس کی کسی لڑکی دوست سہیلی کا بھی علم نہیں تھا جہاں وہ جا سکتی ہے جو دو چار سیٹ میں یاقوت کے ٹھکانے تھے۔ خاص طور پر ان کا گھر جو پولیس سیل کر چکی ہے۔ ملازمین بھی حراست میں ہیں تو وہاں تو وہ ہو ہی نہیں سکتی تھی اور ہم کہاں ڈھونڈتے اسے۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"جہانگیر مر چکا ہے۔ میڈم یاقوت جیل میں ہیں تو پھر اور کون ہے جو اسے لے جا سکتا ہے؟" عائشہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"جس طرح وہ یہاں سے غائب ہوئی ہے۔ کہیں بھی یہ آثار نہیں کہ اسے زبردستی لے جایا گیا ہے۔"

"تو آپ کے خیال میں وہ اپنی مرضی سے گئی ہے؟" عائشہ کچھ چونک کر بولی۔

"مجھے کیا پتا؟ وہ مجھے کون سا کچھ بتا کر گئی ہے۔" وہ چڑ کر بولا۔

"اچھا یوں کرو، تانیہ کا سیل فون لے کر آؤ، اس میں جو جو نمبرز فیڈ ہیں ان پر ٹرائی کرتے ہیں۔" اسامہ کو اچانک سے خیال آیا۔

اسی وقت ڈور بیل بجی۔

"میں دیکھتا ہوں جا کر تنزیل ہو گا۔ تم تانیہ کا سیل لے کر آؤ۔" اسامہ جاتے ہوئے اس سے بولا۔

اسامہ تنزیل کے ساتھ واپس آیا تو اس کے چہرے پر بھی تھکن اور مایوسی تھی۔

"کچھ خاص نمبر نہیں ہیں۔ گھر کے، یاقوت، جہانگیر اور یہ کسی کباب کا نمبر ہے اور شاید ادھر کا نہیں۔" عائشہ نمبر چیک کرتے ہوئے بولی۔

اسامہ نے اس سے سیل فون لے کر کباب کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف کباب نے ہی کال ریسیو کی۔

"مگر میں کسی تانیہ کو نہیں جانتا۔" اسامہ کے پوچھنے پر وہ لمحہ بھر سوچ کر بولا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ نمبر تانیہ کے سیل فون میں فیڈ ہے۔"

"تو اس بات کا اس سے کیا تعلق بنتا ہے کہ میں ان خاتون کو جانتا بھی ہوں، سوری۔" پھر اس نے فون آف کر دیا۔

تینوں گم صم بیٹھے تھے۔

"وہ بہت ڈپریس تھی۔ بہت زیادہ اپنے گھر والوں کے رویے سے اور یاقوت اور جہانگیر کی باقیات سے خوفزدہ... میں نے اسے بہت سمجھایا۔ تسلی دینے کی کوشش بھی کی مگر..." عائشہ افسردگی سے بولی۔

"تم نے ارد گرد ہمسائے میں کسی سے پوچھا؟ ہو سکتا ہے تانیہ کو کسی نے جاتے دیکھا ہو کسی کے ساتھ۔" اسامہ کو پھر سے خیال آیا۔

"بھائی! میں خود بہت کم ارد گرد والوں سے ملتی ہوں۔ میں کیسے پوچھتی۔" وہ شرمندہ سی نگاہیں جھکا کر بولی۔

"تم نے اپنے پیرنٹس کو بتایا؟"

"ابھی نہیں۔ مجھے امید تھی کہ وہ اب تک واپس آ چکی ہو گی اس لیے میں نے گھر میں کسی کو نہیں بتایا ورنہ امی بہت پریشان ہو جاتیں۔" تنزیل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر تو وہ اپنی مرضی سے گئی ہے پھر تو اس کا واپس آنا مشکل ہے۔" اسامہ آہستگی سے بولا۔ تنزیل نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ایسا کیوں کرے گی، وہ بہت خوفزدہ تھی اور واپس تو وہ بالکل بھی نہیں جانا چاہتی تھی، اسی لیے تو میں اسے ادھر لے کر آیا تھا کہ کچھ دنوں میں میں امی ابو کو رضامند کر لوں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" تنزیل ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جو اس دنیا میں رہ آتا ہے پھر اس کے لیے زندگی میں کچھ بھی ٹھیک نہیں رہتا۔ ٹھیک ہو بھی تو غلط ہوتا چلا جاتا ہے۔" عائشہ رندھے گلے سے بولی اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

"میں جاتا ہوں۔ اگر کوئی اطلاع ملے تانیہ کی تو پلیز مجھے ضرور بتانا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہوں، رات تک دیکھ لیتے ہیں۔ تم ابھی گھر میں نہ بتانا۔ شاید اس کا خود ہی سے کوئی فون آ جائے یا کچھ پتا چل جائے۔"

"ہو سکتا ہے اسے کسی نے کڈنیپ کر لیا ہو۔ ان لوگوں کے گروہ میں سے؟" اسامہ کو اچانک خیال آیا۔

"دونوں صورتوں میں اس کی واپسی ناممکن ہے۔" تنزیل مایوسی سے بولا۔

"کیا ہم پولیس کی ہیلپ لے سکتے ہیں؟" تنزیل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ جہانگیر ہمدانی کی ساتھی رہ چکی ہے۔ پولیس کے لیے اتنی خبر ہی ہم لوگوں کی زندگی دشوار کرنے کے لیے کافی ہو گی۔ اس لیے بہتر ہے پولیس کو تو اس واقعے کی بھنک بھی نہ ملے۔ پہلے ہی وہ یاقوت اور جہانگیر کے اڈوں اور ساتھیوں کو شہر بھر میں سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

"پھر تو اس نے ٹھیک ہی کیا۔" اسامہ زیر لب بڑبڑایا۔

"کیا مطلب؟" تنزیل چونکا۔

"جس خوف سے تم لوگوں نے اسے اپنے ہی گھر میں پناہ نہیں دی تھی خوف اسے یہاں سے بھی لے گیا۔"

"میں سمجھا نہیں؟" تنزیل الجھ کر بولا۔

"اب تم بے شک اپنے پیرنٹس کو بھی گھر جا کر بتا دو اس کی گمشدگی کے بارے میں۔ اور یہ بھی کہ وہ شاید اب کبھی بھی نہیں آئے گی۔"

"اسامہ! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ میں واقعی نہیں سمجھ پا رہا؟" تنزیل پریشان ہو کر بولا۔

"وہ تم لوگوں کی وجہ سے میرے خیال میں دوبارہ اس کھائی میں کود گئی ہے۔ جس میں سے قدرت نے اس پر اپنی مہربانی کرتے ہوئے اتفاقاً نکال دیا تھا۔ اگر تم لوگ اپنے دل وسیع کر لیتے۔ اس کے کردہ ناکردہ غلطی کو معاف کر دیتے تو شاید ہم آنے والی بہت بڑی جدائی کو ختم کر سکتے تھے۔ اب آگے کیا ہو گا اس کے ساتھ۔ میں بھی نہیں جانتا تم بھی نہیں جانتے مگر ابھی شہر بھر میں میڈم یاقوت کا قصہ جس طرح اخباروں میں شہ سرخیوں کے ساتھ لگایا جا رہا ہے اور اس کی پس پردہ کہانی آدھا شہر جان چکا ہے کیا تم پھر بھی تانیہ کے ساتھ آنے والے دنوں کا تصور نہیں کر سکتے؟" اسامہ ڈھکے چھپے الفاظ میں بہت کچھ کہہ گیا اور تنزیل اس کی بات سن کر دنگ سا رہ گیا۔

"میں نے کم از کم۔ میرا خدا گواہ ہے۔ میں نے ایسا نہیں چاہا تھا۔ میں اس کے لیے آخری حد تک لڑتا صرف گھر والوں سے نہیں ساری دنیا سے۔ وہ میرا بھروسا تو کرتی۔ اسے میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔" وہ ایکدم سے دل برداشتہ ہو کر صوفے پر گر گیا اور اسامہ کے پاس مزید کہنے کے لیے الفاظ ختم ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔" وہ پرامید لہجے میں بولا۔

"لاحاصل ہو گا۔" عزہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"کیوں؟" وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

"اس کیوں کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں۔" وہ دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

وہ کتنی راتیں خود سے لڑی تھی کہ وہ کیوں یہ سب کر رہی ہے۔ اس کی محبت ہاتھ بڑھائے اس کے سامنے کھڑی ہے تو وہ ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتی۔

"تو پھر تم میرے انتظار کو لاحاصل کہو مجھے پروا نہیں۔ مجھے تمہارا انتظار تو کرنا ہے۔" وہ بھی اٹل لہجے میں بولا۔

"پتا ہے دائم! امی میڈم یاقوت سے ملنے حوالات گئی تھی۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

"تم حوالات کیوں گئیں؟" وہ چونکا۔

"صرف یہ پوچھنے کہ انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ پتا ہے انہوں نے کیا کہا؟"

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"کہنے لگیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ تم خود میری طرف کھنچی چلی آئیں۔ شاید یہ اس محبت کی تشنگی تھی جو کبھی تمہارے دھوکے باز باپ نے مجھ سے کی تھی اور میرا کام آسان ہوتا چلا گیا۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا۔" وہ مجھ

بھرو گی۔

"نہیں۔ سمجھتی تھی میں ایکسٹرا اورڈنری ذہین ہوں۔ اتنی سمجھ دار کہ مدمقابل کی آنکھوں سے اس کی نیت با آسانی پڑھ سکتی ہوں اور میڈم یاقوت نے مجھ پر یہ عقدہ وا کیا کہ مجھ سے بڑا ایکسٹرا اورڈنری بے وقوف اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ تم نے سمجھایا خود مجھے نظر آ رہا تھا کہ ہر روشنیوں کے جلو میں چلتا یہ سیدھا سادہ کشش بھرا رستہ گہری کھائی میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ میں اس عورت کی کشش میں اندھا دھند سوچے سمجھے بغیر دوڑتی چلی گئی۔ شاید یہ قسمت کی مہربانی تھی یا کچھ میرا دامن اجلا رہا کہ کہیں کوئی داغ دھبہ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید میں تمہارے کیا کسی کے بھی سامنے کھڑی نہ ہو پاتی۔ خود کو ختم کر چکی ہوتی مگر سیاہ رات کے اندیشے۔ وہ سیاہ رات جو میڈم یاقوت کے گھناؤنے عزائم مجھ پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ اس کا خوف۔ کتنا جان لیوا ہے۔" اس نے ایکدم سے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں اس کا تصور کرتی ہوں تو لرز جاتی ہوں۔ اس لیے میں نے سوچ لیا ہے مجھے ابھی نہ تو شادی کرنا ہے نہ اس کے بارے میں سوچنا ہے۔ کتنے سال تک۔ یہ بھی میں نہیں بتا سکتی۔ معلوم نہیں میں اس خوف کے دور ہونے اور خود پر اعتماد بحال ہونے میں مجھے کتنے برس لگ جائیں۔ میں تم سے یہی کہوں گی۔ میرا انتظار نہیں کرنا۔" وہ ایکدم سے بڑی بردبار اور سنجیدہ سی لگنے لگی تھی۔

"تم اپنے بارے میں خود فیصلے کرو اور مجھے اپنے بارے میں کرنے دو۔ اگر تم نے مجھے خود سے الگ سمجھ ہی لیا ہے تو ہمیں اپنے اپنے فیصلے خود ہی کرنے چاہئیں۔" وہ چڑے ہوئے انداز میں بولا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتی جیسے تم مجھے نہیں کر سکتے۔" وہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

پھر دونوں یوں چپ ہو گئے جیسے ان کے درمیان ہونے والی تمام باتیں ہو چکی ہوں۔

خزاں کی ہوائیں ادھر ادھر سے پتے اڑاتی پھر رہی تھیں۔

چاروں اور ٹنڈ منڈ پیڑ پھولوں سے خالی ننگی شاخیں عجیب اداسیاں پھیلا رہی تھیں۔ موسم کا وہ خلا پن جیسے سارا بے رنگ ہوئے تھا نہ چھاؤں نہ دھوپ نہ سردی نہ گرمی نہ ہوا نہ حبس بس اداسی ہی اداسی تو وحشت سی ہے تو دلوں کو کھینچ رہی تھی کہ یہاں سے بھاگ چلو مگر کہاں؟

دونوں نے بے بسی سے سر اٹھا کر اس دوغلے موسم سے پوچھا ایک موسم کی حد پر دوسرا موسم کھڑا ہے دن کی حد پر رات ڈھیر ہوئی ہے حد پر شام محبت کی حد پر نفرت۔ مگر ہجر کی حد پر کیا تھا؟ ہجر بھی وہ جو طے شدہ ہو۔ اس کی حدود کا علم تھا دونوں کو نہ۔ اپنی اپنی ضد پر قائم رہنے کا انجام۔

"فون تو کر سکتا ہوں نا تمہیں۔ رابطہ تو رکھو گی نا؟" بہت دیر بعد دائم کو خیال آیا تو پوچھ بیٹھا وہ خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔ ان نظروں میں نہ ہاں تھی نہ نا!

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ جس طرح پہلے مجھے تمہاری کشش نے لندن سے پاکستان لا پھینکا اسی طرح پھر میں پاکستان سے لندن چلا جاؤں۔ فاصلے سمٹ جائیں تو دوریوں کے امکان بھی سمٹ جاتے ہیں۔" وہ بچوں کی خوشی سے بولا۔

"چلو یہ بھی کر کے دیکھ لینا۔ ابھی تو میرے لیے دوری اور قربت ایک جیسے ہیں۔" وہ یونہی مسکرائی۔

"ایسا ہے تو پھر یہیں رہ کر دکھاؤ نا، پھر میں مانوں تاکہ تمہارے نزدیک قربت اور دوری ایک جیسی ہے۔ کیوں تم مجھ سے بھاگ رہی ہو عزہ!" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"سچ کہا تم نے مگر [illegible] میں بھاگ رہی ہوں تم سے نہیں خود سے۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"دائم! مجھے خود سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ میں اتنی بودی اتنی کمزور نکلوں گی مجھے یقین نہیں آتا۔ اپنی اس کمزوری کی میں خود کو سزا دینا چاہتی ہوں۔ سخت بڑی سزا۔ محبت سے دوری کی سزا اور یہ آسان نہیں۔ تمہارے بارے میں میں نہیں جانتی مگر میں، میں نے تم سے واقعی۔" اس کے الفاظ جیسے ختم ہو گئے اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔

"تو مت رو نا سزا۔ مجھے تو تم پر بھروسا ہے کہ تم پہلے کی طرح مضبوط بہادر اور باکردار ہو۔" دائم افسردگی سے بولا۔

"یہ ممکن نہیں۔" وہ جھرجھری سی لے کر سیدھی ہو گئی۔ چہرہ صاف کر کے پہلے جیسی ضدی سی عزہ بن گئی۔

"میرے لیے یہ ضروری ہے ورنہ۔۔۔ دائم! میں فوری طور پہ ہاں بھی کر دوں تو ایک جھجکی جھجکی۔۔۔ خائف شرمندہ سی عزہ شاید تمہیں بھی قبول نہ ہو۔ تم چند دنوں میں ہی مجھ سے بے زار ہو جاؤ۔ پلیز مجھے خود سے خود کو سمیٹ لینے دو۔ تم اس عمل سے نہیں گزرے اور میں دعا کروں گی تمہارے ساتھ ایسا کبھی نہ ہو مگر یہ بہت مشکل عمل ہے۔"

"تو کیوں مشکل میں پڑتی ہو۔ یہیں رہ جاؤ۔ سال دو سال تو میں ویسے بھی انتظار کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد جو تم کہو۔" وہ پھر نرمی سے بولا۔

"میں نے کہا نا ابھی مجھے ہر شے سے دور ہو جانے دو۔ میں اسٹڈیز کرنا چاہتی ہوں۔ خود کو بھول جانا چاہتی ہوں۔ اگر تم سے جڑی رہی تو پھر خود کو کبھی نہیں بھول پاؤں گی اور جو کچھ میں نے اپنے ساتھ کیا ہے دائم! وہ میری ہی نظر میں ناقابل معافی ہے۔ اتنی سزا میرا حق ہے۔ سزا کے بغیر زندگی مستحکم نہیں ہوتی میرے ذہن میں یہ یقین پکا ہے۔" اس نے مسکرا کر بات ختم کر دی۔

اور دائم نے بھی محسوس کیا اب محبت لاحاصل ہو گی۔ پھر ابھی مصطفیٰ صاحب کب راضی تھے۔ انہیں بھی منانے میں شاید بہت وقت لگتا۔ یہ دوری بھی "بہتری" کے لیے تھی۔ اس کے دل کو یقین تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر عزہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ہلکا سا مسکرائی۔ وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھی اور اس کی خوشی میں دائم کی خوشی تھی۔ دونوں اٹھ کر روش پر ٹہلنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"نہیں اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ جہاں بھی گئی ہے۔ شاید اپنی مرضی سے۔" تنزیل تھکے ہارے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ یاسمین کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ بے اختیار رونے لگیں۔

"امی! اب رونے کا کیا فائدہ؟ وہ گئی تو تھی۔ بہت آس بہت امید لے کر۔ مگر اس کی آس بڑی تھی اور ہمارے دل چھوٹے۔ امی! ہم معاف کرنا نہیں جانتے۔ ہم ایسے اذیت پسند لوگ ہیں جو خود ہی اپنے زخموں کو کھرچتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں اور پھر ان ہی زخموں کی اذیت کو سہتے خود کو مظلوم کہلواتے ہیں۔ کتنے منافق ہیں ہم لوگ۔" اسے خود پہ بھی بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ اسے نامیہ کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کے لیے جلد سے جلد کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ یوں اسے دوسروں کے گھر میں ڈال کر کیا اس کا فرض ادا ہو گیا تھا؟

"اسے ایک بار ہی کہہ دیا ہو تو آنا چاہیے تھا؟ میں نے بات کی تھی احسن سے۔ وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے جس کا مطلب نیم رضامندی تھا مگر۔۔۔ تم اسے فون کرو۔ کہیں تو اس سے رابطہ ہو سکے۔" وہ روتے ہوئے بولیں۔

"آپ کے خیال میں میں نے ایسا نہیں کیا ہو گا؟" وہ گہرا سانس لے کر مایوسی سے بولا۔

"وہ اپنا فون بھی وہیں چھوڑ گئی تو رابطہ کہاں کرتا۔"

یاسمین کی سسکیاں کمرے کی خاموشی میں گونجنے لگیں۔

اسی وقت کمرے کے باہر آہٹ سی ہوئی۔

اور ربیحہ کے ساتھ اندر آتے محمود عالم کو دیکھ کر دونوں چونک سے گئے۔

ربیحہ انہیں دروازے تک ہی چھوڑ کر واپس مڑ گئی۔

"آئیں آجائیں محمود بھائی!" یاسمین چہرہ صاف کرتے قدرے بوکھلا کر بولیں اور کھڑی ہو گئیں۔ تنزیل کے اعصاب تن سے گئے۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔" چند لمحوں کی معنی خیز خاموشی سے گھبرا کر یاسمین کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئیں۔

محمود کھڑے کھڑے شاید تھک سے گئے اس لیے خود ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔

"کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟" وہ تنفر بھرے لہجے میں بولا۔ یہ وہی شخص تھا جو کسی بھی حوالے سے پہلے، کسی بھی نسبت سے آگاہ ہونے سے بھی پہلے اکثر نفرت اور عناد بھری نظروں سے اسے دیکھا کرتا تھا اور آج یوں ہارے ہوئے انسان کی طرح بیٹھا تھا۔ اور تنزیل کو اس پہ ذرا بھی ترس نہیں آ رہا تھا۔ اس کی موجودگی اسے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔

"مجھے خود نہیں پتا میں یہاں کیوں آیا ہوں۔" وہ نڈھال سے انداز میں بولے۔

تنزیل اسی طرح منہ موڑے بیٹھا رہا۔

"کیا تم بھی مجھے معاف نہیں کرو گے؟" وہ عجیب ٹوٹے ہوئے التجائیہ لہجے میں بولے۔

محمود عالم اور اس طرح تنزیل جیسے انسان سے برملا معافی مانگے۔ تنزیل کو ان کی ذہنی حالت کچھ ابتر سی لگی۔ ایک کے بعد ایک انکشاف۔ وہ صحیح الدماغ بھی نہیں لگتے تھے۔

اسے پھر کسی بات پہ ترس سا آ گیا۔

"آپ سے کیا ہو گا؟" وہ چاہتے ہوئے بھی بہت سخت لہجہ نہ اختیار کر سکا۔

"کیا نہیں کیا ہو گا؟" وہ خود سوالوں اور جوابوں کے بھنور میں الجھ رہے تھے۔ اسی سوالیہ انداز میں بولے۔

"شاید مجھے یہ خیال ہے کہ کوئی تو ہے کوئی ایک جس کے کندھے پہ میں سر رکھ کر رو سکوں۔ تنزیل! مجھے لگتا ہے میرے اندر آنسوؤں کا سمندر اکٹھا ہو گیا ہے مگر میری آنکھیں خشک ہیں میں رونا چاہتا ہوں دھاڑیں مار مار کر کسی کے گلے لگ کر۔ جب کوئی مرتا ہے تو کسی اپنے کے گلے لگ کر اس کے پرسے کے لیے لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں تو پھر اس کے دل کا سارا غبار نکل جاتا ہے۔ وہ پاگل ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ میں بھی اپنی موت کا پرسہ کسی کے گلے لگ کر رونا چاہتا ہوں۔ اس اکڑفوں محمود عالم کی موت پہ۔ جس نے یہ سارا گند مچایا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بے خود سے لہجے میں بولتے چلے گئے جیسے انہیں خود بھی پتا نہ ہو کہ وہ کیا بول رہے ہیں۔

"کیا آپ کو اس محمود عالم کے مرنے پر افسوس ہے؟" وہ سحر زدہ سا ان کے قریب دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

اور دونوں نے پہلی بار ایک دوسرے کو اتنے قریب سے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور پتا نہیں کیا ہوا۔ محمود عالم کے سمندروں کے بند ٹوٹ گئے اور اس الوہی لمحے میں تنزیل بھی بھول گیا کہ اسے اس شخص سے کتنی نفرت ہے۔ وہ کبھی اس کے پاس بیٹھنا تو کیا اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہے گا مگر وہ بالکل بھول گیا۔

محمود عالم زور زور سے اس کے گلے سے لگے رو رہے تھے اور اس نے بڑی فراخدلی سے اپنا کندھا ان کے سامنے پیش کر دیا تھا اور وہ روئے چلے جا رہے تھے۔

"میں نے سب کچھ برباد کر دیا اپنے ہاتھوں سے اپنی بزدلی سے اپنی کمینگی سے اپنے گھٹیاپن سے میں اعلا

خاندان کا ہو کر بھی کم ظرف نکلا اور ایسے کمینے انسان کو کوئی بھی معاف نہیں کرتا، کرنا بھی نہیں چاہیے۔ تم بھی مجھے معاف نہ کرو۔ میری وجہ سے وہ ظلم سے یاقوت بن گئی۔ اور ہزاروں زندگیاں تباہ ہو گئیں۔ اگر میں ایک ظلم کو بچا لیتا۔ تنزیل ابھا تو میں اتنا بزدل "اتنا کمینہ کیوں نکلا؟" وہ یوں اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے اس سے بچوں کی طرح پوچھ رہے تھے جیسے ہر ایسے مشکل موقع پر اس سے مشورہ لیا کرتے ہیں۔

اور اس لمحے تنزیل پر کھلا کہ وہ جو اپنی زندگی میں اتنا نان پریکٹیکل تھا اس کی وجہ محمود عالم کے لمس کی تاثیر تھی۔

اگر وہ احسن مراد کا بیٹا ہوتا تو یقیناً "ان کی طرح پریکٹیکل زندگی میں اتنا ناکام نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اصل باپ کی طرح بزدل تھا صرف ڈینگیں مارنے اور اونچے اونچے منصوبے بنانے، خواب دیکھنے والا۔ کچھ کر گزرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

"تمہارا بہت شکریہ، تم نے مجھے اپنا کندھا دیا، رونے کے لیے اور تم نے مجھے زیر بار کر لیا۔ میں تو تمہیں باپ ہونے کی حیثیت سے کچھ نہیں دے سکا مگر تم نے مجھے ان لمحوں میں اپنے جسم کی دیوار سہارے کو دی۔ بہت شکریہ۔ مجھے اب تم سے کچھ نہیں چاہیے۔" وہ ایک دم سے جیسے پہلے والے محمود عالم بن گئے۔ اور چہرہ صاف کر کے کھڑے ہو گئے۔

"لیکن ایک بات ہے میرا اب کچھ تمہارا اور لائبہ کا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں میں ایک ناکام انسان ہی نہیں ایک ناکام باپ بھی ہوں۔ ایک بچی کی سرپرستی تھی نا میرے ذمے، وہ بھی ڈھنگ سے نہیں نبھا سکا۔ تو تم دونوں کا سرپرست بن کر بھی میں کوئی فرض ادا نہیں کر سکوں گا۔ تم وہ کرنا جس میں تمہاری خوشی ہو۔ اگر میں تمہیں ساتھ چلنے کو کہوں گا تو پھر نادانستگی میں میں تمہیں اس خود غرضی کا سبق دوں گا جس کا مظاہرہ میں نے ساری زندگی کیا۔ خود غرضی اور احسان فراموشی۔ میری خواہش ہے کہ کوئی تمہیں کل کو یہ طعنہ نہ دے سکے کہ نکلے نا پھر محمود عالم جیسے خود غرض انسان کے بیٹے۔ جب میں تمہیں کچھ نہ دے سکا تو مانگنے کا بھی حق نہیں رکھتا۔ اپنا خیال رکھنا۔ اگر کبھی ہیلپ لیکن نہیں۔" وہ خود ہی رک گئے۔

"چلتا ہوں میں۔" وہ کہہ کر بھی وہیں کھڑے رہے۔

"ایک خوشی تو بہرحال تقدیر انجانے میں کسی مجھے دے رہی تھی۔ تم میرے پاس رہو یا نہیں مجھے پتا نہیں مگر مجھے یہ تسلی ضرور رہے گی کہ محمود عالم جیسے لالچی خود غرض انسان کا مرنے کے بعد بھی کسی کے نام کے ساتھ نام جڑا ہو گا اور وہ میرا بیٹا ہے جس کی میں نے انجانے میں ہی ان گنت دعائیں کر ڈالی تھیں بس اب یہی دعا ہے کہ میرا سایہ تم پر نہ پڑے۔ خدا حافظ۔"

وہ اس کے کندھے پر اپنا کانپتا ہاتھ رکھ کر آہستگی سے اس کے پاس سے گزر کر باہر چلے گئے۔
اور وہ کچھ بھی نہیں بول سکا بس کسی بت کی طرح کھڑا رہا۔

☆ ☆ ☆

"تم اپنے باپ کے پاس چلی جانا۔" یاقوت نے آنسو بھری نظروں سے لائبہ کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر کہا۔
"کون سا باپ؟" وہ تڑخ کر بولی۔
"جیسا بھی سہی۔" یاقوت نے کہنا چاہا۔
"پلیز ماما جیسا ویسا کیسا، آئی ایم ناٹ انٹرسٹڈ۔ ایک ایسا انسان جسے میں جانتی تک نہیں۔ آدھی زندگی اس کا نام جانے بغیر گزار دی۔ اور باقی کی آدھی زندگی اس کے ساتھ گزاروں، امپاسبل۔" وہ تندی سے بولی۔
"یو نو میں اب کوئی سات آٹھ سال کی بے سہارا بے آسرا بچی نہیں جسے کسی ایسے راستہ دکھانے والے کی

انگلی پکڑ کر ساتھ چلنے والے کی ضرورت ہو اور ماما! میری تو جب یہ ایج تھی۔ آپ نے اس وقت مجھے کبھی انگلی نہیں پکڑنے دی تو اب کیسا خوف ہے آپ کو یہی کہ میں کہیں گم نہ ہو جاؤں۔ ہو بھی گئی تو کیا۔ آپ کو تو اب کسی بھی بات کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔" لائبہ کا غصہ، اس کی نفرت اس کے ہر ہر لفظ سے چھلک رہی تھی۔

"میں تمہاری مجرم ہوں۔" وہ سر جھکا کر بولیں۔

"تو ماما! صرف میری نہیں ان سیکڑوں لڑکیوں کی جن کی زندگیوں کو آپ نے بیوپار بنایا، اندھے غار میں دھکیل دیا انہیں، ان سے معافی کون مانگے گا؟

آپ نہ قابل معافی ہیں نہ قابل رحم۔" نفرت بھری نظریں جن کا یاقوت نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"ظلم آپ کے ساتھ ہوا تو ظلم آپ نے بھی کم نہیں ڈھایا۔ اب آپ کو کیوں فکر ستانے لگی کہ آپ کی بیٹی اکیلی اس معاشرے میں کس طرح رہے گی؟ بالکل اسی طرح ماما! جس طرح آپ جیسی بلائیں اکیلی پھرنے والی کسی بھی لڑکی کی چھایا بن کر اس سے چمٹ جاتی ہیں اور اس کے بدن سے لہو کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتی ہیں [illegible] کہ مجھے بھی ایسی ہی کوئی بلا..."

"لائبہ! بس۔" اس سے زیادہ ان کی برداشت نہیں تھی۔

"کیوں؟ دل دہل گیا نا آپ کا ماما! کبھی آپ نے ان معصوم زندگیوں کے بارے میں بھی ایسے لمحہ بھر کو سوچا تھا جو آپ کی وجہ سے برباد ہو گئیں...!"

"اس کا کفارہ تو دے چکی۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولیں۔

"یہ کفارہ نہیں ماما! یہ کفارہ ہو بھی نہیں سکتا۔ اتنی زندگیوں کا کفارہ صرف آپ کی ایک زندگی۔ اس میں مجھے بھی حصہ ڈالنا ہو گا۔ آپ کی بیٹی جو ہوئی میں۔ والدین کا ورثہ تو اولاد ہی سنبھالتی ہے نا، خواہ وہ گناہ ہو یا ثواب I have to contribute۔" اور یاقوت بے بس نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ یہ ان کی فصل تھی جو انہیں کاٹنی ہی تھی۔

"میں جا رہی ہوں ماما! اور اب کبھی آپ سے ملنے نہیں آؤں گی۔ آپ نے سمجھا ایک جا تحج ہمدانی کو قتل کر دیں گی تو آپ کی بیٹی محفوظ ہو جائے گی؟ نہیں ماما! اس معاشرے میں آپ جیسے اور آپ کے جیسے شیطان صفت [illegible] پھرتے ہیں آپ کس کس کو ختم کریں گی؟ نہیں کر سکتیں نا، بھول جائیے آپ کی کوئی بیٹی بھی تھی۔ [illegible] یاقوت کے جیتے جی مر گئی اور آپ کا کچھ نہ کچھ کفارہ ادا ہو جائے گا۔ [illegible]"

اس نے ایک نظر ڈالی اور نکل گئی۔ "بیٹا!" یاقوت بلکتی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

ایئرپورٹ پر محمود عالم اور سارہ عزہ کو سی آف کرنے آئے تھے۔ وائم پہلے سے وہاں موجود تھا۔
"میرا مشورہ ابھی بھی تمہیں یہی ہے وائم! کہ تم..."
"میں نے تم سے کوئی مشورہ نہیں مانگا۔ نہ مجھے ضرورت ہے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ ہم دونوں وہ کریں گے جو ہمارا دل کہے گا۔ کم از کم اپنے دل کی بابت میں اپنے دل کی مانوں گا اور بس۔" اس نے عزہ کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔
وہ افسردگی سے مسکرا کر رہ گئی۔
"شاید پھر یہ میری قسمت کا کوئی اچھا گوشہ ہے جس میں میرے لیے اتنی خالص محبت محفوظ ہے۔ ورنہ یہ ماں باپ کی دعائیں تو ہو نہیں سکتیں کہ میرے ماں باپ کو اپنی ذات کی دیواروں کے باہر جھانکنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔"

"تم ابھی بھی ان سے ناراض ہو؟"
"اب تو یہ قصہ ہی ختم سمجھو پھر کیسی ناراضگی۔" اناؤنسمنٹ سنتے ہوئے اس نے اپنا مختصر سامان اٹھایا، باری باری نارمل انداز میں محمود عالم اور سارہ کے گلے لگی۔ اور دائم کی طرف ہاتھ ہلاتی مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔
"عزہ! تم آجاؤ گی نا۔ دیکھو دیر نہیں کرنا۔ پتا نہیں میں اتنے دن تمہارا انتظار کر سکوں یا نہیں۔" آخری لمحے میں جانے سارہ کو کیا ہوا ایک دم سے دوڑتی ہوئی گئیں اور اس سے لپٹ کر رو لیں اور عزہ کے مضبوط قدم ڈول گئے۔
"مما! میں آپ کے پاس ہی ہوں، جب آواز دیں گی میں آجاؤں گی۔" وہ بھی بے اختیار ان سے لپٹ گئی اور دائم کے دل کو یقین ہو گیا۔ وہ اب زیادہ عرصہ خود کو ان محبتوں سے دور نہیں رکھ سکے گی۔ وہ ایک دم سے ہلکا پھلکا ہو کر دور جاتی عزہ کو دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو تو اس بڈھے آغا کو کیا ہوا اس عمر میں۔ سٹھیا گیا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جانے کدھر کو نکل گیا، نہ آتا نہ پتا، مر گیا تو کون کفن دفن کرے گا۔"
ثریا بانو وقفے وقفے سے ایک ہی طرح کے جملے تھوڑے سے فرق سے بولے جا رہی تھیں۔
"تنزیل کو بھیجا ہے میں نے اماں جان! شاید کچھ پتا چل جائے۔" یاسمین تسلی دینے کو بولیں۔
اور رات گئے تنزیل نامراد واپس لوٹ آیا۔
"پورے شہر میں تلاش کروا لیا، مگر وہ کہیں نہیں ہیں۔" پھر گھر میں ایک جامد خاموشی چھا گئی، تابیہ کی گمشدگی کے بعد کی یہ دوسری بڑی خبر تھی۔
احسن مراد کے کمرے میں تو اب یوں بھی اب خاموشی ہی رہتی تھی۔ نہ چیخ دھاڑ نہ گالم گلوچ، کچھ بھی نہیں تھا۔
"امی! مجھے جاب مل گئی۔" اس جامد سناٹے کو تنزیل کی مدھم آواز نے توڑا۔
"سچ... او خدا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، میرے مولا کوئی تو اچھی خبر ملی۔" یاسمین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نوکری کا مطلب تنزیل کا مستقل یہیں رہنا، یاسمین کے لیے تو یہی سب سے بڑی خوشخبری تھی۔
"لیکن مجھے کمپنی کی طرف سے تین سال کے لیے ملائیشیا جانا ہوگا۔" اس خبر کا بقیہ حصہ یاسمین کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔
وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔
"اور یقین کیجیے میں نے خود سے ایسی نوکری کی تلاش نہیں کی تھی، مگر۔ اگر آپ کہتی ہیں تو میں انکار کر دیتا ہوں۔" وہ یاسمین کے تاثرات دیکھ کر اگلے ہی لمحے بولا۔
"نہیں بیٹا! اتنے عرصے کے بعد تو خدا نے یہ کرم کیا ہے تو کیا ٹھوکر مار دو گے۔ ہرگز نہیں، تم بے فکر ہو کر جاؤ نوکری پر۔"
وہ ایک دم سے مان گئیں اور تنزیل حیران سا دیکھتا رہ گیا، ورنہ اسے یاسمین سے اچھے خاصے معرکے کی امید تھی کہ وہ کبھی نہیں مانیں گی۔
شاید اس لیے انہیں یہی بہتر لگا کہ فی الحال تنزیل یہاں سے چلا جائے۔ ورنہ محمود عالم کی کوشش اسے کسی بھی

لیے کھینچ سکتی تھی۔
"لیکن جانے سے پہلے ایک خوشی تم میری بھی پوری کرو گے۔" ذرا دیر بعد وہ بولیں۔
"جو آپ کہیں۔" وہ فوراً سے بولا۔
"تمہیں شادی کر کے عائشہ کو اپنے ساتھ لے جانا ہوگا۔"
اور تنزیل کو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا، وہ بے یقینی سے دیکھتا ہوا نفی میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔
"تو تم میری بات نہیں مانو گے؟" وہ خفگی سے بولیں۔
"میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا امی! کہ آپ عائشہ کے لیے۔ اتنی آسانی سے مان جائیں گی۔" وہ یاسمین کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولا۔
"خود غرضی کہو اسے بھی میری۔ شاید اسی طرح خدا کو مجھ پر، میری تابیہ پر رحم آجائے۔ وہ گھر آجائے اگر میں عائشہ کو سینے سے لگا لوں تو۔" وہ کہتے ہوئے ایک دم سے رو پڑیں۔

☆ ☆ ☆

"آج کتنے عرصے بعد ہم تینوں پھر سے اس طرح اکٹھے ہوئے ہیں، کچھ یاد ہے دائم! لندن میں ہماری یہ تکون کبھی بھی اکیلے شام نہیں مناتی تھی، ہمیشہ ساتھ مل کر۔" اسامہ، دائم اور لائبہ کی طرف دیکھ کر بولا۔
"ہوں، یاد ہے۔ اور بیچ میں اتنا کچھ بدل گیا کہ پھر یاد کرنے کی فرصت بھی نہیں مل سکی۔" دائم ٹانگیں پھیلا کر بولا۔
"تم نے آگے کیا سوچا ہے؟" دائم نے اسامہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ لائبہ بالکل خاموش بیٹھی تھی، وہ آج کل ڈاکٹر رخشندہ کے ساتھ رہ رہی تھی، اگرچہ محمود عالم اسے دوبارہ لینے آئے تھے مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔
"میں لندن واپس جا رہا ہوں۔" اسامہ توقف سے بولا۔ "مجھے وہاں بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔"
"مگر یہاں میں نے جو تمہیں آفر کی تھی؟"
"شکریہ یار! ادھر ابھی بھی میں مطمئن نہیں ہوں، آغا جان کی اچانک گمشدگی، والد کی وفات اور بہت کچھ... میں یہاں سے فی الحال دور چلے جانا چاہتا ہوں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
"اور لائبہ تم؟" دائم نے اسے بھی شامل گفتگو کرنا چاہا۔
"میں کیا؟" وہ غائب دماغی سے بولی۔
"کیا پروگرام ہے آگے تمہارا؟"
"وہ دن تو گئے جب زندگی ہمارے پروگرام کے مطابق چلا کرتی تھی، اب وہی کچھ چلے گا جو زندگی چاہے گی۔ میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے۔" وہ بے نیازانہ لہجے میں بولی۔
اسی وقت دائم کا سیل فون بجنے لگا۔
"ایکسکیوز می۔" کہہ کر وہ فون سننے ایک طرف چلا گیا۔
"تم میرے ساتھ چلو گی لندن؟ تمہارا ڈریس ڈیزائنر بننے کا شوق اور..."
"اور کیا؟" لائبہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
"اور... میرا ساتھ..." وہ لمحہ بھر کو جھجکا پھر مسکرا کر بولا۔ اور لائبہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
"ابھی بھی اسامہ! تم مجھے..." بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"ابھی بھی کیا؟" وہ سمجھا نہیں۔

"میری حقیقت جاننے کے بعد۔ میری ماں کی اصلیت۔"

"میں تو تمہاری اصلیت کو جانتا ہوں۔ تم کیا ہو؟ تمہارا اصل، تمہاری فطرت، تمہارا ماضی میرے سامنے ہے اور حال بھی۔ مستقبل میں ایک ساتھ رہنے کا میرا تو پکا ارادہ ہے۔ تم جانے ابھی بھی مجھے قبول کرتی ہو یا ڈائم کی خالی وہ کنسی ایویل (حاصل) کرنے کی کوشش۔۔۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزاً کہہ گیا۔

"طنز کر رہے ہو نا مجھ پر؟ اور ڈائم کی وہ کنسی کبھی میرے لیے خالی نہیں ہو سکتی۔" وہ آنسو صاف کر کے بولی۔

"پھر تم بتاؤ؟"

"لوگ میرے خیال میں تمہارا آئیڈیا برا نہیں۔ سوچا جا سکتا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"صرف آئیڈیے پر یا پرپوزل پر بھی۔" وہ آگے کو جھک کر بولا۔

"اچھا کیا اب یہیں سب کچھ کہہ دوں۔ یوں بھی مجھے کچھ ٹائم چاہیے؟"

"اور ٹائم نہیں مل سکتا تمہیں، پہلے تم بہت ٹائم لے چکی ہو۔ یہ نہ ہو اس ٹائم لینے کے چکر میں ہم دونوں کی ڈیٹ ایکسپائر ہو جائے۔" دونوں ہنس پڑے اور فون پر بات کرتا ڈائم دونوں کو ہنستے دیکھ کر چونکا اور خود بھی مسکرانے لگا۔

✡ ✡ ✡

"یہ آپ کی بہو میڈم یاقوت۔ عائشہ تنزیل۔ میں نے سوچا ہم یہاں سے جا تو رہے ہیں۔ آپ سے آخری ملاقات بھی کرتے جائیں۔"

یاقوت سیاہ لباس میں ایک جھلسا ہوا، مرجھایا ہوا پھول لگ رہی تھیں، جس کا رنگ، خوشبو سب پھیکی پڑ چکی ہو۔ آنکھوں کے گرد پڑے سیاہ حلقے اور چہرے کی چھائیاں، سیاہ پڑتے ہونٹ اور آنکھوں کی ویرانی۔ ان کے اندر کا احوال کہہ رہی تھیں۔ [illegible] نظروں سے عائشہ کو دیکھنے لگیں۔

"آپ کے بیٹے ایک مسلسل خوشی کا سامان وہ لگی ہے آپ نے اپنے بیٹوں میں سدا اور دوسروں کے ہاتھوں نے [illegible] آپ کے گھر کی عزت [illegible] مگر نہیں آپ کو شاید اس لفظ کا مطلب بھی نہیں آتا تو پھر یہ آپ کے نزدیک کیا ویلیو رکھتا ہو گا۔ میں نے ٹھیک کہا نا!" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم جا رہے ہو؟" وہ بے یقینی سے لہجے میں روئیں۔ "پھر نہیں آؤ گے؟"

اور تنزیل کی زبان لمحہ بھر کو گنگ ہو گئی۔

ایسی بے چارگی ایسی بے بسی اس نے کب دیکھی تھی اس عورت میں۔

وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"آدمی عمر بھر رشتوں کی کھوج میں بھٹکتا ہے۔ اس کے رشتوں کی بھاری گٹھڑی جس کا بوجھ وہ بخوشی ڈھوتا ہے اور تب زندگی کے آخری پہر میں جب اسے اس گٹھڑی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اسے کھولتا ہے ایک ایک گرہ کھولتا ہے اور حیران ہوتا جاتا ہے کہ وہ گٹھڑی تو بالکل خالی تھی۔ ایک رشتہ ایک ناطہ ایک بھی تعلق اس گٹھڑی میں نہیں ہوتا تو پھر وہ عمر بھر کس کا بوجھ ڈھوتا رہا؟ وہ خالی گٹھڑی اٹھا کر اتنا جھک کر کیوں چلتا تھا۔ وہ کیسا بوجھ تھا؟ گٹھڑی تو خالی تھی تب اسے پتا چلتا ہے وہ بوجھ تو اس کی اپنی خواہشوں، اپنی ہوس اور اپنے حرص کا تھا۔ اور اس آخری پہر میں آ کر جب سب رشتے ناطے چھوڑ گئے تو اس خالی گٹھڑی میں حرص ہے نہ ہوس، خواہش نہ خواب، صرف اکیلا پن اور اعمال کی فصل، اور مجھے اب یہ ہی فصل کاٹنی ہے، اس کے لیے مجھے کسی کے بھی ساتھ کی ضرورت نہیں، جاؤ میں ہر رشتے، ہر بندھن سے آزاد ہوں۔ تم بھی آزاد ہو میں جو عمر بھر بھٹکتی رہی اندھے رستوں

پر محبت اور خواب کی گٹھڑی کندھے پر اٹھا کر لا یعنی سفر۔ اور اس سفر کی شام، گھوا اس کال کوٹھڑی پر ختم ہوئی اور اندھیری رات شروع ہے۔ اندھیری سیاہ کالی رات جس میں نہ خواب کا جگنو، نہ خواہش کی کرن، نہ محبت کا بہلاوا، صرف اندھیرا ہے اور لمبا سفر۔"

وہ خود سے باتیں کرتی جا رہی تھیں، کبھی ایک دیوار پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگتیں، کبھی دوسری دیوار پر۔ مگر وہ مخبوط الحواس نہیں تھیں۔ مگر شاید صحیح الدماغ بھی نہیں تھیں۔ دونوں کے بیچ بیچ۔ تنزیل کھڑا نم آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا اور آہستگی سے عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

✡ ✡ ✡

وہ رات کے سناٹے میں گیٹ کی بیل بجی۔

وہ ہڑبڑا کر اپنی ریوالونگ چیئر پر سیدھے ہوئے اور زور زور سے ملازموں کو آوازیں دینے لگے۔

"دیکھو گیٹ پر کون ہے؟ عزہ ہو گی۔ لائبہ یا تنزیل۔ جاؤ جا کر دروازہ کھولو۔" وہ اندر آتے پہلے ملازم پر برس پڑے۔

"گھنٹی کوئی گھنٹی نہیں بجی۔" ملازم حیرانی سے بولا۔

اور یہ کون سی نئی بات تھی۔ رات دن میں کئی بار وہ یونہی بیٹھے بیٹھے چونک پڑتے۔ کبھی ملازموں پر چیختے اور کبھی خود ہی گیٹ کھول کر آنے والوں کی راہ تکتے رہتے۔

اور سارا دن کے اس سارے خبط سے بے نیاز ہو کر کمرے میں بیٹھی ایک ہی زاویے پر نظریں جمائے جانے کیا کھوجتی رہتیں۔

عزہ کو گئے چار سال ہونے والے تھے اور وہ اس دوران ایک بار بھی ملنے نہیں آئی تھی۔

لائبہ اسامہ سے شادی کے بعد لندن جا چکی تھی۔ تنزیل آج کل [illegible] میں [illegible] کر رہا [illegible] پاکستان [illegible]

تنہوں ہی کتراتے جاتے۔

دائم ہر چھ ماہ بعد لندن چکر لگا کر عزہ کو یاد دہانی کرواتا کہ کوئی اس کا انتظار کر رہا ہے اور وہ خاموش ہو جاتی۔

عائشہ اور تنزیل ملائشیا کے بعد سویڈن اور پھر اسی طرح چند دن پہلے لندن شفٹ ہوئے تھے۔ دونوں کے دو بچے تھے اور دونوں خوش تھے۔ اگرچہ عائشہ کے لیے وہ بیتے ماہ و سال ابھی بھی کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھے مگر تنزیل کی محبت رفتہ رفتہ اس ڈراؤنے خواب کی شدت کو کم کر رہی تھی۔

دونوں سال میں ایک بار پاکستان یاسمین اور احسن صاحب سے ملنے پاکستان ضرور جاتے۔ احسن صاحب سرتاپا بدل چکے تھے تنزیل کے لیے ایک بہت محبت کرنے والے باپ اور یاسمین کے لیے ایک خیال رکھنے والے شوہر بن چکے تھے۔

تنزیل بعد میں صرف ایک بار محمود عالم سے ملنے گیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر خاموشی سے اٹھ کر آ گیا۔

عائشہ بچوں کو ناشتہ کرا کے خود بھی چائے کا کپ لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھی یونہی چینل سرچنگ کر رہی تھی جب ایک فیشن پریڈ کو دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ بے اختیار تھم سے گئے۔

فیشن پریڈ کے اختتام پر اس پریڈ کی روح رواں بہت سی بوتیکس اور آرٹ اکیڈمی کی چیئرپرسن تانی مائیک ہاتھ میں لیے بے حد مختصر لباس میں بہت بے باک انداز میں اطراف میں بیٹھے لوگوں سے بہت فخریہ انداز میں اپنی ماڈلز کا تعارف کرا رہی تھی۔ اور عائشہ کا جسم سن ہو چکا تھا۔

"تو تم پھر اس دلدل میں جا گریں۔ شیطان کا گناہ غرور یا تکبر نہیں تھا نا بیہ! اس کا گناہ تو خدا کی رحمت سے مایوس ہونا تھا کہ خدا اسے کبھی معاف نہیں کرے گا تم نے یہ گناہ کیوں کیا؟ خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کا؟"

اسے پتا بھی نہیں چلا اور اس کے آنسو جھرنوں کی طرح بہتے چلے گئے۔

۞ ۞ ۞

"دن کے اجالے اور رات کی تاریکیوں کے مالک تو گواہ ہے میری زندگی کے ظاہر و پوشیدہ ہر گوشے سے۔ جہاں مجھ سے بھول ہوئی انجانے میں مجھے بھول گئی۔ جہاں تیری مخلوق نے میرے ساتھ برا کیا اور جہاں مجھ سے تکبر اور غرور میں ان کے ساتھ ظلم ہوا تو سب کا گواہ ہے۔ یقیناً میرے مظالم کا پلڑا بھاری ہے۔ مگر میں یہ بھی جانتی ہوں تیری رحمت اور عفو و درگزر کا پلڑا اس سے بھی بھاری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تجھے یوں معافی [illegible] لیے اس طرح نہ چھوڑ دیتا۔

اس قید بامشقت نے جس نے میرے ہاتھوں کو رستے پھوڑے بنا دیا ہے اور میرے [illegible] اس عقوبت خانے کی سختی اور وحشت بھر دی ہے کہ میں دن رات کی کسی ساعت میں ایک [illegible] کے بغیر نہیں گزارتی اور لبوں سے سی نہیں کرتی کہ شاید اس طرح میرے گناہوں کا کچھ کفارہ ادا ہو جائے کسی ایک [illegible] مجھ سے کم ہو جائے جن پر میں نے ظلم ڈھایا۔ میں نہیں جانتی میں نے کتنی سزا کاٹ لی ہے اور برزخ میں کتنی باقی ہے مگر میں یہ جانتی ہوں اب میرے دل میں تجھ سے معافی کے سوا اور کوئی خیال نہیں نہ کسی محبت کا نہ نفرت کا نہ خوشی کا نہ خواب کا سارے سفر تمام ہوئے۔ یہ آخری پڑاؤ۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالے کیا بھی تو اس آخری پڑاؤ میں مجھے اور کسی کا خیال نہیں۔۔۔ تیرے سوا۔

اور شاید ان آخری لمحوں میں میں نے اپنی منزل کو پہچان لیا۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ سیاہ کوٹھڑی میں گھنٹوں نہیں پہروں سجدے میں گری رہتی۔ گری کبڑی ہو چکی تھی مگر نہ اس کی فریاد ختم ہوتی نہ اس کے آنسو

رکتے۔ پہرے داروں کے نزدیک وہ ایک پاگل خبطی حواس باختہ عورت تھی جو ہفتہ دس دن بعد دو چار نوالے کھاتی یا دو چار پانی کے گھونٹ پیتی۔ چکی پیستی یا پھر رات بھر سجدے میں گری رہتی۔

سالوں بیت چکے تھے۔ نئے آنے والے پہرے داروں میں سے کسی کو علم بھی نہیں تھا کہ یہ عورت کبھی میڈم یاقوت رہ چکی ہے اور کبھی اس کے قدموں کی چاپ سے دل سہم جایا کرتے تھے۔ لوگ میڈم یاقوت کی کہانی بھول چکے تھے۔ مگر کہانی دہرائی جا رہی تھی۔ نام بدل کر۔ اب تانی۔ کبھی۔ ربی یا کسی بھی نام سے۔

۞

عزیز قارئین!

محبت خواب سفر میرا دوسرا طویل ناول اور میرے خیال میں خواتین کا بھی اب تک کا طویل ترین ناول ہے پانچ سال کے 60 مہینوں اور آتی جاتی گرمیوں سردیوں خزاں اور بہار کے مہینے میں ختم ہونے والا یہ ناول میرے دل سے بہت قریب رہا۔ اس کی قسط میں سب کاموں سے فارغ ہو جانے کے بعد بہت فرصت سے دل لگا کر لکھا کرتی تھی اور اسے مہینے جس طرح قارئین نے اسے پسند کیا۔ آپ کی تنقید اور تعریف ہر ماہ۔ جس طرح مجھے پڑھنے کو ملتی۔ اس نے کہانی کے بہت سے اسرار سلجھانے میں بھی میری مدد کی۔ جو آپ کی محبتوں نے میری رہنمائی اور قدم قدم پر امتنان کے محبت بھرے مشورے اور تعریف میرے لیے بہت قیمتی تھے اور محبت اس کائنات کا سب سے پرانا جذبہ ہے اور اس کے باوجود یہ اولڈ نہیں ہوا جو دل بھی اس جذبے کو پہلی بار محسوس کرتا ہے وہ اسے بالکل نیا اچھوتا اور کم سن لگتا ہے یہی اس جذبے کی سب سے بڑی خوبی ہے اور سب سے منفی پہلو بھی۔ انسان اس جال میں پھنستا ہی ایسے [illegible] ہے کہ خود کو کیا خدا کو بھی فراموش کر دیتا ہے اور اس خود فراموشی میں اپنے محبوب کو بھی بھول جائے تو میڈم یاقوت کا کردار جنم لیتا ہے۔ میڈم یاقوت اس کہانی کا وہ ستون ہے جس پر یہ پورا ناول استوار ہوا۔

محبت کا خواب دیکھنے والی میڈم یاقوت تلاش و جستجو کے اس لیے سفر پر نکل پڑی اور اس کے ساتھ ہم بھی۔ اس سفر کا باعث یقیناً "محمود عالم" کا کردار تھا مگر اس کی جستجو چھپی ہوئی محبت نہیں کچھ اور تھا۔

دائم اور عزہ کے کردار کی کیمسٹری آپس میں ملتی تھی مگر وہ محبت کو بھی فرصت سے کرنا چاہتے تھے۔ اپنی اپنی ذات کے اونچے قلعوں پر فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد.....

مگر کیا محبت انتظار کرتی ہے؟

تنزیل ایک جوشیلا بھڑکیلا مگر بہت نرم دل رکھنے والا نوجوان۔ جس کے لیے اپنی شناخت ہی شکست و ریخت کا باعث بن گئی نا بیہ جو مایوس ہو گئی۔ مایوسی جو کفر سے بڑھ کر ہے اور عائشہ جس نے تقدیر کو آخری لمحہ تک آزمایا کس نے کیا کھویا کیا پایا؟ یہ تو آپ نے جان ہی لیا مگر آپ کی محبتوں نے مجھے ممنون اور مقروض کر دیا ہے۔

دعا گو

رخسانہ نگار عدنان

خواب بھی وصل، واقعہ بھی ہے
جو نہیں بھی ہوا، ہوا بھی ہے

وہ بتِ بے نیاز کیا دیکھے
بزم میں کوئی دوسرا بھی ہے

اُف نہ کی ہم نے جان جانے تک
صبر کی کوئی انتہا بھی ہے

جیسا اندھیر ہو رہا ہے
کہیں دیکھا بھی ہے سنا بھی ہے

زندگی نے نہیں دیا بس چین
گو بہت کچھ ہمیں دیا بھی ہے

جانتے سب ہیں اے شعور مگر
آپ کو کوئی پوچھتا بھی ہے

انور شعور

نہ آئینہ نہ حیرانی ہے گھر میں
عجب آشوبِ ویرانی ہے گھر میں

کہاں کی مشکلاتِ ساز و ساماں
فقط ہونے کو آسانی ہے گھر میں

جسے دیکھو وہی تصویر سا چپ
یہ کیسا رنگِ پریشانی ہے گھر میں

کسی دستک پہ کیا وا ہو دریچہ دل
ستونِ چشم تک پانی ہے گھر میں

کوئی تحریکِ عشقِ تازہ لاؤ
کئی دن سے یہ زندانی ہے گھر میں

لیاقت علی عاصم

وقت بنجارا صفت لمحہ بہ لمحہ اپنا
کس کو معلوم یہاں کون ہے کتنا اپنا

جو بھی چاہے وہ بنا لے اسے اپنے جیسا
کسی آئینہ کا ہوتا نہیں چہرہ اپنا

خود سے ملنے کا چلن عام نہیں ہے ورنہ
اپنے اندر ہی چھپا ہوتا ہے رستہ اپنا

یوں بھی ہوتا ہے وہ خوبی جو ہے ہم سے منسوب
اس کے ہونے میں نہیں ہوتا ارادہ اپنا

خط کے آخر میں سبھی یوں ہی رقم کرتے ہیں
اس نے رسماً ہی لکھا ہوگا تمہارا اپنا

ندا فاضلی

اک بے دھیانی

میں ٹھنڈے توے کی روٹی ہوں
مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا
مجھے بے دردی سے پلٹا گیا
میرے کتنے ٹکڑے اکھڑ گئے
میں ٹھیک سے سینکی جا نہ سکی
میں کسی چنگیر میں آ نہ سکی
میرا اپنا، گندھنا اور جلنا
بے کار گیا، میں ہار گئی
اک بے دھیانی مجھے مار گئی

حمیدہ شاہین

(واصف علی واصف)

فریدہ نادر بھو۔گجرات

بعد شادی کے

گھر سے بھاگ کر محبت کی شادی کرنے والی ایک لڑکی نے اپنے شوہر سے کہا۔

"کل مو بائل پر ابا جی کا فون آیا تھا۔"

"اچھا ... کیا کہہ رہے تھے وہ؟" شوہر نے چونک کر پوچھا۔

"وہ کہہ رہے تھے اگر تم گھر واپس نہ آئیں تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

گل پری مرزا۔لاہور

یادہ

ٹرین کا انجن چلانے والے قاسم سے اس کی بیگم شازیہ نے پوچھا۔

"قاسم! تم کئی کئی دن کے لیے لمبے سفر پر چلے جاتے ہو کیا اس دوران تمہیں کبھی میری یاد بھی آتی ہے؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" قاسم نے گویا برا مانتے ہوئے کہا۔ شازیہ نے اس سے یاد آنے کی بات کر دی تھی "میں تو ہر سفر میں ہر وقت تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں۔ تمہاری یاد میں کھوئے رہنے کی وجہ سے ہی تو میں دو مرتبہ ٹرین دوسری ٹرینوں سے ٹکرا چکا ہوں۔" قاسم نے جوش سے بتایا۔

سیدہ نسبت زہرا۔کبیر والا

عشق کا علاج

ڈاکٹر عائض القرنی نے اپنی کتاب "لاتحزن" میں لکھا ہے۔

"پرانے وقتوں میں جب کسی شخص کو عشق کا روگ لگ جاتا تو بطور علاج اسے کھیتی باڑی کا کام سونپ دیا جاتا۔ جس کی وجہ سے وہ دن بھر کھیتوں کے کام میں مصروف رہتا اور رات کو تھکاوٹ کی وجہ سے گہری نیند سو جاتا۔ یوں اسے پریشان رہنے اور سوچنے کا بہت کم موقع ملتا۔"

عائشہ۔کراچی

اپنا اپنا شوق

ایک جگہ کشتی ہو رہی تھی۔ دونوں پہلوان تھکے ہوئے تھے یا لوگوں کو دھوکا دے رہے تھے۔ ان کی کشتی سے اکتا کر ایک صاحب نے بہت زیادہ بوریت محسوس کی۔ وہ چیخ کر کہنے لگے۔

"بتیاں بجھا دو۔ بجلی فضول خرچ ہو رہی ہے۔ یہ دونوں پہلوان ڈراما کر رہے ہیں۔"

دوسرے کونے سے کسی کی آواز آئی۔

"نہیں، نہیں ... ابھی بتیاں مت بجھانا۔ میرا ناول ابھی ختم نہیں ہوا۔"

خدیجہ سلیم۔کراچی

اچھی اور نیک بیوی

علما نے لکھا ہے کہ نیک بیوی کے اندر چار صفات ہوتی ہیں۔

1۔ اس کے چہرے پر حیا ہو (انسان کے چہرے پر خوبصورتی سرخی پاؤڈر سے نہیں بلکہ حیا سے آتی ہے۔ جس کے چہرے پر حیا ہو۔ اللہ رب العزت اس کے چہرے کو پرکشش بنا دیتے ہیں)

2۔ زبان کے اندر شیرینی ہو۔ یعنی نرم بولنے والی ہو جب خاوند سے بات کرے تو نرم لہجے میں کرے۔ جب نامحرموں سے بات کرنا پڑ جائے تو آواز اور لہجے میں سختی اور دبدبہ آگئی ہو اور خاوند سے بات کرے تو بے صد نرمی ہو۔

3۔ عورت کے ہاتھ ہر وقت کام میں لگے رہتے ہوں۔ (یعنی عورت گھر، بچوں اور خاوند کے کام کاج میں لگی رہے)

4۔ اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو۔ (جب یہ محبت ہوگی تو ان کے ارشادات کے مطابق ضرور خاوند سے بھی محبت ہوگی۔ اس کی اطاعت شعار ہوگی۔

عنبر عتیق الرحمن۔لاہور

امت الصبور

شبانہ الیاس کی ڈائری سے

سب کچھ حاصل کرنے کی خواہش میں مصروف
لوگ تدبیر سے تقدیر کو بدلنے کے لیے کوشاں ہیں۔
جب اتنی محنت اور جاں فشانی کے بعد بھی کچھ ہاتھ
نہیں آتا تو بے اختیار خدا سے شکوہ کرنے لگتے ہیں۔
اسی شکوے کو احمد ندیم قاسمی نے خوبصورت الفاظ دیے ہیں۔

اے خداوندا اگر انسان کا جینا مرنا
تیری منشا ہے تو پھر اتنے جھمیلے کیوں ہیں؟

جب کسی شخص کو تقدیر نے کچھ نہ دیا
آج تک صرف اسی جاد کے چھلکے کیوں ہیں؟

اپنے کندھوں پہ جنازے لیے اپنے اپنے
ہم کروڑوں ہیں مگر پھر بھی اکیلے کیوں ہیں؟

یا پھر تجھ سے بھی تو امر کر دے
ہم نے دکھ اتنے کرنے صبر سے جھیلے کیوں ہیں؟

انعمیٰ صدیقی

عدیم ہاشمی... ایک مشہور نام... ایک منفرد
شاعر... ان کی "ترکش" پڑھی اور ان کی فین بن گئی
ان کی اس غزل کو تو انسان کے متصادم رویوں کا بہترین
عکاس کہا جا سکتا ہے۔ شدت پسندی بھی ہے
امید بھی ہے، کچھ بدل دینے کا عزم بھی ہے اور
حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے قبول کر لینے
کا حوصلہ بھی ہے۔ یہ سادہ مگر پراثر ہے۔ الفاظ گویا

تیر ہیں ایک کمان پر چڑھے۔ ایک موتی کی لڑی ہیں
جو چمک رہے ہیں۔ خدا اعدا ہیں مگر ہے۔ لطف لیں۔
آپ تمام قارئین کے نام

تعلق توڑتا ہوں تو مکمل توڑ دیتا ہوں
جسے میں چھوڑ دیتا ہوں، مکمل چھوڑ دیتا ہوں

محبت ہو کہ نفرت ہو بھرا رہتا ہوں شدت سے
جدھر سے آئے یہ دریا، ادھر ہی موڑ دیتا ہوں

یقیں رکھتا نہیں ہوں میں کسی کچے تعلق پر
جو دھاگا ٹوٹنے والا ہو اس کو توڑ دیتا ہوں

میں جو کچھ ہوں بیٹے کہیں در میں رہ جائیں
گھروندے ریت کے تعمیر کر کے چھوڑ دیتا ہوں

میں پیشہ ور گرچیں ہوں مگر شماری تو نہیں آتی
جو دل ٹوٹے تو ہمدردی سے اس کو جوڑ دیتا ہوں

عدیم اب تک وہی بچپن وہی تخریب کاری ہے
قفس کو توڑ دیتا ہوں، پرندے چھوڑ دیتا ہوں

لائبہ مشتاق کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ظریف احسن کی یہ غزل
آپ سب قارئین بہنوں کی نذر۔

رستوں رستوں دیپ ہزاروں جلتے ہیں
لیکن ہم تو اپنی راہ نکلتے ہیں

ایک آواز اٹھائے جاتی ہے ہم کو
اک سائے کے پیچھے ہم بھی چلتے ہیں

تم سے پہلے ہم بھی تم کو پیارے تھے
اب یوں ہے ہم اپنے آپ سے جلتے ہیں

ہم بھی کچھ کچھ دنیا داری سیکھ گئے
بات بڑھے تو ہم بھی بات بدلتے ہیں

بے موسم جذبوں کی صورت بھرتے تھے
وہ غنچے جو گل دانوں میں پلتے تھے

شاہدہ شبیر کی ڈائری سے

یہ حقیقت ہے کہ انسان جتنا بھی صاحب اختیار
ہو، ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے۔ دل برا بنا اختیار کھو بیٹھتا
ہے۔ انسانی نفسیات کے اس پہلو کو تنویر جمیل نے
نہایت دلکش انداز میں اجاگر کیا ہے۔ آپ بھی یہ
دلکش نظم پڑھیں اور میرے انتخاب کی داد دیں۔

کون روک سکتا ہے...!

الجھے منضبط خواہش کے
بکھرے شمار ہوتے ہوں
اس کو بھول جانے کے
بے پناہ ارادے ہوں
اور اس محبت کو ترک کر کے جینے کا
فیصلہ سنانے کو
کتنے لفظ سوچے ہوں
دل کو اس کی آہٹ پر
بڑھ کر دھڑکنے سے کون روک سکتا ہے
پھر وفا کے صحرا میں خوشبوؤں کو چھونے کی
جستجو میں رہنے سے
روح تک پگھلنے سے ننگے پاؤں چلنے سے
کون روک سکتا ہے
آنسوؤں کی بارش میں چاہے دل کے ہاتھوں میں
بجھرے مسافر کے پاؤں تک بھی جوڑ دو

جس کو ٹوٹ جانا ہے، اس کو دور جانے سے
راستہ بدلنے سے، دور جا نکلنے سے
کون روک سکتا ہے...!

سائرہ رمضان کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر طلعت اشفاق احمد کی یہ
نظم مجھے بہت پسند ہے۔ یقیناً آپ کو بھی ضرور
پسند آئے گی۔

اتنا ہی یاد رکھ مجھے
جیسے کسی کتاب میں
بیتے دنوں کے دوست کا
اک خط پڑا ہوا ملے
لفظ مٹے مٹے سے ہوں
رنگ اڑا اڑا سبھی
لیکن وہ اجنبی سا ہو
آنکھ کے تیرے لگے
بھولے ہوئے تمام دکھ
گزرے ہوئے تمام سکھ
بیتے دنوں کی سب کہانی
تجھ سے کہے اور رو پڑے
اتنا ہی یاد رکھ مجھے
بیتے دنوں کے دوست کا
جیسے کوئی خط ہوں میں
رکھا ہوا کتاب میں...!

سرورق کی شخصیت
ماڈل ---- مونا لیزا
ٹرانسپیرنسی ---- اورینٹ ٹیکسٹائل کراچی

خالدہ جیلانی

فوزیہ نصیر ______ کراچی

پیغمبروں کی راہ پہ چل کر نہ دیکھنا
یا پھر چلو تو راہ کے پتھر نہ دیکھنا
پڑھتے چلو وہ اسم، کہ شہر طلسم ہے
گر خیر چاہتے ہو پلٹ کر نہ دیکھنا

اسماء انجم ______ کھرڑ پکا

ڈھلتا سورج آنکھ کا ریزہ ہو جاتا ہے
جھوٹے خوابوں کا آمیزہ ہو جاتا ہے
اپنے فقروں سے ہوشیار کہ فقرہ اکثر
دشمن کے ہاتھوں کا نیزہ ہو جاتا ہے

سونیا امتیاز ______ حیدر آباد

جز گرد راہ کوئی مرا ہمسفر نہیں
منزل تک آ گیا ہوں یہی سوچتا ہوا
کچھ اس سے مختلف تو نہیں دل کی کیفیت
تحریر ہو رہی تھی کہ کاغذ جلا ہوا

کنول قریشی ______ ملتان

کچھ دنوں کی یہ ملاقاتیں بہت اچھی لگیں
اس سے تو کچھ ہو سکیں باتیں بہت اچھی لگیں
وقت رخصت اس نے تھوڑے پھول اور کلیاں دیے
آنسوؤں سے تر یہ سوغاتیں بہت اچھی لگیں

ندا کاشان ______ لاہور

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں، خوش رہیں، مسکرا دیں
جوانی ہو گر جاودانی تو یارب
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں

کرن محبوب ______ جلال پور جٹاں

بزم میں باعث تاخیر ہوا کرتے تھے
ہم کبھی تیرے عناں گیر ہوا کرتے تھے
کوئی تو بھید ہے اس طور کی خاموشی میں
ورنہ ہم حاصل تقریر ہوا کرتے تھے

آمنہ جاوید ______ رسالپور

سلیم دل کو میسر سکوں خدا نہ ہوا
اگرچہ ترکِ محبت کو اک زمانہ ہوا

اقصیٰ قمر ______ ملتان

دنیا سرشت ہوں دوری میں بھی محبت ہے
اکیلے رہنے میں لیکن بڑی اذیت ہے
وہ دور آیا کہ وہ بھی گھروں کو چھوڑ گئے
جو سوچتے تھے کہ اب مستقل سکونت ہے

یسریٰ فاطمہ ______ فیصل آباد

یہ جو مجھ پہ کسی اپنے کا گماں ہوتا ہے
مجھ کو ایسا نظر آنے میں بڑی دیر لگی
بولتا ہوں تو مرے ہونٹ جھلس جاتے ہیں
اس کو یہ بات بتانے میں بڑی دیر لگی

مبشرہ الہیٰ ______ شاہدرہ

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

نایاب احمد ______ کراچی

دل کے سب نقش تھے ہاتھوں کی لکیروں جیسے
نقش پا ہوتے تو ممکن تھا مٹاتے جاتے
تھک گئے ہم بھی کسی کو بھی مہلت دینا
اک دیا ہم بھی کسی رخ سے جلاتے جاتے

گل پری مرزا ______ لاہور

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

حسن زیبی ______ منصورہ فیصل آباد

وفا کی لاج میں اس کو منا لیتے تو اچھا تھا
انا کی جنگ میں اکثر جدائی جیت جاتی ہے

دنیا کا کوئی بھی انسان جذبات و احساسات سے خالی نہیں۔ نرم و نازک جذبات زندگی کی اساس ہیں۔ جس طرح خوشبو کے بغیر پھول بے رنگ رہ جاتا ہے، اسی طرح اظہار کے بنا جذبے اکثر بے معنی رہ جاتے ہیں۔ اظہار کا پیرایہ چاہے کوئی ہو، اس کا ہونا ہی سرشاری ہے۔ شاعری اظہار کا ایک خوب صورت ذریعہ، اکثر طویل گفتگو بھی آپ کے احساس کو اس طرح واضح نہیں کر پاتی جو محض ایک شعر کر دیتا ہے اور آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ "ارے یہی تو میرے دل میں تھا۔"

زندگی کی طویل دھوپ چھاؤں میں بہت سی یادیں، بہت سی باتیں آپ کی ہم سفر رہی ہوں گی۔ کبھی آنکھ میں آنسو بن کر، کبھی لب پر پھول کھلا کے۔ اپنی ان یادوں میں ہمیں بھی شریک کیجیے مگر صرف منظوم پیرائے میں۔ یہ کوئی شعر بھی ہو سکتا ہے، نظم بھی اور غزل بھی۔ اسی واسطے ہم آپ کے لیے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں "روشن حرف وہ سارے"۔

سوالات یہ ہیں۔

(1) وہ شعر جو اکثر آپ کے لبوں پہ رہتا ہے؟
(2) وہ شعر، نظم یا غزل جو آپ کے پسندیدہ شاعر سے تعارف کی بنیاد بنا؟
(3) کسی نے آپ کو دیکھ کر بے ساختہ کوئی شعر پڑھا ہو؟
(4) وہ غزل جو آپ نے ٹی وی، ریڈیو پر سنی ہو اور گائیکی کی بنا پر آپ کو اچھی لگی؟
(5) کلاسیکی شاعری میں سے آپ کا انتخاب؟

روشن حرف وہ سارے

سحر گلاب

1۔ حالات کے نشیب و فراز سے اگر کوئی باذوق بندہ متاثر ہو یا پھر وہ ان پر گہری نگاہ رکھتا ہو تو وہ ان اثرات یا احساسات کو یقینی طور پر الفاظ کا روپ ضرور دے گا۔ وہ الفاظ نظم بھی ہو سکتے ہیں اور نثر بھی۔

فی زمانہ جو حالات چل رہے ہیں وہ یقیناً "پریشان کن" ہیں۔ مگر امید کے دامن کو بھی تھام رکھا ہے کہ مایوسی تو بہرحال کفر ہے۔ سو آج کل تو یہ اشعار بھی وردِ زبان ہیں۔ خود کو حوصلہ دینے کے لیے!

چراغ زندگی ہو گا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصل بہاراں ہم نہیں ہوں گے
کہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں ہم نہیں ہوں گے

اور یہ شعر بھی اکثر و بیشتر لبوں پر آ جاتا ہے۔

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے حالات کے خونی منظر سے
جس دور میں جینا مشکل ہے اس دور میں جینا لازم ہے

2۔ یہ جو پر شکستہ ہے فاختہ، یہ جو زخم زخم گلاب ہے
یہ ہے داستاں مرے عہد کی جہاں ظلمتوں کا نصاب ہے

جہاں ترجمانی ہو جھوٹ کی، جہاں حکمرانی ہو بوٹ کی
جہاں بات کرنا محال ہو، وہاں آگہی بھی عذاب ہے

میری جان ہونٹ تو کھول تو، کبھی اپنے حق میں بھی بول تو
یہ عجب ہے تیری خامشی نہ سوال ہے نہ جواب ہے

وہی آب آب ہیں آبلے، وہی فصل فصل ہیں فاصلے
وہی خار خار ہے رہ گزر، وہی دشت دشت سراب ہے

وہی بام و در ہیں بجھے ہوئے، وہی چاند چہرے ڈھلے ہوئے
وہی صبح کوئے ملال ہے، وہی شام شہرِ خراب ہے

مجھے سعد تجھ سے گلہ نہیں کہ میں خود ہی تجھ سے ملا نہیں
میری زندگی بھی عذاب ہے، تری زندگی بھی عذاب ہے

جی ہاں! اسعد اللہ شاہ میرے پسندیدہ شاعروں میں سے ایک جن کی یہ غزل ان کے تعارف کا وسیلہ بنی اور پھر میں ان کا کلام پڑھتی چلی گئی۔

3۔ مصروفیت کچھ اس قسم کی ہے کہ دوستوں سے ملنا ملانا بس اب تو نصیب سے ہی ہوتا ہے تو اکثر جب میں بہت عرصے بعد ملوں تو مختلف طنزیہ سخن کا سامنا ہوتا رہتا ہے مگر مجال ہے جو کبھی کسی دوست نے شعر کی اصلی صورت برقرار رکھی ہو۔ اس کا تیا پانچا کر کے ہاتھ میں پکڑاتی نہیں بلکہ منہ پہ مارتی ہیں۔ ایسے ہی ایک بار میری دوست نے یہ شعر یوں بگاڑا تھا جو مجھے ابھی تک یاد ہے۔

کسی کے ظرف سے بڑھ کر نہ کر جفا ہرگز
کہ اس بے جا شرارت سے بڑا نقصان ہوتا ہے

جبکہ اصل شعر کچھ یوں ہے۔

کسی کے ظرف سے بڑھ کر نہ کر مہر و وفا ہرگز
کہ اس بے جا شرافت سے بڑا نقصان ہوتا ہے

4۔ فیض کے یہ اشعار پڑھنے میں تو بس سرسری سے ہی لگے تھے مگر جب اس کلام کو ریڈیو پر سنا تو پھر اسے دوبارہ پڑھا اور حقیقتاً بہت اچھا لگا۔

دشت تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، تیرے ہونٹوں کے سراب
دشت تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں، تیرے پہلو کے سمن اور گلاب
اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تیری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو سے سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور افق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تیری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

5۔ کلاسیکی شاعری میں سے کسی ایک کا انتخاب! بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ہر شاعری جہاں "مرد میداں" لگتا ہو اور ہر غزل بھی جہاں لاجواب ہو وہاں انتخاب واقعی بہت کٹھن ہو جاتا ہے۔

بہرحال جگن ناتھ آزاد کے کلام سے چند اشعار! نہایت خوب صورت کلام کہ جس میں درد کی ٹیس بھی محسوس ہوتی ہے اور جو ایک تلخ حقیقت سے بھی آشنا کرتی ہے۔

کر دو دامن سے غلامی کی چھڑانے والے
تیرے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے

جو سماں تیری نگاہوں سے نہاں ہے شاید
جو سماں میری نگاہوں پہ گراں آج بھی ہے

تو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
ان بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے

آج بھی روح میں ہے درد کی دنیا آباد
دم بخود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے

جلوہ فرمائی پہ حسن آج بھی آمادہ نہیں
عشق کی وحشی نظروں میں فغاں آج بھی ہے

آج بھی دیدۂ افکار پہ پردے ہیں محیط
حل طلب مسئلہ سود و زیاں آج بھی ہے

عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محو فغاں
درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے

بقیہ: قارئین سے سروے

2۔ جی نہیں عمیرا ایسا کوئی دل نہیں چاہتا۔ خواتین ڈائجسٹ کی کہانیوں میں حقیقت کا رنگ سب سے نمایاں ہوتا ہے رائٹرز اپنی کہانیوں کو جیسے بھی مکمل کرتی ہیں وہی بیسٹ ہے۔

یمنیٰ قریشی۔۔۔ نواب شاہ

یاد نہیں پڑتا کہ کبھی خواتین میں کوئی ایسی تحریر شائع ہوئی ہو جسے پڑھ کر میں نے یہ سوچا ہو کہ یہ تحریر میری چھوٹی بہنیں نہ پڑھیں۔ خواتین ڈائجسٹ نے ہر دور میں بہترین تحریریں شائع کی ہیں۔

1۔ یوں تو بہت سے ایسے جملے ہیں، جو یادداشت میں محفوظ رہ جاتے ہیں لیکن نزہت شبانہ حیدر کی تحریر "خوابوں کے چہرے" کے یہ آخری جملے۔

"ہم جیسے لوگ جو زندگی بھر صرف خوابوں کے چہرے کو سنوارنے میں لگے رہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ بہت سی چیزیں روشنی سے مشروط ہوتی ہیں اور روشنی صرف وہاں ہے جہاں حقیقت ہے۔"

اور ان دانش کے موتیوں نے بہت سی الجھنوں کو سلجھا دیا۔

2۔ میں نے کبھی بھی کسی بھی کہانی کے بارے میں یہ نہیں سوچا کہ اس کا انجام ایسا ہوتا یا ویسا ہوتا۔ وہ کہتے ہیں نا جس کا کام اسی کو ساجھے لیکن اس کے باوجود دسمبر 2010ء کے خواتین میں نبیلہ عزیز کا ایک مکمل ناول تھا "شرط" جس کا انجام پڑھ کر مجھے بہت برا لگا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ ناول کے ہیرو مکرم کا رویہ زیست کے ساتھ (اینڈ) میں انتہائی انسلٹنگ تھا۔ کیا تھا اگر مکرم زیست کو پورے دل سے معاف کر دیتا۔ اب زیست نے اتنی بھی بڑی غلطی نہیں کی تھی کہ مکرم نے اسے اس بری طرح سے بے عزت کیا۔

شفق افتخار۔۔۔ سکھر

بلاشبہ کچھ لفظ، کچھ جملے ایسے ہوتے ہیں جو دل و دماغ پہ نقش ہو جاتے ہیں۔ روشنی سی کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے ذکر کروں گی اپنی موسٹ فیورٹ رائٹر فرحت اشتیاق کا (جنہوں نے ہمیں انتظار کی سولی پہ چڑھا رکھا ہے) فرحت کے سب سے بہترین ناول "متاع جان ہے تو" سے۔۔۔ اس کے وہ لمحات جب عباد ہنی کی گرینڈ مدر کے ساتھ ہسپتال میں ہوتا ہے اور وہ اپنی خراب طبیعت کی وجہ سے اسے ہنی کے ساتھ نکاح کرنے کو کہتی ہیں۔ لیکن درمیان میں اس کے والدین کی ناراضی [illegible] عباد کا یہ کہنا کہ

"ہم لوگ ابھی اس دنیا میں موجود ہیں، ہمارے پاس ساری باتوں کے لیے وقت ہے۔ لیکن ان کے پاس وقت کم ہے اور ہمیں اس وقت ان کی خوشی کا خیال کرنا ہے۔"

اور وہ ان کی خوشی کا خیال کرتے ہوئے ہنی سے نکاح کر لیتا ہے۔

اور دوسرا جملہ "کنیز نبوی" کے "گلیاں پریم نگر دیاں" سے جب ماریہ، سرمد کو دوسری شادی کی اجازت دیتی ہے اور سرمد کے استفسار پہ اس کا یہ کہنا کہ۔

"محبت کو تقسیم نہ کرو ضرب دو۔ تقسیم سے محبت گھٹتی ہے ضرب سے بڑھ جاتی ہے۔"

پتہ ہے سرمد! تمہاری محبت میں، میں یوں ڈوبی ہوں کہ محبت کو تقسیم نہیں ضرب دینا آ گیا ہے۔ میری محبت گھٹے گی نہیں بڑھ کر دوسروں تک پہنچے گی۔ یہ محبت کا فیض، جو دوسروں تک پہنچ کر انہیں فیض یاب کر رہا ہے۔ یہ سب صدقہ ہے تمہاری محبت کا۔

2۔ ویسے ساری کہانیوں کے انجام ہوتے تو پرفیکٹ ہیں اسی چیز میں ان کا چارم ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں رائٹرز کے قلم بہت بے دردی سے چلتے ہیں کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ کہانی اور حقیقت میں تھوڑا سا فرق ضرور ہونا چاہیے۔ کہانی حقیقت کے قریب ضرور ہو مگر حقیقت جتنی تلخ نہ ہو۔ بہرحال اگر مجھے موقع مل رہا ہے کہ میں کسی کہانی یا ناول کا انجام بدلنا چاہوں تو وہ ناولز فرحت اشتیاق کے ہیں (فرحت سے بے حد معذرت کے ساتھ) کیونکہ سوال پڑھتے ہی جو وہ کہانیاں میرے ذہن میں آئیں وہ یہی تھیں۔

پہلا ناول "وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر"۔

اس کے اینڈ میں فریا کی شادی یقیناً سعد کے ساتھ کرانا چاہوں گی۔ کیونکہ آئی تھنک فریا کے والدین جب اس دنیا میں نہیں رہے تو فریا کے نانا کو انہیں کھلے دل سے معاف کر دینا چاہیے تھا اور فریا جو ان کی لاڈلی بیٹی کی اکلوتی نشانی تھی اس کی خوشی کا خیال رکھتے ہوئے اس کی شادی سعد سے کر دیتے۔ حمزہ بھی اتنا برا نہیں تھا بٹ آف کورس بائی ڈیفالٹ زیادہ حق سعد کا ہے۔

دوسرا ناول "متاع جاں ہے تو"۔

اس میں مجھے عباد کے مرنے کا بے حد دکھ ہے اور ہمیشہ رہے گا اس لیے میں یقیناً عباد کو زندہ رکھوں گی میرا خیال ہے اس طرح ہو سکتا ہے کہ عباد زخمی ہو جائے اور جہاں اس کا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے۔ وہاں اس کے کردار کو کچھ دیر کے لیے ختم کر دیا جائے اور ہنی اسی طرح ان کے والدین کے پاس آئے اور ان کے ساتھ رہے جس طرح کہ وہ رہتی ہے اور وہ لوگ یہی سمجھتے رہیں کہ عباد مر چکا ہے مگر درحقیقت وہ زندہ ہو اور وہاں اس کے ساتھ کچھ ایسا ہو جائے کہ جس کی بنا پہ وہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے پاس نہیں پہنچ سکتا مگر وہ اس وقت واپس آ جائے جب اس کے والدین ہنی کو معاف کر چکے ہوں۔

خبر یہ گرم ہے

غزل ثوبان

مضبوطی

عمیمہ شمعون ٹی وی پر ڈراموں میں نظر آئیں پھر اچانک غائب ہو گئیں۔ سننے میں آیا ہے کہ شعیب منصور کی آنے والی فلم "بول" میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ اس حوالے سے خود عمیمہ کہتی ہیں۔

"شعیب منصور کا نام کامیابی کی ضمانت ہے۔ گھر والوں نے مجھے شعیب منصور کا سنتے ہی فلم کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ فلم ایک میوزیکل مووی ہے جس کا میسج بھی بولڈ ہے۔ یہ فلم شوبز میں میری قسمت کا فیصلہ بھی کر دے گی۔ جہاں تک بولی ووڈ میں کام کرنے کا تعلق ہے۔ تو مجھے سلمان خان کے ساتھ کام کرنے کا بے حد شوق ہے (الامان!) جہاں تک سوال شمعون سے شادی کا ہے تو میں جو چاہوں اس کو ضرور حاصل کرتی ہوں (قسمت کی بدولت جناب) وقت نے میرے فیصلے کو صحیح ثابت کیا ہے۔ (ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے؟) شمعون بہت لونگ اور خیال رکھنے والے شوہر ہیں۔ ان کے متعلق باتیں ان کے مخالفین نے پھیلائی ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ پر فخر ہے۔" (اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات کب تک برقرار رہتے ہیں۔)

پھرتی

کرکٹر شعیب ملک ورلڈ کپ کی ٹیم میں اپنی جگہ تو نہ بنا سکے۔ لیکن بھارتی بیگم ثانیہ مرزا کی تابع داری خوب کر رہے ہیں۔ اس لیے بیگم صاحبہ بولی ووڈ میں ان کو جگہ دلانے کے لیے خاصی متحرک ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ ثانیہ اور شعیب مل کر ایک انڈیا پروڈکشن کے تحت فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس میں امید واثق ہے کہ ہیرو خود ہی آئیں گے (پھر فلم دیکھنے لوگ کیسے آئیں گے؟) اور شعیب کے بالمقابل ہیروئن آنے کی ہمت کون اداکارہ کرتی ہے۔ اس کا فیصلہ نہیں ہوا۔

خواب

کومل رضوی اچانک وارد ہوتی ہیں۔ کچھ عرصے شوبز اسکرین پر جلوہ گر رہتی ہیں۔ پھر ایک دن اچانک سے غائب بھی ہو جاتی ہیں۔ اس مختصر عرصے میں وہ میزبان کے جوہر دکھاتی بھی نہیں بھولتیں۔ گزشتہ دنوں وہ کہتی نظر آئیں "فنی صلاحیت میری رگ رگ میں دوڑ رہی ہے۔ (ہم نے تو سنا تھا رگوں میں خون دوڑتا ہے) اور ہر دم اس کا اظہار میری خواہش ہے۔ (وہ تو آپ کی آمد سے ظاہر ہے) یہ اظہار اداکاری میں ہو یا موسیقی میں۔ میں اس کا اعلا درجے کا حصول ہی چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ جب بھی گاؤں تو ریشماں اور میڈونا کے معیار کا ہو۔ (پہلے معیار طے کر لیں کیونکہ میڈونا اور ریشماں تو بالکل مختلف ہیں) اور جب اداکاری کروں تو مادھوری، شبانہ اعظمی اور میریل اسٹریپ جیسی کامیابی پاؤں۔ (کومل! آپ اسے اتنا ہی آسان سمجھتی ہیں؟) ذاتی طور پر مجھے ٹائی ٹینک میں کیٹ ونسلیٹ کا کردار پسند ہے (الامان!) اگر پاکستان یا بھارت میں اس کا ری میک بنا تو مجھے یہ کردار کر کے خوشی ہوگی۔"

پروفیشن

مارننگ شو کی کمپیئرز میں ڈاکٹر شائستہ واحدی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں اور جب سے وہ دوسرے نجی چینل پر نظر آ رہی ہیں۔ انداز بالکل پروگرام کی سابقہ میزبان کی طرح کا سا ہے۔ اپنے تجربے کے حوالے سے وہ کہتی ہیں "میں بچپن سے ہی عام بچوں سے مختلف تھی۔ میرے والدین نے ہر فرمائش دل و جان سے پوری کی۔ میڈیکل جیسی مشکل تعلیم دلوائی۔ سچ پوچھیں تو مجھے کیمرے کے سامنے آتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ (لگتا تو نہیں ہے) مگر میں نے اپنے آپ کو قائل کر کے اس شعبے کو پروفیشن بنایا (یہ بڑی تبدیلی ہے، بھئی)۔

جہاں تک سوال میری ازدواجی زندگی کا ہے تو ہماری شادی دونوں طرف کی باہمی رضامندی سے ہوئی جس میں ہماری مرضی بھی شامل تھی۔ مجھے اپنا آپ ایک ماں کے روپ میں زیادہ پسند ہے۔ میرے خیال سے اس شعبے میں رہ کر بھی میں ڈاکٹری کی طرح لوگوں کی خدمت کر رہی ہوں۔ چونکہ میں صبح ہی صبح اپنے ہم وطنوں کو خوشیاں بانٹتی ہوں۔" (اللہ رے خوش فہمی! ڈاکٹری سیٹ ضائع کرنے کا اچھا جواز ڈھونڈا ہے۔)

جادوئی علم

جادوئی دنیا ہر کسی پر سحر سا طاری کر دیتی ہے۔ خاص طور پر جادوئی فلموں کا کریز ہر دور میں رہا ہے۔ ہیری پوٹر سیریز نے فلم بینوں کا نیا حلقہ ترتیب دیا ہے۔ جس کے لیے طلسماتی دنیا میں رہنا ایک حسین خواب ہے اسی لیے امریکہ میں جوش و خروش کو دیکھتے ہوئے

جادوئی دنیا کو سمجھنے اور باقاعدہ تعلیم دینے کے لیے میجک اسکول کا افتتاح کیا گیا ہے۔ جس میں نامور اور پیشہ ور جادوگر بچوں کو اس علم کی تعلیم دیں گے وہ بچے جو ہیری پورٹر کے کرداروں کی طرح جادوئی علم سیکھنا چاہتے ہیں۔ جوق در جوق اس اسکول میں یہ علم سیکھنے کے لیے داخلہ لے رہے ہیں۔ اسکول کا ماحول تقریباً جے کے رولنگ کی تخلیق کردہ جادوئی دنیا کا سا رکھا گیا ہے۔ "گرے اسکول آف وزارڈری" نامی اس اسکول کے پرنسپل 68 سالہ جادوگر اوبیرون زیل ریون ہارٹ ہیں جو اس اسکول کی کامیابی کے لیے بے حد پُر امید بھی ہیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ بھارت کے مشہور اور تاریخی شہر بھوپال کا نام تبدیل کر کے بھوجپال رکھنے کی تیاری کی جا رہی ہے بھوپال کا نام بدلنے کی وجہ بہت مضحکہ خیز بتائی گئی ہے۔ ہندو انتہا پسندوں کا کہنا ہے کہ بھوپال کے نام سے اسلامی دور کی یاد آتی ہے۔ حالانکہ بھوپال اسلامی نام نہیں ہے۔ لیکن والئی بھوپال مشہور مسلمان شخصیت تھے۔

(وغیرہ وغیرہ عبداللہ طارق سہیل)

☆ مشرف نے گندے کاموں کے لیے ایس آئی یو بنائی تھی۔ تنظیم نے 600 پاکستانیوں کو پکڑ کر امریکا کے حوالے کیا۔ ڈالر حاصل کیے۔ اسی تنظیم کے ذریعے ہر وہ کام ہوتا تھا جس سے ہماری دوسری ایجنسیاں انکار کر دیتی تھیں۔ اس میں بھارتی اور امریکی شہری کارندے ہیں یہ تنظیم اب بھی کام کر رہی ہے۔

(اسلم بیگ فرنٹ لائن)

☆ جتنی بھی لڑکیاں سلمان کی زندگی میں آئیں ان سب کا ایک ہی مقصد تھا کہ سلمان کو سیڑھی بنا کر بلندی پر پہنچ جائیں۔ ان میں سے کوئی سلمان سے شادی کرنے کی خواہاں نہیں تھی۔ کترینا نے بھی ایسا ہی کیا۔

(سلمان خان کے والد سلیم خان)

☆ الطاف بھائی ڈاکٹر طاہر القادری کے چاہنے والوں میں شامل ہیں۔

(فاروق ستار)

☆ شیر بنگال اسٹیڈیم میں موجود ہزاروں بنگلہ دیشی تماشائیوں نے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ بنگلہ دیشی بچوں نے پاکستانی پرچم چہروں پر پینٹ کرا رکھے تھے اور بنگلہ دیشی نوجوان ایسے لگ رہے تھے جیسے یہ بنگلہ دیشی نہیں ہیں۔ پاکستان سے آئے ہوئے تماشائی ہیں۔

اس میں بھارت اور بھارت نواز حسینہ واجد کے لیے جو پیغام ہے۔ وہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

(وغیرہ وغیرہ عبداللہ طارق سہیل)

خادم حرمین شریفین شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے استدعا کی ہے کہ ان کے لیے دلوں کا بادشاہ یا انسانیت کا بادشاہ جیسے القاب استعمال نہ کیے جائیں کیونکہ بادشاہت صرف اللہ کی ہے اور ہم سب اسی کے بندے اور غلام ہیں۔ شاہ عبداللہ نے اظہار عقیدت کے طور پر اپنے یا شاہی خاندان کے کسی بھی فرد کے ہاتھ چومنے سے بھی منع کر رکھا ہے۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چاکلیٹ براؤنیز

ضروری اجزا :

میدہ	تین چوتھائی پیالی
کوکو پاؤڈر	کھانے کے دو چمچ
بیکنگ پاؤڈر	چائے کے چار چمچ
چینی (ڈارک براؤن لیں)	آدھی پیالی
انڈے	چار عدد
مکھن	ایک پیالی (پگھلا لیں)

ترکیب :

میدہ، کوکو پاؤڈر اور بیکنگ پاؤڈر کو ایک چھلنی میں ڈال کر چھان لیں۔ ایک پیالے میں مکھن ڈال کر اس میں چینی ملائیں۔ دونوں کو اچھی طرح سے ملائیں۔ پھر ایک ایک کر کے اس میں انڈے شامل کریں۔ جب تینوں چیزیں اچھی طرح مکس ہو جائیں تو اس میں چھانا ہوا میدہ، کوکو پاؤڈر اور بیکنگ پاؤڈر کو تین حصوں میں تقسیم کریں اور ایک ایک حصہ باری باری ملائیں۔

جب سب آمیزہ اچھی طرح سے مکس ہو جائے تو سانچے کو ذرا سا چکنا کریں۔ خشک میدہ سانچے میں چھڑک دیں۔ اس میں تیار کیا ہوا آمیزہ سانچے میں ڈال کر پہلے سے گرم اوون میں تیس منٹ کے لیے بیک کریں۔ اس کے بعد نکال کر اسے دس منٹ ٹھنڈا کر لیں اور چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ مزیدار براؤنیز تیار ہیں۔ اسے آئس کریم کے ساتھ سرو کریں۔

ملائی لڈو

ضروری اجزا :

کنڈینسڈ ملک	آدھی پیالی
پنیر	ایک پاؤ
ونیلا ایسنس	دو سے تین قطرے
پیلا رنگ	4-5 قطرے
الائچی پاؤڈر	دو چٹکی
چاندی کا ورق	ایک عدد

ترکیب :

خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم اس ماہ کے کچن کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ سوالات یہ ہیں۔
کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند نا پسند' غذائیت' گھر والوں کی صحت۔
گھر میں اچانک مہمان آ گئے ہیں' کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے تواضع کر سکیں۔
کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے' آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟
صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔
گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جا رہا ہے' آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔
کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مد نظر رکھتی ہیں؟
اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟
کچن کی کوئی ٹپ جو دینا چاہیں؟
ان سوالات کے جواب بھجوا کر آپ بھی اس سلسلے میں شرکت کر سکتی ہیں' ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھیج دیں۔ تصویر ضروری نہیں ہے۔

آپ کا باورچی خانہ

عائشہ ریحان

1۔ کھانا عموماً سب کے مشورے سے سب کی پسند کو مد نظر رکھ کر پکایا جاتا ہے۔ غذائیت کے پیش نظر تیز مسالا جات سے پرہیز کرتی ہوں اور لذیذ بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔ جس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہوں۔

2۔ عموماً مہمان فون پر آنے کی اطلاع کر دیتے ہیں ______ ویسے عام طور پر میرے بھائی جو لاہور میں پڑھائی کی غرض سے ہاسٹل میں رہتے ہیں گھر کا پکا کھانا کھانے اچانک آ جائیں تو پلاؤ اور قیمے کے شامی کا سالن فٹافٹ تیار کرتی ہوں۔ یہ سالن بھائیوں اور گھر والوں کو بہت پسند ہے۔ بلکہ بھائی تو آتے ہی یہی کھاتے ہیں۔ ترکیب بتائے دیتی ہوں سو فی صد امید ہے کہ جو بہنیں آزمائیں گی ضرور داد دیں گی۔

شامی کا سالن

اشیاء :

قیمہ	ایک کلو
پیاز	4 عدد
لہسن (پسا ہوا)	1 کھانے کا چمچ
ادرک (پسا ہوا)	1 کھانے کا چمچ
ہری مرچ	6 عدد
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
نمک	حسب منشا
ٹماٹر	2 عدد
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

کچے قیمے میں ہری مرچ باریک کاٹ کر ڈالیں' لہسن ادرک کا پیسٹ' تھوڑی سی سرخ مرچ' کالی مرچ' نمک ڈال کر اچھی طرح ہاتھ سے یک جان کر لیں اور شامی بنا کر ایک طرف رکھ دیں یاد رہے کہ کنارے ٹوٹنے نہ پائیں۔

اب مسالا تیار کرنے کے لیے نسبتاً موٹی موٹی پیاز کاٹیں 2 ہری مرچ اور ٹماٹر باریک کاٹ لیں۔ اب ایک بڑی دیگچی میں ہلکا سا تیل ڈالیں اور ایک تہ تیار شدہ مسالے کی رکھ کر ایک تہ کبابوں کی رکھیں۔ پھر مسالے کی تہ لگائیں اور پھر شامیوں کی یوں یہ عمل پورا کر کے اور تھوڑا سا تیل ڈال کر دیگچی کو اچھی طرح ڈھانپ کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پانی بالکل نہیں ڈالنا۔ کچھ دیر بعد کفگیر سے نرمی سے شامی کو ہلائیں اور شامیوں کا پانی خشک کر لیں' آخر میں ہرا دھنیا چھڑکیں۔ مزیدار سالن تیار ہے۔

3۔ آپ نے صحیح فرمایا کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہے۔ مجھے کچن کی صفائی کا خبط ہے۔ جب تک کچن صاف نہ کر لوں چین نہیں آتا۔ کچن گندا نہیں ہونے دیتی' ساتھ ساتھ سمیٹتی رہتی ہوں۔ ہر کھانے کے بعد فوراً برتن دھو کر خشک کر کے ان کی جگہ پر رکھتی ہوں۔ پھر سنک دھو کر کوکنگ رینج کی صفائی کرتی ہوں۔ جالے بالکل نہیں لگنے دیتی۔ رات کو سونے سے پہلے کچن کی صفائی کا پورا جائزہ لے کر نکلتی ہوں تاکہ صبح چمکتا کچن ملے۔

4۔ میں دو دفعہ ناشتہ کرتی ہوں۔ ارے ارے! حیران نہ ہوں۔ وجہ یہ نہیں کہ میں بہت پیٹو ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے خاوند جو ناشتہ کرتے ہیں وہ مجھے قطعاً پسند نہیں اور انہیں پراٹھے بالکل پسند نہیں۔ ناشتے میں وہ فرائی انڈے اور توس کے ساتھ گرما گرم چائے پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا ناشتے کی ٹیبل پر ان کا ساتھ دینے کے لیے چار و ناچار مجھے بھی مجبوراً ایک سلائس اور انڈہ کھانا پڑتا ہے۔ ریحان (خاوند) کو آفس بھیج کر اپنا من پسند ناشتہ کرتی ہوں۔ پراٹھے کے ساتھ کبھی جیم لگا کر کھاتی ہوں کبھی سالن اور اچار' ساتھ میں بھاپ اڑاتا چائے کا مگ ہوتا ہے۔

5۔ باہر کھانا۔ کیا حسین اور اچھے دنوں کی یاد تازہ کروا دی۔ اب لاہور کے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ باہر نکلتے خوف آتا ہے۔ اس لیے اب ریحان ہر ویک اینڈ پر باہر سے کچھ نہ کچھ لے آتے ہیں اور سالگرہ پر اچھا خاصا اہتمام گھر پر ہی ہو جاتا ہے۔ البتہ نئے نویلے شادی شدہ رشتہ دار جوڑوں کو کھانا باہر ہی کھلاتے ہیں۔

6۔ جی۔ کھانے کا بھرپور مزہ لینے کے لیے موسم کو ضرور مد نظر رکھتی ہوں۔ اب سردیوں کی شام میں گول گپے وہ مزہ نہیں دیتے ہیں جو گرمیوں کی دوپہر میں دیتے ہیں۔ سردیوں میں گرما گرم بھاپ اڑاتی چیزیں مزہ دیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح موسم کو دل کھول کر انجوائے کرنے کے لیے اسی حساب سے ڈش کا انتخاب ضروری ہے۔
گرمی کے موسم میں قیمہ کریلے کے ساتھ لسی کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے اور ساون رت میں خاوند اور بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پکوڑے اور چپس کیچپ میں ڈبو کر گرم چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے بارش کی بوندوں کو دیکھنے کا اپنا ہی حسن و مزہ ہے۔

7۔ دنیا کا کوئی بھی کام جو دل لگا کر نہ کیا جائے وہ سکون مزہ اور خوشی نہیں دیتا اور کچن تو عورت کی خاص توجہ مانگتا ہے۔ آپ کوئی بھی ڈش پکائیے وہ عام سی ہی کیوں نہ ہو اگر دل سے محنت کر کے پکائیں گی تو کھانے میں بہت لذت پیدا ہو جائے گی۔ اگر آپ کچن میں داخل ہو ہی چکی ہیں تو تھوڑا سا دل لگا کر پکا لیں تو لذت' غذائیت' تعریف اور پیار شرطیہ ملے گا۔

8۔ ☆ اگر کچن کے سنک میں فینائل کی گولی رکھ لیں تو کچن میں بدبو نہیں ہو گی۔
☆ اگر آپ لیموں زیادہ دیر تک تازہ رکھنا چاہیں تو پلاسٹک کے شاپر میں بند کر کے فریج میں رکھیں۔
☆ ایک لیموں کاٹ کر فریج میں رکھ دیں تو فریج سے مخصوص بو نہیں آئے گی۔
☆

بہترین انسان وہی ہے جو اپنی باتوں سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچاتا ہو۔ جو لوگ نرم گفتار ہوتے ہیں اور شیریں بیانی کے گر سے واقف ہوتے ہیں' دنیا ہمیشہ ان کی عزت کرتی ہے۔

اچھائی اور برائی دونوں زبان سے نکلنے ہوئے الفاظ پر موقوف ہے' اس کے لیے زبان کو قابو میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے' آج ہم اپنے فرائض سے ناآشنا ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لیے خرابی کا باعث بھی بنتے جارہے ہیں۔

خاتون خانہ کا اپنا اخلاق و کردار قابل تحسین و تقلید ہوگا۔ تب ہی اس کی شخصیت کے اثرات کنبہ کے دیگر افراد قبول کر سکیں گے۔

ہمارے مذہب میں بھی غیبت' غرور' تکبر' چغل خوری اور مبالغہ آمیزی سخت گناہ ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بلاوجہ برا بھلا کہنا اور لڑائی جھگڑا بھی منع ہے۔ غصہ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ دل کی خوشیاں چھین لیتا ہے۔

میں اپنی بہنوں کو مشورہ دوں گی کہ اگر وہ چاہتی ہیں کہ سب ان سے محبت کریں۔ کوئی انہیں برا نہ سمجھے تو وہ اپنی زبان پر قابو رکھیں۔ درگزر سے کام لیں' غصہ نہ کریں اور جہاں تک ہو سکے دوسروں سے خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔ سب ان سے محبت کریں گے اور گھر کا ماحول خوشگوار ہوگا۔

☼ ☼ ☼

جو لوگ نفسیاتی طور پر بیمار رہیں یا خود کو بیمار سمجھتے ہیں' بیمار سمجھنے کا جملہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ نفسیاتی بیماروں میں 70 فیصد سے زیادہ لوگ نفسیاتی بیمار نہیں ہوتے۔ بس انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ بیمار ہیں اور بیماری کے لیے وجہ تلاش ___ کرلیتے ہیں۔ وہ فرض کرلیتے ہیں کہ چونکہ ایسا ہوا ہے۔ چونکہ اس کی یہ وجہ ہے لہٰذا انہیں بیمار بھی ہونا چاہیے۔

باقی لوگوں میں 20 فیصد معمولی درجے کے بیمار ہوتے ہیں لیکن وہ خود کو شدید بیمار سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا علاج معمولی دوائیوں اور تحلیل نفسی کے ذریعے کیا جاتا ہے یا کیا جاسکتا ہے۔

نفسیات تو یہ دیکھتی ہے کہ انسانی ذہن کس طرح کام کرتا ہے' حالات' تجربے اور معاشرے کے اس پر کیا اثرات ہیں انسان کے جذبات' احساسات کیا ہیں۔ انسان کے ذہن کا جسم کے ساتھ کیا تعلق ہے اور ایک دوسرے پر یہ کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

باقی 10 فیصد میں سے بھی 5 فیصد کو بیمار کہا جاسکتا ہے۔ جن کو باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے۔ 5 فیصد اپنے ہاتھوں خود بیمار رہنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف ان کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ وہ تندرست ہو جائیں۔ دوسری طرف وہ بیمار ہی رہنا چاہتے ہیں۔ یعنی دونوں خواہشیں بیک وقت کام کرتی ہیں۔

یہ علم ذہنی پریشانیوں' برائیوں اور اضطراب سے لے کر ذہن کے تمام امراض کو معلوم کرکے اس کا تجزیہ کرکے وجوہات کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔

نجمہ

بہن نجمہ نے کافی طویل خط لکھا ہے۔ مسئلہ وہی ہے جو لڑکیوں کا عام مسئلہ ہوتا ہے۔

ان بہن کا تعلق ایک کم پڑھے لکھے گھرانے سے ہے۔ والد انہیں پڑھانا چاہتے تھے' لیکن خاندان کے دباؤ کے باعث تعلیم منقطع کرنی پڑی۔ بڑی بہن نے گھر سے فرار ہو کر کورٹ میرج کرلی۔ بعد میں والد نے بڑی بہن کو گلے لگا لیا۔ بڑی بہن اپنے گھر میں خوش اور مطمئن ہے' لیکن بہن نجمہ کے رشتے نہیں آتے۔ لکھتی ہیں۔

ایک جگہ سے رشتہ آیا ہے' وہ انتہائی جاہل اور گنوار لوگ ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے ذہن کی نفاست اور صفائی پسند طبیعت کبھی بھی ایسے لوگوں میں خوشی حاصل نہیں کرسکے گی۔ وہ لوگ اپنی نچلے طبقے کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ مجھ جیسی شاعری اور ادب سے شغف رکھنے والی لڑکی وہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔ جہاں زندگی کا مقصد صرف اور صرف کھانا پینا اور سو جانا ہے۔

خاندان والوں کی باتوں کی وجہ سے ابا چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد میری شادی کرکے بوجھ اتار دیا جائے۔

مجھے بتایئے کہ میں کیا کروں۔ مجھے کہیں سے روشنی کی کرن لادیجیے۔

ج: نجمہ بہن! آپ کی بہن نے خود غرضی سے کام لیا اور صرف اپنے لیے سوچا۔ یہ نہ سوچا کہ ان کا یہ قدم گھر والوں کے لیے کتنی شرمندگی کا باعث بنے گا۔ ان کے اس قدم نے آپ کے والد کا سر جھکا دیا ہے' اسی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ آپ کی شادی جلد از جلد کردیں کہیں چھوٹی بیٹی بھی بڑی کے نقش قدم پر نہ چل پڑے۔ وہ اپنی سوچ میں حق بجانب ہیں۔

ان حالات میں میرا آپ کو مشورہ یہ ہے کہ آپ اس لڑکے کے گھر والوں کو نہ دیکھیں' بلکہ یہ پتا کرائیں کہ لڑکا کس طبیعت کا مالک ہے۔ آپ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہیں' آپ اس کو اپنے انداز میں ڈھال سکتی ہیں' اسے زندگی کے رہنے کے انداز سکھا سکتی ہیں۔ درحقیقت بیوی مرد کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آئیڈیل تو کسی کسی کو ملتا ہے۔ ذہین اور عقل مند لڑکی وہ ہے جو اپنے شوہر کو آئیڈیل بنالے۔

پھر بھی اگر آپ محسوس کرتی ہیں کہ آپ وہاں کسی حالت میں سمجھوتا نہیں کرسکتیں تو اپنی والدہ سے بات کریں۔ انہیں اس بات کا یقین اور اعتماد دلائیں کہ آپ مضبوط کردار کی لڑکی ہیں۔ کوئی غلط قدم اٹھا کر ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گی۔ اس رشتے کو انکار کردیا جائے اور کسی بہتر رشتہ کا انتظار کیا جائے۔

یوں بھی آپ کی عمر ابھی کم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا رشتہ آجائے جو آپ کے لیے قابل قبول ہو۔ ایک بات آپ سے کہنا چاہوں گی کہ یہ پھول' خوشبوئیں' شعروں اور چاندنی راتوں کی باتیں کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔ عملی زندگی میں ان چیزوں کا گزر کم ہوتا ہے۔ حقیقت افسانوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔

ایک بہن

لیکوریا کوئی ایسی بیماری نہیں ہے کہ جس سے رنگ زرد اور آنکھوں کے نیچے حلقے ہوجاتے ہیں۔ ہاں اشتہاری حکیم اور عطائی خواتین کو بے وقوف بنانے کے لیے اس قسم کے اشتہار شائع کرواتے رہتے ہیں تاکہ ان کی چاندی ہوسکے۔ حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ 100 میں سے 90 عورتوں کو یہ تکلیف ہوتی ہے' کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ اکثر عورتیں بغیر کسی دوائی یا علاج کے ٹھیک ہوجاتی ہیں۔ اگر چاہیں تو کسی مستند حکیم کو دکھالیں۔ ہمدرد دواخانہ کو خط لکھ کر بھی دوائی منگوائی جاسکتی ہے۔

میرے نزدیک یہ بیماری تو نہیں ہے۔ یعنی ایسی بات جو سو میں نوے کو ہو اسے بیماری کیسے کہا جاسکتا ہے۔ مناسب تو یہ ہے کہ آپ حکیم سے دوائی منگوالیں۔ لیکن نہ بھی منگوائیں تو آپ خود بخود بھی ٹھیک ہوجائیں گی۔ البتہ گرم چیزوں سے پرہیز کریں۔ مرغی' انڈا بند کردیں۔ سبزیاں کھائیں۔ ٹھنڈا دودھ استعمال کریں اور گرم چیزوں کا استعمال بند کردیں تو خود بخود یہ تکلیف جاتی رہے گی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا ذہن صاف کریں کہ اس کی وجہ سے آپ کے چہرے پر کسی قسم کے اثرات ہیں۔
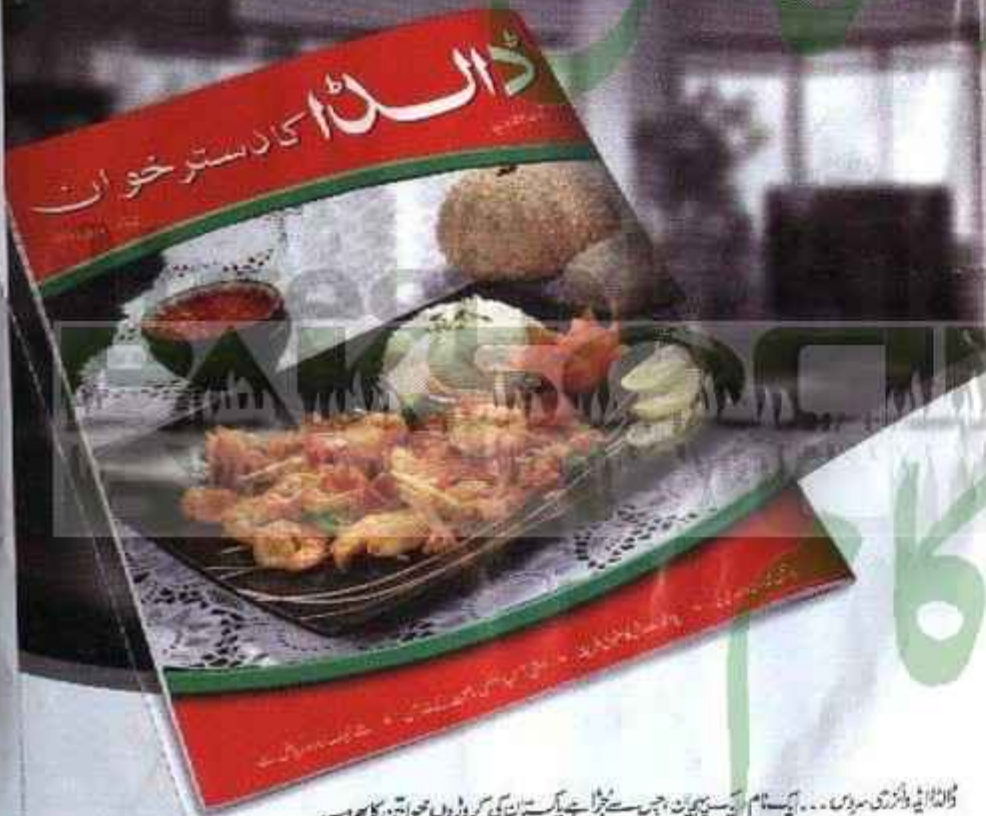
امت الصبور

بیوٹی بکس

ملیحہ ۔۔۔ لاہور

س : میرے بال روکھے اور بے رونق ہیں۔ اچھی طرح کنگھی کرنے کے بعد اُڑے اُڑے اور منتشر نظر آتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے گر بھی رہے ہیں۔ میری غذا بھی متوازن ہے اور عمومی صحت بھی اچھی ہے۔ لیکن بال دن بہ دن باریک ہوتے جا رہے ہیں۔

ج : بالوں کی صحت کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ باقاعدگی سے تیل لگایا جائے۔ صرف جڑوں میں نہیں بلکہ پورے بالوں میں نوکوں تک تیل لگائیں۔ انگلیوں کو تیل میں ڈبو کر آہستہ آہستہ جڑوں میں مساج کریں۔ مساج کے دوران خون تیز ہوتا ہے اور یہ بالوں کو بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

بالوں میں اچھی طرح تیل لگانے کے بعد انہیں جوڑے کی شکل میں لپیٹ لیں۔

اب ایک صاف تولیہ لے کر اسے کھولتے ہوئے پانی میں ڈال کر نکال لیں اور جب وہ قابل برداشت حد تک گرم رہے تو اس تولیے کو بالوں کے گرد لپیٹ دیں۔

تولیہ ٹھنڈا ہو جائے تو اسے دوبارہ گرم پانی میں ڈبو کر یہ عمل دوہرائیں۔ اس عمل کے بعد بال خشک ہونے دیں۔ آپ خود محسوس کریں گی کہ آپ کے بال نرم چمک دار اور خوب صورت ہو گئے ہیں۔ اس طرح بال چکنے بھی نظر نہیں آتے کیونکہ سارا تیل بالوں میں اچھی طرح جذب ہو چکا ہے۔ اس عمل سے بال نہ صرف گرنا بند ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی چمک اور دلکشی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

چونکہ آپ کے بال بہت زیادہ خشک ہو چکے ہیں اس لیے آپ کے لیے بادام کا تیل مفید رہے گا۔ اگر بادام کا تیل نہ ہو تو ناریل کا تیل لگائیں۔ سوئٹی ہیئر آئل بھی بالوں کے لیے بہت مفید ہے۔

تابندہ زیدی ۔۔۔ سکھر

س : کولاجن Collagen ٹریٹمنٹ کے بارے میں میں نے پڑھا ہے کہتے ہیں کہ اس سے چہرے سے عمر کے اثرات اور جھریاں ختم ہو جاتی ہیں کیا یہ صحیح ہے؟ اسے کہاں سے کرایا جا سکتا ہے؟ میری عمر 45 سال ہے کیا میں اسے کرا سکتی ہوں۔

ج : کولاجن کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ دراصل وہ آپ کے چہرے کے خلیوں کو آپس میں جوڑ کر رکھتا ہے۔ اگر قدرتی طور پر ان کے درمیان سے یہ نکل جائے تو چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ اس ٹریٹمنٹ سے جلد کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔ اس علاج کے تین مراحل ہیں۔

(1) ۔ سب سے پہلے جلد کی اوپری سطح کی صفائی یعنی مردہ خلیات سے نجات۔ داغ دھبے کیل وغیرہ صاف کیے جاتے ہیں۔

(2) ۔ کولاجن کریم سے مساج کیا جاتا ہے۔

(3) ۔ آخر میں کولاجن کی تہہ چہرے پر لگا دی جاتی ہے اور ایک مخصوص دورانیے کے بعد اسے اتار دیا جاتا ہے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے میں یہ سارا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ پہلے علاج کے بعد ہر تیسرے ہفتے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ بیوٹی پارلرز میں یہ ٹریٹمنٹ ہوتا ہے۔